تاریخ زبان و ادب اردو

از

صغیر احمد جان ۔ ایم ۔ اے
گورنمنٹ کالج ایبٹ آباد

دیباچہ

طلبِ علم کے ابتدائی مراحل کو چھوڑ کر ہر منزل میں تاریخ زبان و
ادب کا مطالعہ نہایت ضروری ہے خصوصاً دنیائے اردو میں فی زمانہ
ادب کے اس شعبہ پر خاص توجہ دینی چاہئیے۔ مطالعۂ ادب کا صحیح مقصد
تخلیق و تحسین و تنقید کے ذوق کی درستی کے سوا کچھ نہیں اور یہ ذوق قدیم و
جدید ادب کے ہمدردانہ مطالعہ کی بدولت ہی سے پیدا ہوتا ہے؟

ارتقائے ادبِ اردو کے اس دور کو اگر تنقیدی دور کہا جائے تو
زیادہ نامناسب نہ ہوگا۔ آج کل تخلیق کسی قدر سست رفتار اور تحسین معطل و
بیکار ہو چکی ہے۔ البتہ تنقید نے دنیائے ادب پر اپنا سکّہ جما رکھا ہے اور
ہر شخص جس میں کچھ بھی تحریر کا سلیقہ ہے مصنّف کی بجائے تنقید نگار بننا
پسند کرتا ہے۔ مجھے تو کچھ یہ محسوس ہوتا ہے کہ تنقید اردو میں کسی قدر قبل
از وقت آگئی ہے۔ یوں تو ہر شاعر، ہر انشا پرداز اور ہر سامع و قاری
ناقد ہوتا ہے اور ہمہ وقت اچھے اور برے اور خوب و زشت میں تمیز
کرتا رہتا ہے لیکن میرا مقصد تنقید سے بحیثیت فن کے ہے۔ یہ فن اردو
میں قبل از وقت آیا۔ اس کا آنا سر آنکھوں پر لیکن یہ بات کچھ کھٹکتی ہے

کہ تنقید تخلیق پر چھا گئی ہے ۔ جوہر فروش کم اور پارکھ زیادہ زوروں پر
ہیں اور لطف یہ کہ تنقید و تنقیص کا نازک فرق نظر انداز ہوتا جاتا ہے۔

انگریزی ادب کے مطالعہ سے ہم نے بہت کچھ سیکھا ہے تخلیق
کے اگر نوع بہ نوع انداز سیکھے ہیں تو تنقید کا ذوق و شوق بھی حاصل کیا ہے
لیکن افسوس کہ مغرب زدگی نے ہمیں جا بجا گمراہ بھی کر دیا ہے بعض تنقید نگاروں
نے تنقید کو تنقیص کا روپ دیا اور خود اپنے ہی بزرگوں کے منہ آنے لگے ۔
بلکہ بعض لوگوں نے تو یہ ستم کیا کہ ہمارے بزرگ شعرا و ادب نواز ہستیوں
کے کمالات ہی پر خاک ڈال دی ۔ یہ آخر کیوں ہوا؟ اس کی پہلی وجہ تو یقیناً یہ
ہے کہ ہم نے "ہر کسے را بہر کارے ساختند" کی بلاغت کو پس پشت ڈال دیا
اور ہر شخص یہ سمجھنے لگا کہ تنقید نگار بننا ہر شخص کا حق ہے۔ اور یہ لے اس قدر
بڑھی کہ جس طرح کبھی زمانے میں "بگڑا شاعر مرثیہ گو" سمجھا جاتا تھا۔ اسی طرح
آج ہر نا اہل اہل قلم تنقید نگار بن گیا۔ دوسری وجہ انگریزی ادب کی خوبیوں
سے ناجائز طور پر مرعوب ہو جانا ہے۔ احساس کمتری نے ہماری آنکھوں پہ
پٹی باندھ دی۔ ہمیں مشرق و مغرب کا فرق نظر نہ آیا۔ ہم نے مخصوص ماحول،
معاشرت، سیاسی تاریخ، مذہب۔ تہذیب و تمدن۔ طرز بود و باش،
رسم و رواج، حاشیہ قومی و ملی، ذہنی کیفیات وغیرہ حقیقتوں کو نظر انداز کر دیا،
اور ہمیں اردو ادب میں ان چیزوں کی تلاش ہوئی جن کو وہاں نہ ہونا چاہیے
تھا۔ جستجو میں ناکامی ہوئی تو ہمیں اپنا ادب ہیچ در ہیچ نظر آیا۔ پھر کیا تھا

کر رکھ دیا۔

جس نئی پود کے اعصاب پر انگریزی ادب کے علاوہ روسی بھوت بھی سوار ہے ان کی تنقید نگاری نوجوانا پیشگی اور ستم گاری بن کر رہ گئی۔ کوئی شاعر اور کوئی انشا پرداز ان کی درانتی اور ہتھوڑے کی ضرب سے محفوظ نہ رہ سکا۔ کسی شاعر کو جاگیردارانہ نظام کی پیداوار بتا کر ٹھکرایا گیا۔ کسی کو رجعت پرست کے نشان سے داغا گیا۔ کسی کے تصوف و اخلاق کا مذاق اڑایا گیا اور کسی کے فلسفۂ حیات کا ٹھٹھا کیا گیا۔ ان کے تنقیص کے تیر و پیکاں سے

نہ میر بچا، نہ سودا، غالب جانبر ہو سکا نہ مومن۔

شاعروں پر مشقِ ستم کرنے کے ساتھ ساتھ تفنن کے لئے اردو کی اصنافِ شاعری کو بھی آڑے ہاتھوں لیا گیا۔ قصیدہ تو خیر انقلاب زمانہ کے ہاتھوں خود ہی میدانِ عمل چھوڑ چکا تھا اور مثنوی بھی ہمت ہار چکی تھی۔ ایک غزل میدان میں ڈٹی ہوئی تھی۔ مخالفانہ تنقید و تنقیص کی گرد و غبار نے اس کا بھی دم بند اور جینا حرام کر دیا۔ کہیں وزن پر حملہ ہوا کہیں ردیف و قافیہ پر دھاوا بولا گیا۔ بزرگوں کے ادب کو غلام اور پابند ادب کہا گیا۔ اور اس کے مقابلہ پر آزاد ادب کا ڈھنڈورا پیٹا گیا۔

ترقی کا میدان کھلا ہے اور ہمیشہ کھلا رہے گا۔ آگے بڑھنے کی خواہش زندگی کی علامت ہے۔ اصنافِ شاعری میں اضافے کیجئے۔ کسی صنف کو چھوڑیئے کسی کو اختیار کیجئے۔ نئے نئے اوزان ایجاد کیجئے۔ ردیف و قوافی کی قید سے آزاد ہو جائیے۔ آپ کے اجتہادوں کو زمانہ تمدن پر کھے گا

سکہ وہی چلے گا جو خوش عیار ہوگا۔ یہ نہ کیجیے کہ اپنے سکوں کی کامل عیاری ثابت کرنے کے لیے اگلوں کے سکوں کو ٹکسال باہر کیجیے اور تنقید کا خوان سمجھیے تنقیص کے عیب سے دامن نہیں بچایا جا سکتا اور تنقید کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا۔ تاوقتیکہ تنقید نگار اپنے اندر ہمدردی کی اعلیٰ صفت بدرجۂ کمال پیدا نہ کر لے۔ ہمدردی زبان سے، اصنافِ ادب سے اور خود ادیب و شاعر سے زبان سے ہمدردی یہ ہے کہ زبان کی ساخت اور نشو و نما کا پورا پورا خیال رکھا جائے اور یہ بھی پیشِ نظر رہے کہ اس کی نشو و نما کس ماحول میں ہوئی ہے اور کن کن سرچشموں سے اس کی آبیاری ہوئی ہے۔ زبان محض مافی الضمیر کو سامع تک پہنچانے کا ذریعہ ہی نہیں ہوتی بلکہ وہ اپنے بولنے والوں کی زندگی کا آئینہ بھی ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ قومی ترقی کے ساتھ زبان بھی ترقی کی منزلیں طے کرتی ہے لیکن باوجود علمی ترقیوں کے زبان اپنی ابتدائی خصوصیات کو بھی برقرار رکھتی ہے۔ زبان اردو کے بولنے والوں کی علمی ترقی خواہ کسی بلندی پر کیوں نہ پہنچ جائے اس کی گردشِ فلک کبھی نہیں رک سکتی اور اس کا چشمۂ حیواں "کبھی خشک" اور اس کا "ہما" کبھی عنقا نہیں ہو سکتا۔ اس مضمون پر حالی مرحوم نے مقدمۂ شعر و شاعری میں سیر حاصل بحث کی ہے۔ اور بتایا ہے کہ آج ہم بہت سے تصورات کو غلط اور بے بنیاد سمجھتے ہوئے بلا تکلف اپنی زبان میں استعمال کرتے ہیں اور بیسیوں مطالب کو ان ہی بے بنیاد تصورات کا سہارا لے کر نہایت موثر طریقے پر ادا کر دیتے ہیں۔

اردو زبان کی دو خصوصیات نہایت اہم ہیں۔ اوّل یہ کہ اُس کا پسِ منظر "ہندی اسلامی" تہذیب و تمدن ہے اور دوسری یہ کہ اسکے ادب نے ہر چیز فارسی شعر و ادب سے مستعار لی ہے۔ تنقید کے میدان میں ان دونوں خصوصیات کو نظرانداز کر دینا بدترین غلطی ہے اور اس غلطی کو آپ زبان دشمنی کہہ سکتے ہیں۔ کسی شاعر پر یہ اعتراض کرنا کہ وہ پاکستانی ہو کر بیاس، راوی اور اٹک کا ذکر نہیں کرتا۔ بلکہ جیحون اور دجلہ و فرات کا غائبانہ مداح ہے، اسی قسم کی غلطی ہے۔ یہ غلطی دراصل ہندوستان میں متعصب ہندوؤں نے محض اردو دشمنی میں پھیلائی تھی ورنہ چکبست خود ہندو تھا، دیکھیے وہ کیا کہتا ہے۔

وہ گلشن کی فضا اور چاندنی کا وہ نکھر جانا
وہ بڑھ کر گیسوئے سیلائے شب کا تا کمر جانا

اسی طرح:۔

سوادِ خلد سمجھا کنج مرقد کی سیاہی کو
سپیدی کو کفن کی ہم نے جنت کی سحر جانا

کیا چکبست کو مرقد کی جگہ مرگھٹ استعمال نہیں کرنا چاہیے تھا ؟ لیکن کیا یہ لفظ اردو زبان برداشت کر لیتی ؟ دیا شنکر نسیم بھی ہندو ہی تھا۔ لیکن مثنوی گلزار نسیم کو ان اشعار سے شروع کرتا ہے۔

ہر شاخ میں ہے شگوفہ کاری ثمرہ ہے قلم کا حمد باری
کرتا ہے یہ دو زبان سے یکسر حمد حق و مدحت پیمبر

"پانچ انگلیوں میں یہ حرف زن ہے   یعنی کہ مطلع   پنجتن   ہے"
کیا نسیم پر یہ الزام لگایا جا سکتا ہے کہ وہ ہندو ہو کر مسلمانوں کی زبان استعمال کرنے میں حق بہ جانب نہیں تھا؟ ہرگز نہیں یہ اردو ہے۔ جو شخص اس میں موتی پرونا چاہے گا اسے اسی کے سمندر سے موتی نکالنے ہونگے۔

زبان کی طرح اصناف ادب سے ہمدردی کرنا بھی تنقید نگار کا فرض ہونا چاہیئے اسے یاد رکھنا چاہیئے کہ ہر صنف نظم و نثر کی ایک مستقل تاریخ ہے اور ہر صنف اپنے اپنے زمانے میں قبول عام کی سند حاصل کر چکی ہے ایک زمانہ تھا کہ قصیدہ کے رو برو ہر صنف کا چراغ گل تھا مقفٰے اور مسجع نثر علمیت کی دلیل تھی اور اپنی اثر انگیزی میں جواب نہیں رکھتی تھی ہر صنف مخصوص خوبیوں کی مالک تھی۔ یہ خوبیاں آج بھی برقرار ہیں گو ان کے قدر داں نہ رہے ہوں آج اگر کوئی تنقید نگار کسی شاعر کو محض یہ کہہ کر ٹال دے کہ وہ قصیدہ گو تھا یا فلاں نثر نگار عبارت میں قافیہ پیمائی اور سجع آرائی کرتا تھا تو در اصل یہ تنقید نہ ہوئی بلکہ ہمارے قدیم ادب کے ساتھ دشمنی ہوئی اگر آج بھی کوئی شاعر زمانۂ موجودہ کے تقاضوں کو مدِ نظر رکھ کر عمدہ قصیدہ لکھے تو وہ اسی طرح قابل ستائش ہے جس طرح زمانہ گذشتہ کے قصیدہ گو۔ یہی حال دیگر اصناف سخن کا ہے۔ موجودہ عہد میں غزل پر جو معاندانہ نکتہ چینی کی جا رہی ہے۔ اسکی اصل وجہ یہی ہے کہ نکتہ چین کو اس صنف سے ہمدردی نہیں ہے اور جب ہمدردی نہیں تو وہ

اس کی خوبیوں کو سمجھ بھی نہیں سکتا۔ غزل سے صحیح ہمدردی کا نمونہ آپ
کو مولانا حالی مرحوم کے مقدمے میں ملے گا۔ جہاں انہوں نے غزل کی
بعض خرابیوں کو دور کرنے اور خوبیوں میں اضافہ کرنے کے بارے میں مفید
مشورے دیئے ہیں اور اس کی اہمیت نہایت فاضلانہ اور ہمدردانہ انداز میں
بیان کی ہے۔

خود شاعر و ادیب سے ہمدردی کرنا جس قدر ضروری ہے، اسی قدر
زمانۂ موجودہ کی نوجوان تنقید نگاری اس طرف سے بے رخی برت رہی ہے
صرف یہی نہیں بلکہ شعراء اور مصنفین پر ایسے ایسے الزامات لگا رہی ہے کہ
دل خون کے آنسو روتا ہے سب سے زیادہ پرلطف الزام یہ ہے کہ ہمارے
قدیم شعراء نے قصیدہ گوئی اور غزل سرائی میں اپنی عمریں ضائع کر دیں۔
انگریزی وضع کی مسلسل نظموں کی طرف التفات نہیں کی انہوں نے زندگی
کی ترجمانی نہیں کی۔ سرمایہ داری اور جاگیرداری کے خلاف علم بغاوت
بلند نہیں کیا۔ عمر بھر عشق و محبت کے نغمے الاپتے رہے۔ وغیرہ وغیرہ۔
اب ان سے کون کہے۔ اور کہے تو وہ سنتے کب ہیں کہ عشق و محبت
کا جذبہ ہی وہ حقیقت ہے جو رہتی دنیا تک برقرار رہے گا زندگی کی تلخیاں
عارضی ہیں۔ سرمایہ داری اور جاگیرداری شاید آپ ہی کی کوششوں سے
ختم ہو جائے مفلسی کا علاج بھی ممکن ہے مگر کیا جذبۂ محبت بھی ختم
ہو سکتا ہے؟ اگر دنیا آپ کے خوابوں کی تعبیر ہو بھی جائے تب بھی انسان تو
انسان ہی رہے گا۔ مگر کیا جذبۂ عشق کے ختم ہونے پر بھی انسان انسان رہ

سکتا ہے؟ ہاں فرشتہ بن جائے تو بن جائے۔ یا پھر پتھر کا مجسمہ ہو جائے انسان تو رہ نہیں سکتا۔ یہ روٹی اور پیٹ کی شاعری ایک نہ ایک دن فنا ہو کر رہے گی پیٹ بھری قوم اس خرافات کی طرف رُخ بھی نہ کرے گی۔ لیکن اگر تا قیامت برقرار ہے تو وہ یہی عشق و محبت کی شاعری ہے۔ اور اس شاعری کے لئے ابھی تک تو غزل سے بڑھ کر کوئی صنف کسی ادب نے پیش نہیں کی۔

ہر شاعر خود اپنے عہد اور ماحول کی پیداوار ہوتا ہے اور فطری طور پر اپنے عہد کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہ بحث کہ ادب برائے ادب ہے یا برائے زندگی دنیائے تنقید میں خاک اڑاتا ہے۔ کیا ادب برائے ادب کا تصور ذہن میں آسکتا ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی شاعر خود اپنی زندگی، اپنے ماحول اور اپنی مخصوص معاشرت سے الگ ہٹ کر ادب محض ادب کے لئے تخلیق کر سکے؟ کیا میرؔ، سوداؔ اور غالبؔ کا کلام ان بزرگوں کی زندگی، ان کے ماحول اور ان کے عہد کی عام خصوصیات سے الگ کوئی چیز ہے؟ کیا داغؔ اور امیرؔ کی شاعری، ان کی زندگی اور اس عہد کی معاشرت سے کوئی مختلف چیز ہے؟ کیا شعرائے لکھنؤ کی شاعری خود ان کے عہد کی عام کیفیات کی حامل نہیں ہے؟ ان ہی امور کے ساتھ ساتھ کیا ان بزرگوں کی شاعری میں بلند قسم کی شاعری کی اثر انگیزی نہیں ہے؟ کیا اس میں حُسن نہیں ہے؟ کیا اس میں سامعین کو وجد میں لانے کی صلاحیت نہیں ہے؟ یہ ہیں وہ سوالات جن کے صحیح جواب سے شاعری کے متعلق بحث و مباحثہ کا

فیصلہ ہوتا ہے جس طرح زبان صرف و نحو پر مقدم ہے اسی طرح شعر کو اصول تنقید پر مقدم ہونا چاہیئے۔ اور جس طرح انگریزی زبان کی گرامر اردو صرف و نحو سے مختلف ہے اسی طرح انگریزی شاعری کے اصولِ تنقید کو اردو شاعری کے اصولِ تنقید سے مختلف ہونا چاہیئے۔ اردو شعراء سے ہمدردی کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ان کے کلام کو انگریزی اصولِ تنقید کی عینک سے نہ دیکھئے۔ بلکہ اردو شاعری کی تنقید کے لئے اردو شاعری ہی سے اصول و قواعد کا استنباط کیجئے۔

ادب نہ محض برائے ادب ہے نہ محض برائے زندگی، بلکہ برائے ادب بھی ہے اور ساتھ ہی برائے زندگی بھی، ہمارے شعرائے متقدمین متوسطین اور متاخرین نے اس کا عملی ثبوت پیش کیا ہے۔ اگر اقبال کا کلام شاعرانہ حسن اور ترنم کا حامل نہ ہوتا تو اس کی تلقین، اس کا فلسفہ اور اس کا پیغام حرفِ باطل ہوتا اور کوئی شخص اس کے سننے اور پڑھنے کا روادار نہ ہوتا۔ ادب برائے ادب اگر ممکن ہو۔ اس ادب سے بدرجہا بہتر ہے جو محض برائے زندگی ہو۔ وہ جنوں، پریوں اور بھوتوں کا فرضی اور بے سر و پا قصہ جسے پڑھ کر طبیعت کو سرور اور کیف حاصل ہو اس افسانہ سے کہیں زیادہ قابل قدر ہے جو حقیقتوں پر تو مبنی ہو مگر ایسا خشک اور روکھا پھیکا ہو کہ پڑھنے والا چند سطروں سے زیادہ پڑھنا گوارا ہی نہ کرے۔

ہمارے قدیم و متوسط زمانے کے شعراء کے بارے میں یہ کہنا کہ انہوں نے غریبوں مفلسوں اور مزدوروں کی نمائندگی نہیں کی۔ انتہائی بے انصافی

اور بدسلوکی ہے۔ اوّل تو ہمارے بیشتر شعرا خود مفلس تھے اور نہایت عسرت
اور تنگی میں گذر اوقات کرتے تھے۔ ان کے افلاس اور فلاکت کی جھلک ان
کے کلام میں جا بجا موجود ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ان بزرگوں کے
عہد میں مفلس نوازی اور مزدور پروری فیشن میں داخل نہیں ہوئی تھی۔ پھر
ان سے کیونکر توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ "بھوک، روٹی، پیٹ" وغیرہ
نہایت رکیک اور مبتذل الفاظ کو غیر شاعرانہ انداز میں نظم کا جامہ پہناتے
اور اہلِ ذوق کو اپنے اوپر ہنسنے کا موقعہ دیتے۔

کسی قدیم ادیب کے ادبی شہ پاروں پر صحیح تنقید اسی وقت ممکن
ہے کہ تنقید نگار خود اپنے زمانے کے تقاضوں سے خالی الذہن ہو کر اپنے
آپ کو تھوڑی دیر کے لئے اسی ادیب کے عہد اور ماحول میں پہنچا دے
اور کامل ہمدردی کے ساتھ غور کرے کہ وہ اپنی ادبی کاوشوں میں کہاں
تک کامیاب ہوا ہے اور ہم عصر ادیبوں میں اس کا کیا مرتبہ ہے۔

ہمدردی کی صفت جو تنقیدِ عالیہ کے لئے شرطِ اولین ہے تاریخ
زبان و ادب کے مطالعہ ہی سے پیدا ہو سکتی ہے اور اساتذہ قدیم کے
شہ پاروں کے مطالعہ کے بعد ہی طلبہ میں موجودہ عہد کے ادب کو سمجھنے اور
اس کی قدر و قیمت کو جاننے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ مکمل تاریخ زبان
و ادب ارتقائے زبان و ادب کی مسلسل زنجیر ہوتی ہے اور موجودہ ادب
اس کی آخری کڑی۔ یہ کڑی جب تک اپنی ماقبل کڑی سے بغلگیر ہے
پوری زنجیر کا جزوِ لاینفک ہے۔ الگ ہوئی کہ بے کار اور بے مصرف

چیز ہوئی۔

افسوس ہے کہ تاریخ زبان وادب اردو مکمل جیسی کہ ہونی چاہیئے، اردو میں موجود نہیں ہے۔ مبسوط اور مکمل تاریخ کے لئے شاید ہمیں کسی مسلم الثبوت مؤرخ و انشا پرداز کے منتظر ہونے تک انتظار کرنا پڑے۔ البتہ طلبہ کی اشد ضرورت کا خیال رکھتے ہوئے راقم الحروف اپنی تالیف "تنویر ادب" (یہ تالیف اول مرتبہ ۱۹۳۷ء میں شائع ہوئی تھی) کو نظر ثانی اور اضافہ مضامین کے بعد پیش کرنے کی جسارت کرتا ہے۔ چونکہ نظر ثانی و قطع برید کے بعد "تنویر ادب" کی ہیئت بالکل بدل چکی ہے لہذا اس کا نام بھی بدل رہا ہوں۔ اب یہ "تاریخ زبان وادب اردو" ہے۔

اگر مسلم الثبوت اہل الرائے بزرگ میری ہمت افزائی نہ فرماتے تو شاید میں اس ناچیز تالیف کو بعد نظر ثانی دوبارہ زیور طبع سے آراستہ کرنے کی ہمت ہی نہ کرتا۔ میرے لئے اس سے بڑھ کر قابل فخر اور کیا بات ہو سکتی ہے کہ عالی جناب سید سلیمان صاحب ندوی مرحوم نے ایک موقعہ پر ڈاکٹر ایم۔ جی۔ زبید احمد صاحب ایم۔ اے، پی۔ ایچ۔ ڈی پروفیسر شعبۂ فارسی و عربی۔ الہ آباد یونیورسٹی کو میری ناچیز تالیف "تنویر ادب" کے بارے میں ذیل کی سطور تحریر فرمائیں:۔

اقتباس

. . . . . مجھے خوشی ہوئی کہ ایک لائق شخص سے میرا

تعارف ہوا۔ دونوں کتابیں (جذباتِ صغیر اور تنویرِ ادب) پڑھیں۔ ماشاء
اللہ زبان ستھری، طرزِ تحریر پسندیدہ، تبصرہ حسنِ مذاق کی دلیل۔ شکستہ
بابو سے لے کر اس وقت تک اس موضوع پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں اظہار
رائے اور تبصرہ و تنقید میں صغیر احمد جان صاحب کا مرتبہ ان سب سے
بلند ہے اور تحسین ناشناس و سکوت سخن شناس کے عیب سے بالکل
پاک ہے۔ صرف سبحان اللہ اور واہ واہ ہے اور نہ سختی و کرختگی۔ بلکہ
جو کچھ لکھا ہے [illegible] کر لکھا ہے یعنی آشنائے سخن کی رائے معلوم ہوتی
ہے۔ والسلام

سید سلیمان۔ ۲۲ اگست ۱۹۳۶ء

بعض ادبی رسائل نے بھی اس تالیف پر تبصرہ کر کے میرا دل بڑھایا
ماہنامہ "معارف" کی رائے درج ذیل ہے۔

(معارف بابت ماہ فروری ۱۹۳۹ء)

تنویرِ ادب، مؤلفہ جناب صغیر احمد جان صاحب ایم۔ اے۔۔۔
اردو نظم و نثر کی علیحدہ علیحدہ مسلسل تاریخیں متعدد ہیں۔
لیکن دونوں کی مشترک بہت کم ہیں۔ پھر ان میں جدید تحقیقاتوں کا پورا
استقصا نہیں ہے اور ایسی مختصر اور جامع تاریخیں تو بالکل نہ تھیں
جو اردو کے طلبہ کو طویل کتابوں کے مطالعہ کی زحمت سے بچا سکیں۔ اب
طرف اس طرح کی ایک دو کتابیں لکھی گئیں لیکن۔ وہ بعض
ناقص ہیں۔ "تنویرِ ادب" ہر لحاظ سے مکمل اور جامع ہے

نظم و نثر کے متعلق جو کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اور جتنی تحقیقات ہو چکی ہے وہ سب اس میں سلیقہ کے ساتھ جمع کر دی گئی ہے۔ ابتداء میں اردو زبان کے ماخذ اور اس کے تکوینی دَور کے مختصر حالات اور اس کے ابتدائی نمونے ہیں۔ پھر شاعری کے ابتدائی دَور یعنی دکنی شاعری کی تاریخ ہے۔ پھر شمالی ہند میں اس کے آغاز سے لے کر موجودہ عہد تک تمام دوروں کے حالات شاعری کی عہد بعہد کی ترقیوں، ان کی خصوصیات اور تغیرات پر تبصرہ ہے۔ اسی طرز پر نثر کی پوری تاریخ ہے اس طرح اس میں اردو نظم و نثر کی تاریخ، شعراء اور مصنفوں کے حالات ہر دور کی ادبی خصوصیت رجحانات، تغیرات مصنف کی خدمات اسلوب تحریر وغیرہ زبان و ادب کے مختلف پہلوؤں پر ناقدانہ تبصرہ ہے۔ اس کتاب میں معلومات کے لحاظ سے کوئی نیا اضافہ نہیں ہے لیکن اختصار اور جامعیت کے ساتھ ترتیب اور تنقید بہت اچھی ہے خصوصاً اردو نثر کے اصناف کی تقسیم اور تنقید میں حُسن مذاق سے کام لیا گیا ہے۔" یہ کتاب اردو کے طلبہ کے لئے بہت مفید ہے۔"

ہندوستان کی بعض یونیورسٹیوں اور تعلیمی بورڈوں نے بھی اس تالیف کی قدر افزائی میری توقعات سے بڑھ کر فرمائی۔ چنانچہ دہلی یونیورسٹی نے اس کو بی اے کے نصاب میں داخل کیا۔ اور الٰہ آباد کے [illegible] کے ہائی سکول اور انٹرمیڈیٹ اور ہائر سیکنڈری بورڈوں [illegible] جستہ جستہ حصّے ایف اے کے نصاب میں داخل کئے

ان امور نے میرا حوصلہ بڑھایا۔ اور اب میں اس تالیف کو زیادہ
جامع اور زیادہ مکمل اور زیادہ مفید شکل میں پیش کرتا ہوں ۔

گر قبول افتد زہے عزّ و شرف

اس تالیف کی طبع اوّل سے لے کر آج تک عہد حاضرہ کے متعدد
شعراء راہیٔ ملک بقا ہو چکے ہیں سب سے پہلے حضرت اصغر گونڈوی
نے رحلت کی۔ انکے بعد صفی لکھنوی، ظریف لکھنوی، حضرت سائل دہلوی
ڈاکٹر اقبال، اختر شیرانی، سیماب اکبرآبادی، آرزو لکھنوی، حسرت موہانی
اللہ کو پیارے ہوئے۔ میں ان مرحومین کی تاریخ ہائے وفات و دیگر
ضروری یادداشتیں "تنویر ادب" کی ایک جلد کے حاشیہ پر درج کرتا رہتا
تھا، اس امید پر کہ بوقت طبع ثانی ان کو موقع موقع پر درج کر دونگا۔ مگر
افسوس کہ وہ جلد دیگر مفید اور کارآمد کتابوں کے ساتھ ہجرت کی دست بُرد
کی نذر ہو گئی۔ اس نقصان کا جس قدر قلق ہے اس سے زیادہ اس امر
کا افسوس ہے کہ یہاں آکر باوجود سخت کوشش کے ان امور کو دریافت
کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ چنانچہ بعض شعراء مرحومین کی تاریخہائے وفات تک
درج نہ ہو سکیں جس کوتاہی کے لئے میں معذرت خواہ ہوں۔ میری
کوشش اب بھی جاری ہے اگر کامیابی ہوئی تو انشاء اللہ طبع سوم
میں اگر اس کا موقع آیا، درج کر دی جائیں گی۔

خاکسار صغیر احمد جان

عرضِ حال

دیباچہ طبعِ اوّل

منظور ہے گذارشِ احوالِ واقعی

تاریخ زبان و ادب اُردو کی ضرورت جس قدر مجھے زمانہ طالب علمی میں محسوس ہوتی تھی اس سے زیادہ زمانہ معلّمی میں محسوس ہوئی ہمیشہ ایسی تاریخ کی جستجو رہی جو مختصر بھی ہو اور مکمل بھی جس میں بقدر ضرورت تاریخی معلومات بھی بہم پہنچائی گئی ہوں اور تنقید بھی معیار و مذاق حال کے مطابق ہو۔

اس وقت اردو میں متعدد تاریخیں موجود ہیں۔ اور بعض ان میں سے اپنی گوناگوں ادبی دلچسپیوں کے باعث حیات ابدی حاصل کر چکی ہیں مگر طلبہ کے نقطۂ نظر سے ان میں کسی نہ کسی بات کی کمی ضرور ہے۔ وہ یا تو ضرورت زیادہ ضخیم ہیں۔ یا انکی معلومات زمانۂ حال کی تحقیق کا ساتھ نہیں دیتیں۔ نقص تو عام ہے کہ تنقید زیادہ تر لفظی ہوتی ہے مختلف شعرا اور مختلف کے [illegible] شاعری کا اساسی فرق اچھی طرح ذہن نشین نہیں ہوتا۔ اور اردو زبان [illegible]ی و نثر نگاری کی تدریجی ترقی کے متعلق عام رائے قائم کرنے

میں مدد نہیں ملتی۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ ادب کے مطالعہ کا حق ادا نہیں ہوتا۔
مدت سے تمنا تھی کہ کوئی صاحب ایک مختصر لیکن با اصول، مکمل
لیکن رطب و یابس سے پاک اور مذاقِ حال کے مطابق "تاریخ زبان و
ادب اردو" تالیف کرکے طلبہ کی سہولت اور دلچسپی کا سامان مہیا کریں۔ آخر
سوچا کہ یہ کام خود میں ہی کیوں نہ کروں۔ خیال آیا اور خیال کے ساتھ ہی ہمت،
شروع ہونے کی دیر تھی کہ چند ماہ کی کاوش سے جو ہو سکا ہدیۂ ناظرین
ہے ؎

شرمم آید از بضاعت بے قیمتم ولیک　　در شہر آبگینہ فروش است و جوہری

تنویر ادب کو ضرورتاً حصۂ نظم و حصۂ نثر میں تقسیم کیا ہے اور ان دونوں
حصوں میں علیحدہ علیحدہ دور قائم کیے گئے ہیں۔ اگرچہ ادوار کا خیال رکھا ہے
لیکن تعین ادوار میں ایک حد تک جدت کے ساتھ سہولت پیدا کرنے
کی کوشش کی ہے چنانچہ اس تعین میں زمان و مکاں سے زیادہ زبان
کی نوعیت طرزِ شاعری اور خیالات کے عام رجحان کو مدنظر رکھا ہے
اور حصۂ نثر میں موضوع اور اسالیب بیان کو۔ ہر دور کے اختتام پر مجموعی نقد
و تبصرہ درج کیا ہے تاکہ کتاب کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ ادبی ترقی کا خاکہ
بھی ذہن نشین ہوتا جائے

ہر شاعر اور انشاپرداز پر انفرادی حیثیت سے بھی تنقید کی ہے اور
یہ کوشش کی ہے کہ مصنفین کی خصوصیات کو اس طرح نمایاں کیا جائے
کہ ان میں سے ہر ایک کے لئے بزمِ ادب میں الگ الگ نمایاں اور

ممتاز جگہ معین ہو سکے۔

ادوار پر مجموعی اور شعرا پر انفرادی تنقید کی ذمہ داری مجھنا چیز ہی پر عائد ہوتی ہے۔ البتہ مصنفین کے حالات زندگی کے لئے اردو فارسی تذکرے۔ ادبی تاریخیں اور ادبی مضامین پیش نظر رہے ہیں۔ ان کتب کے مصنفوں اور مؤلفوں میں جو بفضلہ تعالیٰ حیات ہیں نا چیز ان کے روبرو زانوئے تلمذ تہ کرتا ہے بعض اس دنیا میں نہیں چنانچہ ان کے مزاروں پر تشکر و امتنان کے پھول چڑھاتا ہے۔

خاکسار۔ شمیم احمد جان

فہرست مضامین

بہت ترقی دی، ابراہیم عادل شاہ متوفی ۹۵۷ھ کے زمانہ میں اردو نے شاہی دفاتر پر قبضہ کر لیا، ظاہر ہے، کہ جو زبان حکومت کی ہو اس کی قدر رعایا کے دل میں کس قدر ہوگی، یہی وجہ ہے کہ اسی عہد سے اس زبان میں باقاعدہ تصنیف و تالیف شروع ہو گئی۔

اردو کا اولین شاعر

مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی اپنی تصنیف "دکن میں اردو" میں فرماتے ہیں، کہ وجیہ الدین وجدی اردو کے پہلے شاعر ہیں، وجدی قلی قطب شاہ کے عہد میں گزرے ہیں ۹۸۰ھ میں پیدا ہوئے، اور ۱۰۶۱ھ میں انتقال کیا، لیکن مزید تحقیقات جو ہو رہی ہیں اس سے بھی قدیم عہد میں پہنچتی ہے، اور یوسف عادل شاہ کے عہد حکومت میں ۹۰۲ھ ۱۵۰۰ء شاہ میرانجی کو قدیم ترین شاعر پاتی ہے۔

۱۔ شاہ میرانجی شمس العشاق

آپ یوسف عادل شاہ کے عہد میں گزرے ہیں، بیجاپور کے رہنے والے اور بڑے صوفی اور اہل حال و قال بزرگ تھے، آپ نے مقامی علماء سے علوم متداولہ حاصل کئے اور فارغ التحصیل ہو کر حج کعبۃ اللہ کے لئے تشریف لے گئے، بیان کیا جاتا ہے کہ آپ مدینہ منورہ میں بارہ سال مقیم رہے، اور ہر سال فریضۂ حج بجا لائے، حجاز سے واپس آ کر آپ نے بیجاپور کے قلعہ کے باہر قیام کیا۔

شاہ میرانجی چشتیہ خاندان میں خواجہ کمال الدین سے بیعت تھے۔ آپ نے ۲۵ شوال ۹۰۲ھ (۱۴۹۶ء) میں اس جہان فانی سے کوچ فرمایا، اور بیرون قلعہ بیجاپور بمقام شاہ پور مدفون ہوئے جہاں ہر سال ۲۵ شوال کو آپ کا عرس

ہوتے ہے، شاہ میرانجی نے نظم و نثر کی چار تصانیف یادگار چھوڑیں

(۱) شرح مرغوب القلوب۔ یہ کتاب نثر میں ہے۔

(۲) خوش نامہ۔ یہ ایک سوستر اشعار کی مختصر مثنوی ہے جس میں ایک دوشیزہ کا قصہ بیان ہوا ہے جسے اپنے مرشد سے کمال عقیدت تھی، اور جو ستر سال کی عمر میں راہی ملک بقا ہوئی۔

(۳) شہادت الحقیقت۔ اس نظم میں ۵۶۳ بند ہیں، ہندی بحروں میں لکھی گئی ہے اور تصوف کے متعلق ہے۔ اسلوب بیان سادہ اور سلیس ہے۔

(۴) خوش نغز۔ یہ بھی ایک مختصر سی مثنوی ہے ایک لڑکی میرانجی سے تصوف کے متعلق چند سوال کرتی ہے آپ ان کا جواب دیتے ہیں۔ اس مکالمے کو نظم کا جامہ پہنایا گیا ہے۔

۲۔ شاہ برہان الدین جانم آپ شاہ میرانجی شمس العشاق کے بیٹے اور خلیفہ تھے اور اپنے وقت کے باکمال بزرگ اور شاعر تھے لوگوں کو آپکے ارشادات سے بے انتہا فیض پہنچا، آپ کی آخری تصنیف "ارشاد نامہ" ہے یہ مثنوی ۹۹۰ھ (۱۵۸۲ء) میں پایۂ تکمیل کو پہنچی گویا آپ ۹۹۰ھ تک حیات تھے۔

مولانا عبدالحق اور ڈاکٹر محمد حفیظ سید (پروفیسر الہ آباد یونیورسٹی) کے پاس شاہ برہان الدین جانم کی تصانیف کا اچھا خاصہ ذخیرہ موجود ہے۔

آپ کی تصانیف حسب ذیل ہیں:

(۱) وصیت الہادی۔ یہ رسالہ ذکر کی تعلیمات پر مشتمل ہے، دو صفحہ پر ایک

مختصر سی بحث بھی اس میں شامل ہے

(۲) نکتہ واحد، ۱۲ اشعار کی مختصر نظم ہے جس میں مسئلہ توحید کی بحث ہے ۔

(۳) سیم الکلام ۴۹۴ اشعار کی نظم ہے اس میں قرآن شریف کی متعدد آیتوں کے ترجمے کو نظم کا جامہ پہنایا گیا ہے

(۴) رموز الواصلین یہ مثنوی بھی صوفیانہ مضامین پر مشتمل ہے ۔

(۵) بشارۃ الذکر مختصر نظم ہے جس میں ذکر بالجنان اور ذکر باللسان کے طریقے بیان ہوئے ہیں ۔

(۶) بحث التقا اس میں توحید اور صفات باری تعالیٰ کی بحث ہے ۔

(۷) ارشاد نامہ یہ شاہ صاحب کی طویل ترین مثنوی ہے، اس میں کل ۲۵۰۰ اشعار ہیں، اس کا موضوع بھی تصوف ہی ہے ۔

(۸) منفعت الایمان اس میں ملاحدہ اور کفار کے اعتقادات سے بحث ہے، اور آخر میں توحید کا بیان ہے ۔

(۹) سکھ سہیلا یہ بھی صوفیانہ نظم ہے، اس میں ہندو فقرا، سادھوؤں اور جوگیوں کے طریقہ نفس کشی پر تنقید کی ہے اور آخر میں یہ بتایا ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنی چاہیے، بغیر اس کے روحانیت حاصل نہیں ہو سکتی ۔

ان تصانیف کے علاوہ جانم نے متفرق دوہرے اور خیال بھی تصنیف کئے ہیں آپ کی تصانیف مقامی اور مذہبی تعصبات سے مبرا ہیں زبان اور طرز بیان نہایت صاف اور سادہ ہے، ہندی الفاظ اور ہندی طرز ادا زبان پر مسلط ہے، بحریں بھی زیادہ تر ہندی ہی ہیں، عربی اور فارسی الفاظ کو اس طرح نظم کیا ہے جس طرح وہ عوام کی زبان پر چڑھے ہوئے تھے مثلاً فہم کو فہام

علیحدہ کو الادی، سرکو سیر وغیرہ۔

۳۔ وجیہہ الدین | مشہور بزرگ تھے، زندگی کے حالات دریافت نہ ہو سکے انہوں نے ایک مثنوی تحفۂ عاشقاں ۱۰۱۵ھ (۱۶۰۶ء)

میں تصنیف کی، جو حضرت شیخ فریدالدین عطار کے خسرو نامہ کا ترجمہ ہے، مولوی نصیرالدین ہاشمی مصنف "دکن میں اردو" کا بیان ہے کہ تحفۂ عاشقاں ایک ضخیم مثنوی ہے، اور ان کی نظر سے گذری ہے، اور ذیل کے اشعار بطور نمونہ درج کئے ہیں

کروں پاک دل ہور زباں پاک سوں | تنا پاک اس عاشق پاک کوں
کہ جس سے ہوا ہے وہ گم عشق کا! | اجوں لگ ابتلا ہے خم عشق کا!
پڑیا عکس اس نور کا بس رتن | جھلکنے لگا آرسی کے منن
سو اس آرسی میں کیا جیوں نظر | ہوا عاشق اپنا آپس دیکھ کر
اپس کیچ پرتو کوں معشوق جان | کیا مبتلا ہو کے عاشق کی شان
نکل کنج مخفی سے خلوت کے بھار | کیا جلوہ کر کثرت بے شمار
الٰہی بحق محمد رسول | مرے رنج و محنت کوں کر تو قبول
لکھیا ہوں میں جو قصہ یہ سربسر | کیا مختصر یاں ترے ناؤں پر

دسے اس کی تاریخ مجھ کوں عیاں
پچھانو اسے تحفۂ عاشقاں
۱۰۱۵ھ

۴۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ ۱۰۲۰ھ (۱۶۱۱ء) | سلطان محمد قلی قطب شاہ علم و فن کا قدر دان

اور صاحب علم و فضل بادشاہ ہی نہیں تھا بلکہ ملک سخن کی عنان حکومت بھی اپنے ہاتھ میں رکھتا تھا، ایک ضخیم کلیات یادگار ہے جس میں مثنویاں، قصیدے، ترجیع بند، مراثی اور رباعیات شامل ہیں، قطب شاہ پہلے شاعر ہیں جن کا کلام بہ ترتیب حروف تہجی جمع ہوا ہے، یہ کلیات ۱۰۲۵ھ (۱۶۱۶ء) میں قطب شاہ کے بھتیجے اور جانشین محمد قطب شاہ نے مرتب کیا تھا۔

ان کے کلام میں سادگی، اصلیت اور جدت پائی جاتی ہے مقامی دلچسپیوں اور دیسی روایتوں کو نہایت لطف سے نظم کیا ہے اگرچہ استعارات اور تشبیہات کی ندرت اور تخیل کی بلند پروازی ان کے کلام میں نہیں، تاہم فطری خیالات کی سادگی وہ مزا دیتی ہے کہ ہزار تکلفات نثار، ہندی الفاظ کو نہایت خوبی سے استعمال کیا ہے، تمام کلام ہندی رنگ میں ڈوبا ہوا ہے، وہی ہندی ترکیبیں وہی ہندی استعارے اور تشبیہیں، ہند فارسی الفاظ، ہندو سورماؤں اور جانبازوں کی روایات کے حوالے، یہاں تک کہ اظہار عشق بھی جنس لطیف ہی کی طرف سے ہوتا ہے، اور یہ خاص ہندی شاعری کا رنگ ہے اور عجیب مزا دیتا ہے، کلام کا نمونہ یہ ہے،

دکھایا ہے ہر یک سندر حسن لاکھن چمن ہے — لکھے جوت سے ہر ٹھار دیکے رتن ہے
کس ٹھار ہیں دستا نہیں سب ٹھار سے بھر لو — دیکھیں جو سکت کاں اسے ہر شب بدن آ
سمجھے ہے ایک بورنیاں میں سو ہزار ل — باتاں سو کروڑاں ہیں دسے یک رسن آ
مج عشق گری آگ کا ایک جھنگی ہے سورج — اس آگ کے شعلے کا دھواں رنگ گگن ہے

پیا باج پیالہ پیا جائے نا — پیا باج یک تل جیا جائے نا

نہیں عشق جس وہ بڑا کور ہے   کدھیں اس سے مل بیسیا جائے نا
قطب شہ نہ دے منج دوانے کو پند
دوانے کو کچھ پند دیا جائے نا

نوحہ

دو جگ اماں دکھ سے سب جیو کرتے زاری وائے وائے
تن روں کی لکڑیاں جال کر کرتی ہیں خواری وائے وائے
آسمان منج جلا ہوا سورج اگن والا ہوا!
حیدر سو جل کالا ہوا ہے دکھ اپاری وائے وائے
یک پوت کو دیتے زہر یک پوت پر کھینچے خنجر
کافر کئے کیسے تمر یو زخم کاری وائے وائے
قطبا کو ہے اللہ و بستا ہے اس دل میں خدا
توں منج مدد حیدر و لد سیریاں کوں زاری وائے وائے

۵۔ سلطان محمد قطب شاہ (۱۶۱۱ء تا ۱۶۲۵ء) فارسی اور اردو میں آپ کے دو دیوان موجود ہیں۔ فارسی میں ظل اللہ اور اردو میں قطب شاہ تخلص کرتے تھے۔ کلام میں شیرینی، صفائی اور لطافت پائی جاتی ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

رہن باس کی من پیا باج دیکھی   ہوئے تن یوں سکھ جب ملے پیو پیالا،
مرادل ہے زر الفت کا کارخانہ   نہیں مجکوں یا نار دالا کا حاجت
سنو لوگ میری پرم کی کہانی   کہ پیلا ہے رنگ عاشقی کی نشانی

۶۔ سلطان عبداللہ قطب شاہ (۱۶۲۵ء تا ۱۶۷۲ء) آپ کا تخلص عبداللہ تھا نمونہ کلام یہ ہے :-

دلا حق کی طرف ہو کہ حق آرام دویگا — سعادت کی تری ہات میں انجام دویگا

ردپا میرے لال کا آئے نہ تحریر میں — چاند عطارد اگر ہووں قلم ہور دوات

قطب شاہی عہد کے دیگر شعراء

دربار گولکنڈہ اور بیجاپور اس عہد میں شعراء کا ملجا و ماوا تھا، ہر طرف شعر و شاعری کا چرچا تھا، اور ہر سر میں ذوق نغمہ سرائی کا سودا۔ تذکروں سے متعدد شعراء کے ناموں کا تو علم ہوتا ہے لیکن افسوس کہ انکی زندگی کے حالات دستیاب نہیں ہوئے۔

۱۔ ابن نشاطی سلطان عبداللہ قطب شاہ کے عہد کے نامور شاعر ہیں انہوں نے ۱۰۷۶ھ (۱۶۶۵ء) میں مثنوی پھول بن تصنیف کی، یہ مثنوی کئی لحاظ سے قابل قدر اور دلکش ہے سلاست اور روانی اس کی خصوصیات ہیں صنائع لفظی و بدائع معنوی کا استعمال نہایت سلیقہ سے ہوا ہے، اس کے علاوہ معاشرتی، اخلاقی اور تاریخی حیثیت سے بھی یہ مثنوی بہت اہم ہے اس کے مطالعہ سے اس زمانے کے رسم و رواج کے متعلق کافی واقفیت حاصل ہوتی ہے، رسالہ ہمایوں بابت اپریل ۱۹۵۲ء میں اس مثنوی پر ایک مفید مقالہ شائع ہوا ہے، نمونہ کلام یہ ہے :-

اول میں حمد رب العالمین کا — دل و جاں سوں کہوں جان آفریں کا

خداوندا تجھے ہے جسم جدائی — ہمیشہ تجکوں ساجی کبریائی

ازل سوں نیں سمج تیرا بدایت ابدکوں فہم نیں تیرا نہایت
کروں یں پہلے لے بات ابتدا نعت سچیں حق کے پیمبر کا ادا نعت
محمدؐ پیشوا ہے سروراں کے وہی سرخیل سب پیمبراں کے
زباں کوں یں اد کے سات کھولوں نبی کے جانشیں کا مدح بولوں
علی سارے نبیاں یں ہے سپہدار علی سارے ولیاں یں کا ہے سردار
شہاں کا شاہ عبداللہ غازی خدائی ہے تیرے حکم پیش بازی
سعادت کے نین کا نور ہے توں شجاعت کے گگن کا سور ہے توں
حکوی ہے باغباں اس پھول بن کا چمن لاتا ہے یوں تازی سخن کا!
کتے یک شہر مشرق کے کدھن تھا جو اس کا ناؤں سو کنچن پٹن تھا
حصار اس کا دریا کے تھا کنارے دسے خندق ہور دریا تس کنارے
کتے کوئی بادشاہ یک اس کدھن تھا حکومت میں سلیماں کے نمن تھا
بنی آدم تھے جیوں حضرت میں یکسر ہوئے تھے وحش و طیر اس کے مسخر
نہ تھا بیٹا سو کوئی اس شاہ کے گھر ہوا تھا راج بیٹی پر مقرر

۲۔ غواصی قطب شاہی عہد کے نامور شاعر ہیں۔ دو مثنویاں انکی یادگار ہیں (۱) فسانہ سیف الملوک و بدیع الجمال۔ یہ فارسی الف لیلہ کے ایک مشہور قصے کا نظم اردو میں ترجمہ ہے۔ تاریخ تصنیف ۱۰۲۷ھ (۱۶۱۷ء) ہے

برس یک ہزار ہور ستا دیس میں کیا ختم یہ نظم دن تیس میں

طوطی نامہ۔ یہ مثنوی ۱۰۴۹ھ (۱۶۳۹ء) میں تصنیف ہوئی نمونہ کلام یہ ہے:-

الٰہی جگت کا الٰہی سو توں!   کرنہار جم بادشاہی سو توں
ترے حکم تل تو کر آسمان کے   رعیت ملک تیرے فرمان کے
بھرپالیس گھراں بیچ تلسے چشم   کریں نغمتیاں سوں الٹک دمبدم

۳۔ ملا قطبی

آپ نے ۱۰۴۵ھ (۱۶۳۶ء) میں تحفۃ النصائح کا ترجمہ زبان فارسی سے اردو میں کیا ملاحظہ ہو:

بولوں صفت میں بے گنت   اس خالق جن د بشر
زدھار کر آسماں رکھیا   سورج ستارے ہور چندر
جوں رنگی دی عرش کوں   نیچھے اٹے یک پایتی!
جوں بیچ برساں چار سو   انپڑے براں پائے دگر

۴۔ مرزا

آپ ابو القاسم تانا شاہ کے مصاحب تھے، نمونہ کلام یہ ہے:

عارض نہیں جہند کا ترے گال سوں اچھا   سمجھی ہمن خلف کے نہ تجھ خال سوں اچھا
مزادہ لو نہال کہ دھرمٹ گئے چمن   لگتا تھا جن کے ہاتھ پگل فال سوں اچھا

۵۔ بحری

قاضی محمود بحری، صاحب حال و قال صوفی اور مشہور شاعر تھے، آپ کے والد کا نام بحر الدین تھا، اسی رعایت سے آپ نے بحری تخلص اختیار کیا، آپ اپنی زندگی میں بہ حیثیت شاعر زیادہ مشہور نہیں تھے زیادہ تر مذہبی اور صوفیانہ مضامین نظم کیا کرتے تھے اور اس قسم کے مضامین عام پسند نہیں ہوتے تاہم سلسلہ تصنیف برابر جاری رہا، اورنگ زیب کی فتوحات دکن کے دوران میں آپ حیدرآباد پہنچے، راستے میں قزاقوں نے آپ کا مال و

اسباب لوٹ لیا اور ساتھ ہی آپ کا سرمایہ سخن بھی لٹ گیا،

آپ کی مثنوی "من لگن" کے مطالعے سے آپ کی زندگی کے حالات پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔ یہ مثنوی سنہ ۱۱۲۰ھ (سنہ ۱۷۰۸ء) میں تکمیل کو پہنچی۔ لکھا ہے کہ میں نے کسی استاد کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ نہیں کیا نہ کسی شاعر کی صحبت سے فیضیاب ہوا۔

بحری نے تین تصنیفیں اپنی یادگار چھوڑیں :۔

(۱) مثنوی من لگن یہ مثنوی بہت ضخیم ہے، تعداد اشعار ۳۷۹۰ سے اوپر ہے، تصوف اس مثنوی کا موضوع کلام ہے۔

(۲) دیوان۔ اس میں کل ایک سو گیارہ غزلیات بہ ترتیب حروف تہجی درج ہیں۔

(۳) مثنوی بنگاب نامہ، اس مثنوی میں بارہ "جام" یعنی بند ہیں، اور ہر بند میں متعدد اشعار، نمونہ کلام یہ ہے،

لے روپ ترا رتی رتی ہے — پریت پریت رتی رتی ہے
اوٹ اے قلم اس گھڑی نہ گھر جائیں — تک نعت نبی کی سیر کر آئیں
ہے ناؤں احد نشان احمد — سرخی سو احد ہے پاں احمد
مولا کے محب نبی کے نائب — مانس نہیں مظہر العجائب
ساگر ہیں سلوک معرفت کے — بل عین ہیں نور معرفت کے

اورنگ زیب عالمگیر کی تعریف میں کہا ہے

دیندار دلیر اہور دانا — یک علم میں سب منے سیانا

غزلیات از دیوان بحری

محمد گر مدد ہوگا ہمارا
سکل دکھ درد دور ہوگا ہمارا

اگر صحرا رہو ل دام ہور دد
او سارا دام و دد ہوگا ہمارا

اگر عالم سکل آگا عدو ہو
او اللہ الصمد ہوگا ہمارا

کرم اس کا دس آگا کم ہو سگاہ
اگر کو لا اسد ہوگا ہمارا

موحد کا معما کھول محمود
او احمد گر احد ہوگا ہمارا

درد کیتا سہوں ارے جانا
ہے یو بہتر جو بیوڑا جانا

عاشقی حاصل تجھ تے اے معشوق
جب کہ جانا نہ تجھ اپر بھاتا

عشق کے درد دکھ لواسے پر
دیکھ نانا کہے کہیں نانا!

نہ سمجھ سہی بڈی کلیجن کوں
گر یو تانا جو گاسے گا نانا

لاف بلنے کی مت کرے بحری
گرچہ دانا ہے توں تو یک دانا

دیکھ تیرے او رخ رنگیلے لال!
پھول ہوتے ہیں پھول کھل خوشحال

دیکھ تجھ بن میں بلبلاں ساری
دد ولی ڈنگ ہور مذبذب حال

سرو تجھ قد سوں سرفراز ہوا
نہ کہ یک سرو ہر نہال نہال

لال تجھ لال ادھر کی لالی کوں!
لال بولوں تو جیب ہوتی لال!

لال کیا پوچھتا ہے حال مرا
حال تجھ پاؤں سوں ہے سب پامال

بحر یا صبر بیتر اس جاگا
دل کوں رکھ دھیر اگر زماں ہے تال

ساقی دے مجھے مے کہ جو ہر ہم کے غم کوں   اودے جو غضنفر ہو دسے غم کے غنم کوں
دے جو خرابات میں خاقاں ہوا چایا   ساغر کئے طبل مار صراحی کئے علم کوں
اودے کہ جو طاؤس اگر تر کرے منقار   گم کر نہ چھپانے وہ الیس سر سوں قسم کوں
اودے کہ جو جس مول کے کرنے میں کلالا   کوڑی کے مُن ڈال دئے ل سکے درم کوں

او کون مشایخ جو کرے منع منجے مے
او کون جو پھر نم کرے ملک کے سو قلم کوں

ہنے لیخا نوں ترے چاہ زنخ میں کے ہزار   ماجہاں تو شعی غرقاب ہوئے ہے ہزار
چپ چپ یکدن لب سوں لب لایا تو رسوا جگ ہوا   سچ سے بچارے نے بدنام لیا دے سے ہزار
عاشقاں کوں مارت بل پال اپنے پیارے   ذر ستاں زلف سے سر کو سنداں پیچ ہزار
اشتیاقی زلف کے دھر دور کے آیا ہوں میں   جوں مسافر جن کا کرنا ہے منزل طے ہزار

عاشقی کی لاف تجہ ری مت کریں البتہ تو
کے ہزاراں آئے ہیں تجھ سار کے اور گئے ہزار

۳۔ شیخ شجاع الدین نوری

شمالی ہند میں بابر کے عہد حکومت میں مجالس عزا اور مرثیہ گوئی کا دستور نہ تھا لیکن دکن میں ان کا رواج ہو چکا تھا۔ سلاطین عادل شاہی نے مجالس عزا کی ابتدا کی لیکن ابتداً فارسی مرثیہ گو شعرا خصوصاً محتشم کاشی کے بند پڑھے جاتے تھے، اردو میں کوئی مرثیہ گو نہیں تھا لیکن جب مجالس عزا کا خوب چرچا ہوا اور اردو زبان میں بھی کچھ صلاحیت پیدا ہو گئی تو دکن میں ایک گروہ مرثیہ گو شعرا کا پیدا ہوا اور شیخ شجاع الدین نوری مرثیہ گوئی کے باوا آدم قرار پائے۔

نوری بیجاپور کے رہنے والے تھے، صاحب علم و فن تھے، اور شعر و سخن کے دلدادہ تھے، اکبر کے عہدِ حکومت میں آگرہ کا سفر کیا، اور ایک مدت تک ابوالفضل اور فیضی کی صحبت میں رہے۔

نوری اپنی مرثیہ گوئی کی ابتدا کے بارے میں فرماتے ہیں:-

کوئی نظم اس میں تو کرتا نہ تھا ۔۔۔ ولے سب تعصب و یا ہم مٹا
نہ کچھ خوف کھاتا نہ جھجکتا ذرا ۔۔۔ وہم مرثیہ کا بہل کر دیا!
میں جب اس کو لوگوں کے آگے پڑھا ۔۔۔ عجب حال عاشور خانہ میں تھا
حسن واہ اس سب کرتے تھے واہ وا ۔۔۔ کہ دکھنی میں لکھا ہے کیا مرثیا
زباں اپنی میں کس نے ایسا لکھا ۔۔۔ کبھی اس سے پہلے سنا نا پڑھا
اماں سے اس کا ملے گا صلہ ۔۔۔ کہ ہے نوری ہی موجد اس طرز کا

۷۔ ہاشم علی برہان پوری

یہ صنف مرثیہ نگاری نوری کے بعد ہاشم علی برہانپوری کے حصے میں آئی، نمونہ کلام یہ ہے:

ختم ہے یوا امتحان دیو بلا ۔۔۔ ختم ہے جو حق سیں پیغام کا
تھا برادر لاد شفیع المذنبیں! ۔۔۔ ظلم بے حد رہا اں اقسام کا
زخم لاگا مرتضیٰ کے سر اوپر ۔۔۔ گر پڑا جوں آفتاب اس بام کا
زہر دے مارے حسن کو مکر سیں ۔۔۔ سبز تھا وہ چہرہ گلفام کا
کربلا میں تھا حسین ابن علی ۔۔۔ آج غم ہے گا اہیں ایام کا

۸۔ ولی اورنگ آبادی

مولانا محمد حسین آزاد نے "آب حیات" میں ولی کو اردو شاعری کا باوا آدم قرار دیا ہے لیکن حقیقت

یہ ہے کہ آپ اردو زبان و ادب کے دور اول کے خاتم الشعراء تھے، اور دور دوم کے مقدم الشعراء۔

آپ کے نام کے متعلق اختلافات ہیں، کسی نے آپ کا نام شمس الدین بتایا ہے اور کسی نے شمس الحق، کوئی ولی الدین نام لکھتا ہے، اور کوئی حاجی ولی، لیکن تخلص کے بارے میں سب متفق الرائے ہیں، اور سب کے نزدیک آپ کا تخلص ولی ہے،

ولی ۱۶۶۸ء میں بمقام اورنگ آباد پیدا ہوئے، اور بیس سال کی عمر تک وہیں تعلیم و تربیت پائی، اور اس کے بعد احمد آباد کا سفر کیا وہیں آپ شاہ نور الدین گجراتی کے حلقہ ارادت میں داخل ہوئے۔

آپ کو سیر و سیاحت کا بڑا شوق تھا، چنانچہ آپ نے دو مرتبہ دہلی کا سفر کیا، پہلی مرتبہ ۱۷۰۰ء یعنی اورنگ زیب کے عہد میں، دوسری مرتبہ ۱۷۲۲ء یعنی محمد شاہ کے زمانے میں پہلی مرتبہ آپ کا قیام دہلی میں مختصر رہا، اس قیام کے حالات میں قابل ذکر صرف یہ امر ہے، کہ آپ نے دہلی کے مشہور بزرگ اور فارسی شاعر شاہ سعد اللہ گلشن سے فیض صحبت حاصل کیا، دوسری مرتبہ آپ کا دیوان غزلیات بھی آپ کا رفیق سفر تھا، جس نے دہلی میں خاص و عام سے خراج تحسین وصول کیا، غزلیات کا اس قدر چرچا ہوا، کہ گلی گلی، کوچے کوچے میں جس کی زبان سے سنو، ولی کی غزل کانوں میں پڑتی تھی، قوال اور ارباب نشاط ولی کی غزلیات سے محفلوں کو گرماتے تھے، دہلی کے فارسی گو شعراء نے بھی محسوس کیا، کہ زبان اردو میں بھی شعر و شاعری کی صلاحیت موجود ہے، چنانچہ انہوں نے بھی کبھی کبھی اس زبان میں سخن سنجی کی،

کئی سال قیام کرکے ولی نے دہلی کو خیرباد کہا، اور احمد آباد ہوتے ہوئے اورنگ
(آباد) پہنچے، وہاں آپ نے سنہ ۱۷۳۲ء میں دہ مجلس منظوم تصنیف کی، ولی کا انتقال سنہ ۱۷۴۴ء
میں بمقام احمد آباد ہوا،

ولی کے کلیات میں غزل، قصیدہ، رباعی، قطعہ، ترجیع بند، مثنوی، مستزاد
وغیرہ اصناف سخن آپ کی قادر الکلامی اور مشق سخن سنجی کو مسلم کرتی ہیں، اگرچہ باتیں سیدھی
سادی ہیں، تکلف اور آورد کی گردان کے آئینہ سخن پر نہیں، تاہم آپ کے عاشقانہ
اشعار میں تاثیر کے نشتر بھرے ہیں، اور اخلاقی مضامین میں گہرائی پائی جاتی ہے،
کلام سے تصوف کی چاشنی ٹپکتی ہے، اور کیوں نہ ٹپکے، کہ خود زبردست صوفی اور
بزرگوں کے عقیدت مند تھے، رموز حقائق کو تغزل کے رنگ میں اس طرح کہہ
جاتے ہیں، کہ تاثیر کے نشتر دل میں کھٹکتے ہیں -

آپ نے قصیدے بھی خوب کہے ہیں، زبان اگرچہ ابتدائی منازل طے کررہی
تھی، تاہم آپ کے قصیدوں میں زور کلام، شوکت الفاظ اور روانی کی کیفیت نظر
آتی ہے -

ولی کی زبان وہی ہے، جو دیگر دکنی شعراء کی ہے، لیکن سمجھتے سمجھتے اس قابل
ضرور ہوگئی ہے، کہ چند مخصوص دکنی الفاظ کو چھوڑ کر میر و سودا کی زبان سے زیادہ
قدیم معلوم نہیں ہوتی، بعض بعض اشعار تو ایسے بھی ملتے ہیں، کہ اگر آج بھی کوئی شاعر
طبع آزمائی کرے، تو اس سے بہتر زبان لکھنے پر قادر نہ ہوسکے، ولی کی زبان کا اصلی
جوہر ہمواری اور سلاست ہے، جو ہر رنگ میں جلوہ گر ہے، کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو:-

مکھ ترا آفتاب محشر ہے ۔۔۔ سوز اس کا جہاں میں گھر گھر ہے

کتابت کیں بھی ہے شمع زرم دل کوں اسے کاتب | پر پروانہ اوپر لکھ سخن تجھ بال افشانی کا
چھپا کر پردۂ فانوس میں جیوں شمع گریاں ہے | سنیا ہے جب سوں آوارہ رسی دشت بیابانی کا
ہوئے ہے گر گرے پرواز رنگ چہرۂ عاشق | ہوا ہے دو دن موہن کو لباس زعفرانی کا
ترے مکھ کی صفائی حیرت افزا ہے سگ کیونکر | قلم ہے جو ہر آئینہ نا صاف مانی کا

ولی جن نے زباں تد بیا دلکو اپنے پھالاں سوں
سو پایا ان نے رتبہ گریباں بن مدگانی کا

مفلسی سب بہار کھوتی ہے | مرد کا اعتبار کھوتی ہے
کیونکہ حاصل ہو تجھ کو جمعیت | زلف تیری قرار کھوتی ہے
ہر سحر شوخ کی نگہ کی شراب | مجھ انکھیاں کا خمار کھوتی ہے
کیونکہ ملنا صنم کا ترک کروں | دلبری اعتبار کھوتی ہے

اے ولی آب اس پری رو کی
میرے دل کا غبار کھوتی ہے

تجھ لب کی صفت لعل بدخشاں سے کہونگا | جادو ہیں ترے نین غزالاں سے کہونگا
بے صبر نہ ہو اے ولی اس درد سے ہرگز | جلدی سے ترے درد کے درماں سے کہونگا

یاد کرنا ہر گھڑی تجھ یار کا | ہے وظیفہ مجھ دل بیمار کا
آرزوئے چشمۂ کوثر نہیں | تشنہ لب ہوں شربت دیدار کا
اے ولی ہونا سریجن پر نثار | مدعا ہے چشم گوہر بار کا

ثانی نہ کر خدا سوں ڈر | حسن میں ثانی نہ کر خدا سوں ڈر
آرسی دیکھ کر نہ ہو مغرور | خود نمائی نہ کر خدا سوں ڈر

اے ولی جیو آستانۂ یار — جبہہ سائی نہ کر خدا سوں ڈر

جس وقت اے سری جن تو بے حجاب ہوگا — ہر ذرہ تجھ جھلک سوں جوں آفتاب ہوگا

تا حشر رہے بوئے گلاب اس کے عرق سے
جس پر منے یک بار وہ گل پیرہن آوے

کھینچیں آپس انکھیاں منے جوں کحل جواہر
عشاق کے گر ہات وہ خاک چمن آوے

تبصرہ

زبان — اس دور کے شعراء کے کلام کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو واضح ہوگا کہ ولی تک پہنچتے پہنچتے زبان میں کافی صفائی اور سلاست آگئی ہے تاہم ولی کے کلام میں کافی تعداد ایسے الفاظ اور روابط کی موجود ہے جو دکنی اردو کے لئے مخصوص ہیں، مناسب معلوم ہوتا ہے، کہ یہاں ایک مختصر فہرست ان الفاظ کی درج کردی جائے،

سوں (سے)، سیتی (سے)، کوں (کو)، ہمن کو (ہم کو)، ہمن (طرح) موہن (ہمارا) جیو (معشوق) جگ منے (دنیا میں) بر منے (بر میں یعنی گود میں) تھ دل (میرا دل)، تجھ لب (تیرا لب) بچن (کلام) نت (ہمیشہ) مکھ (منہ) بھیتر (اندر) ...وال (رکھوں) پلکاں (پلکیں) پولریہ (؟) بگانہ دوانہ (بیگانہ دیوانہ) تسبی (تسبیح) ...میں کہا ہیں... نیں (نہیں)۔

ان قدیم الفاظ کے باوجود گذشتہ دیگر شعراء کے کلام میں عموماً اور ولی کے کلام

میں خصوصاً ایسے اشعار پائے جاتے ہیں کہ اگر ایک آدھ لفظ کو بدل دیا جائے تو موجودہ زمانے کی زبان سے ان کی زبان کچھ زیادہ قدیم نہ معلوم ہو بلکہ بعض اشعار تو ایسے صاف ہیں کہ آج کل کی زبان بھی ان سے زیادہ صاف نہ ہو۔ شعر پہلے لکھے گئے مثلاً

غزالوں کی طرح سرگرم رم تھا ۔۔۔ بیاباں اس کو گلزار ارم تھا
وہاں کی باد تھی شعلہ سراسر ۔۔۔ وہاں کی کنکری تھی مثل اخگر

مثنوی لعل و گوہر (غواصی)

آبرو دے چشمہ کوثر نہیں ۔۔۔ تشنہ لب ہوں شربت دیدار کا
سند گل منزل شبنم ہوئی ۔۔۔ دیکھ رتبہ دیدۂ بیدار کا
اے ولی ہونا سریجن پر نثار ۔۔۔ مدعا ہے چشم گوہر بار کا

دل عشاق کیوں نہ ہو روشن ۔۔۔ جب خیال صنم چراغ ہوا
اے ولی گلبدن کو باغ میں دیکھ ۔۔۔ دل صد برگ باغ باغ ہوا

اصناف سخن اس دور کے شعراء نے تمام اصناف سخن غزل، قصیدہ، مثنوی، رباعی وغیرہ پر طبع آزمائی کی، اس دور میں مرثیہ بھی ایجاد ہوا اور نوحہ بھی لکھا گیا یہاں تک کہ وہ ریختی جس کو رنگین کی طبع رنگین کی ایجاد سمجھا جاتا ہے، دراصل اسی عہد میں پیدا ہوئی، مگر یوں کہئے کہ لکھنؤ کا سا زمانہ نہیں تھا، اس لئے اس نے فروغ نہیں پایا۔

غزل سلطان محمد قلی قطب شاہ نے غزل کی ابتدا کی، اور ولی نے اسے معراج کمال پر پہنچایا، غزلوں میں جو انداز بیان اختیار کیا گیا ہے، اس کی خصوصیات ہیں، صفائی اور سادگی، شاعر جو کچھ دیکھتا یا محسوس کرتا ہے اسے

اسی طرح لفظوں کا جامہ پہناتا ہے، گذرگاہ خیال میں جو مضمون ملتا ہے، اسے اسی طرح زبان سے ادا کر دیتا ہے، اپنی طرف سے کچھ نون مرچ نہیں لگاتا، یعنی دور دوم کی تشبیہوں اور نازک استعاروں سے تکلف اور تصنع پیدا نہیں کرتا، البتہ کہیں کہیں فارسی سے تشبیہیں اور استعارے و تلمیحیں مستعار لیتا ہے، اور انہیں تکلف سے نہیں، بلکہ سلیقے سے سجاتا ہے۔

قصیدہ — قصیدے کی جو خوبیاں ہیں یعنی زور کلام، شکوہ الفاظ، روانی وغیرہ سوا نازک خیالی کے، اس دور کے قصیدوں میں ملتی ہیں۔

مثنوی — اس دور کو اگر مثنوی کا دور کہا جائے، تو مناسب ہے، ادبی، فلسفیانہ، صوفیانہ، عاشقانہ، رزمیہ، بزمیہ، بیانیہ، غرض ہر طرح کی مثنوی اس عہد میں لکھی گئی، اور حق یہ ہے، کہ خوب لکھی گئی، اگر اس عہد کی سیاسی، تمدنی، معاشرتی اور سماجی زندگی کا مطالعہ کرنا ہو، تو اس دور کی مثنویوں سے بہتر اور کوئی ذریعہ واقفیت نہیں ہو سکتا، سلطان محمد قلی قطب شاہ کی متفرق مثنویوں اور نصرتی کی مثنوی "علی نامہ" سے اس عہد سے متعلق جو واقفیت حاصل ہوتی ہے، وہ کوئی بہتر سے بہتر تاریخ بھی مہیا نہیں کر سکتی، اس لحاظ سے یا ادبی لحاظ سے اس دور کی مثنویاں بہت گراں قدر ہیں۔

مرثیہ — سلاطین عادل شاہی نے مجالس عزا کی ابتدا کی لیکن ان میں فارسی کے مرثیے پڑھے جاتے تھے، سب سے اول شیخ شجاع الدین نوری نے اردو مرثیہ لکھا، ان کے بعد مرثیہ گو شعراء کی کافی تعداد پیدا ہو گئی، گویا مرثیہ کی ایجاد کا فخر بھی اسی دور کو حاصل ہے، زبان کی صفائی اور روانی سے قطع نظر

جن جن خصوصیات کے لحاظ سے انیس اور دبیر خاتم مرثیہ سمجھے گئے وہ خصوصیات ایسی جملہ لطف فرسوں اور دلچسپیوں کے ساتھ اس دور میں جلوہ فرما ہیں لیکن اپنی ابتدائی حالت میں جن خصوصیات نے انیس کو انیس اور دبیر کو دبیر بنایا، وہ یہ ہیں، جذبات نگاری، سیرت نگاری، معاملہ کی ندرت، محاکات کی لطافت وغیرہ، ان کے علاوہ روایات کا نظم کرنا بھی ایک خاص جدت سمجھی جاتی ہے دکنی شعراء کے کلام کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے، تو یہ سب خصوصیات نظر سے گذرتی ہیں اور علت یہ ہے کہ سیرت نگاری میں جو مرقعے تیار ہوئے ہیں، ان میں دیسی رنگ بھی اسی دور میں ابھر آیا ہے۔ متاخرین کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انہوں نے عربی کردار کو ہندوستانی بنا دیا، ہندوستانی پوشاک اسے پہنائی، ہندوستانی عادات و اطوار، ہندوستانی رسم و رواج، ہندوستانی طرز گفتگو، غرض ہر حیثیت سے عربی خاکوں میں ہندی رنگ بھرا لیکن حقیقت یہ ہے کہ متقدمین ہی اس روش کو ایجاد کر گئے تھے متاخرین تو محض مقلد تھے۔

غرض یہ کہ ابتدائی دور ہر لحاظ سے ادوار مابعد کا مقدم اور پیش رو ہے یہی نہیں بلکہ متوسطین اور متاخرین نے اسی دور کی قائم کردہ بنیادوں پر اپنی فلک بوس عمارتیں کھڑی کیں۔

باب ۔ ۳

ابتدائی دور شمالی ہند میں

تمہید

شہنشاہ اورنگ زیب کے بعد خاندانِ مغلیہ کا شیرازہ منتشر سا ہو گیا، بہادر شاہ نے تقریباً پانچ برس اور فرخ سیر نے چھ برس حکومت کی لیکن اس گیارہ بارہ سال کے عرصہ میں ملک کو چین نصیب نہ ہو سکا۔ محمد شاہ کے زمانے میں سادات کی قوت ٹوٹ گئی تو کچھ عافیت میسر آگئی، اس عافیت کو اہلِ کمال نے غنیمت سمجھا اور چاروں طرف سے آکر یک لخت دہلی میں جمع ہو گئے۔ ہمیں یہاں صرف شعر و شاعری سے سروکار ہے، لہٰذا انہی لوگوں کے نام درج کئے جا سکتے ہیں جنہیں شعر و شاعری کا ذوق تھا، ان میں قزلباش خاں امید، سلیمان قلی خاں وداد، ولی قلی خاں ندیم، شیخ سعد اللہ گلشن، مرتضےٰ قلی خاں، فراق، میر شمس الدین فقیر، مرزا عبدالقادر بیدل، سراج الدین علی خاں آرزو ایسی صاحبِ فضل و کمال ہستیاں ہیں جن کی فارسی شاعری پر اگر وہ عہد ناز کرے تو بیجا نہیں۔

جیسا بیان ہوا یہ اربابِ فن فارسی سے اپنی تیغِ زبان کو جلا دیتے تھے، زبان اردو کی طرف ان لوگوں نے توجہ نہیں کی کیونکہ اس عہد میں اس زبان کو کچھ فروغ نہیں تھا۔ حکومت کی زبان فارسی تھی، اور فارسی دانی ہی علم و ہنر کی سند تھی، اگرچہ چند دکنی شعراء مثلاً فراقی، فخری، آنند وغیرہ دہلی آئے، مگر زمانہ نے مساعدت

ہیں کی، اور انہیں واپس جانا پڑا، البتہ ولی اورنگ آبادی ۱۷۲۲ء میں دہلی آئے اور کچھ عرصہ قیام کر کے لوگوں میں اردو شاعری کا ذوق پیدا کیا، ان کے اردو کلام کی بڑی قدر ہوئی، قوالوں اور ارباب نشاط نے انکی غزلیات سے محفلوں کو گرما دیا، ظاہر ہے کہ جس چیز کی اتنی قدر ہو، لوگوں کے دلوں میں خود بخود اس کا شوق پیدا ہو جاتا ہے، چنانچہ دہلی میں اردو مذاق عام ہو گیا، بڑے بڑے مشاق فارسی گو شعراء نے بھی اس میں طبع آزمائی کی، مگر ان میں سے کسی نے اپنی شاعرانہ جد و جہد کو صرف اردو ہی کے لئے وقف نہیں کیا، اور یہی وجہ ہے کہ ہم انہیں اردو شعراء کی صف میں کوئی جگہ نہیں دے سکتے، تاہم ولی اورنگ آبادی کے کلام کا اثر ظاہر کرنے کے لئے اگر ان فارسی گو شعراء کے ایک ایک دو دو شعر لکھ دیئے جائیں، تو نامناسب نہ ہوگا

قزلباش خاں امید کے دو شعر تذکروں میں ملتے ہیں

درد دل یار سے اب صحبت ہے — یار بن غم میں عجب صحبت ہے
تیری آنکھوں کو دیکھ ڈرتا ہوں — الحفیظ الحفیظ کہتا ہوں

مرزا عبد القادر بیدل کے دو شعر نکات الشعراء میں درج ہیں

مت پوچھ دل کی باتیں، وہ دل کہاں ہے ہم میں
اس تخم بے نشاں کا حاصل کہاں ہے ہم میں
جس دن سے آستاں پر عشق آن کر پکارا!
پردے سے یار بولا بیدل کہاں ہے ہم میں

مرزا علی قلی خاں ندیم کے دو شعر ملاحظہ ہوں۔

جدائی میں تری ہم کیا کہیں کس طرح جلتے ہیں
بجائے مو بدن سے آگ کے شعلے نکلتے ہیں

بے قرار عشق کو ہے زندگی نقص کمال
مر چکے بیمار تب کہتے ہیں یہ اکسیر ہے

سراج الدین علی خاں آرزو فارسی کے مسلم الثبوت استاد ہیں، مولانا محمد حسین آزاد نے آب حیات میں انہیں بزم اردو کے صدر کی حیثیت سے پیش کیا ہے، اور شعراء کی صف اولین میں نہایت ممتاز مقام پر بٹھایا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ انہیں اردو شعر و شاعری سے کوئی خاص تعلق نہیں جس طرح دیگر فارسی شعراء نے رفتار زمانہ کے ساتھ دو چار قدم چلنے کا ثبوت دیا ہے، اسی طرح آرزو نے بھی چند اردو اشعار کہہ کر اپنی خوش مذاقی اور اردو کی ہر دلعزیزی کو تسلیم کیا ہے چنانچہ چند اشعار آپ کے یہ ہیں:—

ہر صبح کرتا ہے تیری برابری کو — کیا دن لگے ہیں دیکھو خورشید خاوری کو

دکھلے سیپارۂ دل کھول آگے عندلیبوں کے — چمن میں آج گویا پھول ہیں تیرے شہیدوں کے

جان تجھ پر کچھ اعتماد نہیں — زندگانی کا کیا بھروسا ہے

مجھ زلف میں اٹک نہ رہے دل تو کیا کرے — بیکار ہے ٹک رہے دل تو کیا کرے

میخانے آج جا کر شیشے تمام توڑے — زاہد نے آج اپنے دل کے پھپھولے پھوڑے

یہاں تک جو کچھ بیان ہوا وہ محض تمہید تھی تاکہ اس عہد کے عام حالات اور فضا سے واقفیت ہو جائے، تمہید اگرچہ طویل ہو گئی لیکن کم از کم اتنا ضرور معلوم ہو گیا کہ اردو نے فارسی شعراء کے دلوں پر بھی قبضہ کر لیا تھا، اور کلام دکنی نے اس ذوق

شوق میں اور جوش و خروش پیدا کر دیا تھا یہی وجہ ہے کہ دہلی میں ایک گروہ ایسے شعراء کا پیدا ہو گیا جنہوں نے اردو شعر و شاعری کو طرۂ امتیاز بنایا، شمال میں شعر و ادب کا دبستان کھول دیا، اور خود اس دبستاں کے معلم بنے، ان میں سے چند قابل ذکر ہستیوں کے حالات زندگی اور نمونہ کلام ذیل میں درج کیا جاتا ہے،

شاہ مبارک آبرو

آپ کا نام نامی نجم الدین عرف شاہ مبارک اور آبرو تخلص تھا، تاریخ ولادت ہنوز پردۂ راز میں ہے، البتہ یہ معلوم ہے کہ آپ کی ولادت گوالیار میں ہوئی، آپ کے دادا شاہ محمد غوث گوالیار کے مانے ہوئے بزرگ تھے، لڑکپن میں آبرو دہلی پہنچے، اور فن شاعری کا اکتساب کیا، اگرچہ خان آرزو سے عمر میں بڑے تھے مگر اپنا کلام انہیں دکھا لیتے تھے، آرزو سے کچھ رشتہ داری بھی تھی، آپ کچھ دن نارنول میں بھی مقیم رہے، ایک آنکھ سے معذور بھی تھے، ۱۷۵۰ء میں اس جہان فانی سے کوچ کیا،

آبرو کی علمی قابلیت فن شعر کے لئے کافی تھی، آپ نے ایک دیوان غزلیات کا مرتب کیا تھا لیکن اب وہ نایاب ہے، کلام میں سادگی اور بے تکلفی پائی جاتی ہے، غزلیات میں زیادہ تر ردیف کی قید نہیں ہوتی قافیہ میں بھی آزادی برتتے ہیں، اور یہی اس عہد کا رنگ ہے، آبرو کو ایہام اور ذو معنی الفاظ کا بہت شوق ہے، اور کلام کی بنیاد زیادہ تر اسی صنعت پر ہوتی ہے، نمونہ کلام ملاحظہ ہو:-

نین سیں نین جب ملائے گیا — دل کے اندر مرے سمائے گیا
تیرے چلنے کی سن خبر عاشق — یہی کہتا مُوا کہ ہائے گیا!
آبرو ہجر بیچ مرتا تھا — مکھ دکھا کر اسے جلائے گیا

رستم اس مرد کی کھاتے ہیں قسم زوروں کی!
تاب لاوے جو کوئی عشق کے جھکجھوروں کی

گانٹھ کاٹی ہے مرے دل کی بری انکھیاں نے
وو پلک بیچ یہ کترنی ہے مگر چوروں کی!

آبرو کو نہیں کم ظرف کی صحبت کا دماغ!
کس کو برداشت ہے ہر وقت کے نکتوروں کی

یہ رسم ظالمی کی دستور ہے کہاں کا — دل چھین کر ہمارا دشمن ہوا ہے جاں کا
تجھ راہ میں ہوا ہے اب تو رقیب کتا — لوپائے کر ہماری آمادہ ہے ناں کا
سب عاشقوں میں ہم کوں ہے وا بہ آبرو کا — ہے قصد گر تمہارے دل بیچ امتحاں کا

محمد شاکر ناجی

شاہ مبارک آبرو نے ناجی کی شیریں زبانی کی تعریف کی ہے

سخن سنجاں میں ہے گا آبرو آج
نہیں شیریں زباں شاکر سری کا

آپ محمد شاہ بادشاہ کے وزیر عمدۃ الملک امیر خاں کے وار وغہ تھے سن ولادت ووفات معلوم نہیں، لیکن آبرو کے معاصر تھے، اور نادر شاہی حملہ کے وقت ۱۷۳۹ء میں نہ صرف زندہ تھے، بلکہ محمد شاہی لشکر میں شامل رہے تھے دہلی در اور لشکر کی کیفیت ایک مخمس میں نظم کی ہے جس کا ایک بند ملاحظہ ہو۔

لڑے بھڑے تو برس بیس اُنکو بیتے تھے — دعا کے زور سے لڑائی ہو وا کے جیتے تھے
سرایں گھر کی نکالی مرے سے پیتے تھے — نگار نقش میں ظاہر گویا کہ جیتے تھے
گلے میں ہسلیاں بازو پر طلا کے نال

آپ کے کلام میں سادگی اور صفائی کے علاوہ ظرافت کی چاشنی اور شوخی کی ملاحت عجب مزا دیتی ہے، آپ کی طبیعت کا میلان ہزل گوئی کی طرف تھا آبرو کی طرح ایہام و ذو معنیین الفاظ کا بھی شوق تھا، اور اسی صنعت پر کلام کی بنیاد تھی۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو:-

اے صبا کہہ بہار کی باتیں ۔۔۔ اس بت گلعذار کی باتیں
کس پہ چھوڑے نگاہ کا تہبانی ۔۔۔ کیا کرے ہے شکار کی باتیں
چھوڑتے کب ہیں نقد دل کو صنم ۔۔۔ جب یہ کرتے ہیں پیار کی باتیں
دیکھ موہن تری کمر کی طرف ۔۔۔ پھر گیا مانی اپنے گھر کی طرف
حسن نے دیکھے ترے لب شیریں ۔۔۔ نظر انکی نہیں شکر کی طرف
ہے محال ان کا دام میں آنا ۔۔۔ دل ہے ان سب بتاں کا زر کیطرف
حشر میں پاک باز ہے ناجی ۔۔۔ بد عمل جائیں گے سقر کی طرف

شیخ شرف الدین مضمون

شیخ شرف الدین نام مضمون تخلص تھا شیخ فرید الدین شکر گنج کی اولاد میں سے تھے، آگرہ کے قریب موضع جاجمؤ میں پیدا ہوئے، اور آغاز شباب میں دہلی چلے آئے اور پھر اسی کو اپنا وطن بنایا، اور زینت المساجد میں درویشانہ زندگی بسر کی، خان آرزو سے مشورۂ سخن کیا کرتے تھے سنہ ۱۱۵۸ھ میں راہی ملک بقا ہوئے مضمون اس دور کے مسلم الثبوت استادوں میں شمار ہوتے ہیں، سودا اپنے ایک شعر میں فرماتے ہیں:

ہائیں اٹھ گئیں یارو غزل کے خوب کہنے کی ۔۔۔ گیا مضمون تو دنیا سے رہا سودا سو مستانہ

آپ کا کلام آپ کی استادی اور مشاقی کو مسلم کرتا ہے آپ کے کلام میں اشعار کی چاشنی موجود ہے لیکن زمانے کے اصلی رنگ یعنی ایہام اور مراعاۃ النظیر سے بھی کام لیا ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

رہے ہے دار کو کامل بھی سرتاج — ہوا منصور سے یکسر عمل آج
ہم نے کیا کیا ترے عشق میں محبوب کیا — صبر ایوب کیا، گریہ یعقوب کیا
کریں کیوں نہ شکر لبوں کو مرید — کہ دادا ہمارا ہے بابا فرید
تیر مژگاں برستے ہیں مجھ پر آ — آب پیکاں کا اس طرف ہے ڈھال
کیا مجھ بلبل نے باندھا ہے چمن میں آشیاں — ایک تو گل بیوفا اور تس پہ جور باغباں
میرا پیغام وصل اے قاصد — کہیو سب سے اسے جدا کر کے

چلا کستی میں آگے سے جو وہ محبوب جاتا ہے
کبھی آنکھیں بھر آتی ہیں کبھی جی ڈوب جاتا ہے

محمد احسن احسن

محمد احسن نام، احسن تخلص، اسی ابتدائی دور کے مشہور شاعر تھے ان کا کلام ایہام کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ ملاحظہ ہو:

صبا کہیو اگر جاوے ہے تو اس شوخ دلبر سوں
کہ کر کر قول پرسوں کا گیا برسوں ہوئے پرسوں

لام نستعلیق کا ہے اس بت خوش خط کی زلف — ہم تو کافر ہوں اگر بندہ نہ ہوں اسلام کے
نازک بدن پہ اپنے کرتے ہو تم جو غرہ — تو ملی کمر نے تجھ کو فرعون سا بنایا

غلام مصطفے خاں یکرنگ

غلام مصطفے خاں نام، یکرنگ تخلص، ہم سال اور کہنہ مشق شاعر تھے حضرت مرزا مظہر

جان جاناں سے مشورۂ سخن کرتے تھے، اپنے وقت کے خوش فکر، باکمال اور مشاق شاعر مانے جاتے تھے، اور محمد شاہی امراء میں صاحب حیثیت تھے، نمونہ کلام یہ ہے۔

زباں شکوہ سے جہدی کا ہر بات ۔۔۔ کہ خوباں نے لگائے ہیں مجھے ہات

یکہ یکہ نے تلاش کیا ہے بہت ڈھونڈے ۔۔۔ مظہر سا اس جہاں میں کوئی میرزا نہیں

جدائی سے تری اے صندلی رنگ ۔۔۔ مجھے یہ زندگانی دردِ سر ہے

اس قدر کیا ہے ہمارے عیب پر ۔۔۔ ہم بھی تو تم سے کبھی تھے آشنا

سنتا نہیں ہے ہائے کسی کی دعائے لب ۔۔۔ تجھ کو تیرا غرور یہ حالوں کرے گا کب

سچ کہے جو کوئی تو مارا جائے ۔۔۔ راستی ہے گی دار کی صورت

شاہ ظہور الدین حاتم

ظہور الدین نام، اور حاتم تخلص ہے۔ ۱۱۱۱ھ مطابق [illegible]ء میں پیدا ہوئے، عمدۃ الملک نواب امیر خاں کی سرکار میں ملازم تھے، سپاہی زادہ اور سپاہی پیشہ تھے لیکن دلی میں قدم شریف کے قریب میر بادل علی شاہ کے تکیے میں اٹھنے بیٹھنے سے طبیعت میں فقیری اور آزادہ روشی پیدا ہو گئی تھی، شعر و شاعری کا ذوق ابتدا سے تھا، پہلے رمز تخلص کرتے تھے، پھر حاتم ہو گئے، کلیات ان کا بہت بڑا ہے، جو غزلیات، قصائد، رباعیات، مثنوی وغیرہ پر مشتمل ہے، لیکن آپ نے خود اس کلیات کا انتخاب کیا، اور اس کا نام "دیوان زادہ" رکھا، یہ بھی کافی ضخیم کتاب ہے، "دیوان زادہ" پر خود آپ نے دیباچہ لکھا ہے، اس سے آپ کے متعلق کافی واقفیت بہم پہنچتی ہے، دیباچہ کی عبارت فارسی ہے، یہاں اس کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے

میں نے ۱۱۲۹ھ سے ۱۱۶۹ھ تک یعنی چالیس سال تک سر زمین شاعری

کی سیاحت کی ہے، فارسی میں پیرِ صائب ہوں، اور اردو میں ولی کو استاد سمجھتا
ہوں، دیوان قدیم نادر شاہی حملے سے قبل ہند میں مشہور تھا لیکن ۳ سنہ جلوس
عالمگیر ثانی میں اس دیوان کا خلاصہ کیا، اور دیوان زادہ اس کا نام رکھا،

میرے معاصر شاہ مبارک آبرو، شرف الدین مضمون، مرزا مظہر جان جاناں
شیخ احسن اللہ احسن، میر شاکر ناجی، غلام مصطفےٰ یکرنگ ہیں

میں نے لفظ ور، برا، اور اسی قسم کے دیگر الفاظ وغیرہ ترک کردیئے ہیں، اور
روزمرہ دہلی کو روا رکھا مخصوص ہندی اور بھاکا الفاظ کو بھی متروک قرار دیا لیکن
روزمرہ اور عام فہم اور پسندیدہ الفاظ کو برقرار رکھا تبھی بجائے تسبیح اور صحیح بجائے
سیحح، بیگانہ بجائے بیگانہ، اور دوانہ بجائے دیوانہ وغیرہ الفاظ کا استعمال
ناجائز ٹھہرایا، اسی طرح ساکن کو متحرک اور متحرک کو ساکن باندھنا ترک کیا وغیرہ وغیرہ

اسی دیباچہ کے آخر میں اپنے شاگردوں کی فہرست بھی درج کی ہے جس
کی تعداد ۴۵ ہے، ان ہی شاگردوں میں مرزا محمد رفیع سودا کا نام بھی ہے

حاتم ۱۷۹۱ء میں بمقام دہلی راہی ملک بقا ہوئے۔

حاتم کا مرتبہ بحیثیت استاد کے مسلم ہے، اور آپ کی خدمات زبان
وسیع، سودا جیسے شاعر آپ کے دامن فیض میں تربیت پا کر اپنے وقت کے
مسلم الثبوت استاد ہوگئے، حاتم نے اپنے کلام میں فصاحت اور زبان کی
صفائی کو بہت اہمیت دی، لیکن افسوس یہ کہ ان کی اصلاحات پر ان کے
عزیز ترین شاگرد یعنی سودا نے بھی عمل نہ کیا، میر اور سودا کے یہاں کثرت سے
وہی الفاظ پائے جاتے ہیں جن کو حاتم نے ترک کردیا تھا، البتہ ان اصلاحا

سے آگے چل کر ناسخ نے فائدہ اٹھایا، اور زبان اردو کو اکثر ناہمواریوں سے پاک کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

حاتم کے کلام میں ریہام بہت کم پایا جاتا ہے لیکن اس سے یہ مطلب نہیں کہ آپ نے اس تکلف کے خلاف علم جہاد بلند کیا ہو، اس جہاد کا فخر مرزا مظہر کو حاصل ہے تاہم حاتم کے کلام کا اصلی جوہر سادگی، بے تکلفی، اور بے ساختہ پن ہے، جو کچھ دل پر گذرتا ہے بے تکلف کہہ دیتے ہیں، نمونہ کلام ملاحظہ ہو:۔

یار کا مجھ کو اس سبب ڈر ہے
شوخ ظالم ہے اور ستمگر ہے

دیکھ سرو چمن ترے قد کوں
خجل ہے پا بگل ہے بے پر ہے

حق میں عاشق کے تجھ لباں کا سخن
قند ہے، نیشکر ہے، شکر ہے

کیوں نہ سب سے تجھے چھپا رکھوں
جان ہے، جی ہے، دل ہے، جگر ہے

مار نیکو رقیب سکے حاتم
شیر ہے، ببر ہے، دھنتر ہے

آب حیات جا کے کسو نے پیا تو کیا
مانند خضر جگ میں اکیلا جیا تو کیا

ناسور کی صفت ہے نہ ہوگا کبھی وہ بند
جراح زخم عشق کا آ کر سیا تو کیا

ہجر کی زندگی سے موت بھلی
کہ جہاں سب کہیں وصال ہوا

جب سے تیری نظر پڑی ہے جھلک
تب سے لگتی نہیں پلک سے پلک

پیری میں حاتم اب نہ جوانی کو یاد کر
سوکھے درخت بھی کہیں ہوتے ہیں پھر ہرے

اشرف علی خاں فغاں

اشرف علی خاں المتخلص بہ فغاں احمد شاہ بادشاہ کے کوکا اور علی قلی خاں ندیم کے

شاگرد تھے میر تقی میر نے امیر قزلباش خاں امید کا شاگرد لکھا ہے۔ ممکن ہے کہ پہلے امید کے شاگرد ہوں، اور پھر ندیم سے فیض اٹھایا ہو، چنانچہ فرماتے ہیں

دشت جنوں میں کیوں نہ پھریں ہم برہنہ پا — اب تو فغاں ندیم ہمارا رہنما ہوا

"اب تو" کے ٹکڑے سے قیاس ہوتا ہے، کہ پہلے ان کا "رہنما" کوئی اور تھا، غالباً وہ "رہنما" امید تھے

فغاں بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی میں یگانۂ روزگار تھے، چنانچہ احمد شاہ نے انکی طبیعت کی مناسبت سے ظریف الملک کا خطاب عطا کیا تھا،

احمد شاہ درانی کے حملوں سے دہلی میں ابتری پھیل رہی تھی، فغاں اس غیر مستقل حالت سے گھبرا کر اپنے چچا ایرج خاں کے پاس مرشدآباد پہنچے، چندے وہاں قیام رہا، پھر مرشدآباد کا قصد کیا، نواب شجاع الدولہ نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا، اور اعزاز و اکرام سے سرفراز کیا، پریشان حالی نے تو ساتھ چھوڑ دیا، مگر نازک مزاجی یہاں بھی جان و دل کے ساتھ تھی، ایک روز نواب صاحب نے جوش اختلاط میں بقول مصحفی گرم پیسے سے ان کا ہاتھ جلا دیا، یہ آگ بگولا ہو گئے، اور طیش میں آ کر عظیم آباد چلے گئے، وہاں راجہ شتاب رائے نے انکی قدر و منزلت کی، آپ وہیں مقیم ہوئے، اور آخر وقت تک وہیں رہے، اور وہیں ۱۱۸۶ھ میں پیوند خاک ہو گئے۔

مولانا محمد حسین آزاد آب حیات میں فرماتے ہیں کہ آخر وقت میں فغاں سے اور راجہ صاحب سے بھی شکر رنجی ہو گئی، اور انہوں نے حکام فرنگ تک رسائی پیدا کر کے باقی عمر فارغ البالی اور خوشحالی میں گذاری۔

فغاں کی زبان وہی ہے جو اس عہد کے دیگر شعرا کی ہے، مگر کلام میں سلاست زیادہ ہے، ایہام بھی بہت کم، بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے، باتیں سیدھی سادی ہیں لیکن بے ساختہ پن سے تاثیر بھی پیدا ہو گئی ہے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:-

خط دیکھیو چھپا کے ملے وہ اگر کہیں / لکھا ہے نام تو اسے نامہ بر کہیں
باد صبا تو عقدہ کشا اس کی موج ہو / شاید گرفتہ دل اگر آوے نظر کہیں
اتنا وفور خوش نہیں آتا ہے اشک کا / عالم کو مت ڈبو یو اے چشم تر کہیں
میری طرف سے ناظر سیاہ رخ ہے / جا آئے گا کالے بال پر کہیں
تیری گلی میں خاک بھی چھانی پر دل گیا / ایسا ہی گم ہوا کہ نہ آیا نظر کہیں
رو یا چلا ننگ تھا میری جان دیکھ / مطلق نہیں ہے چشم میں ٹھکانا اثر کہیں
یاد اگر تجھے نہیں آتا تو دیکھ لے / آنسو کہیں ڈھلکتے لخت جگر کہیں

پیارا فغاں کے حق میں یہاں تک نہیں رہا
ظالم بتا تجھے خدا سے بھی ڈر نہیں

تبصرہ

زبان: جو ... الفاظ جو بحری کے کلام میں کثرت سے ملتے ہیں، وہ شمالی ہند کے اس ابتدائی عہد میں بھی ملتے ہیں اور یہ قدرتی بات ہے کیونکہ دکن میں اردو نے زیادہ تر ہندی، دکنی، مرہٹی وغیرہ زبانوں سے سہارا لیا اور ان کے الفاظ قبول کیے، شمالی ہند میں فارسی کے دامن میں پلی، اس عہد کی تمہید میں جو فارسی شعرا کے اردو اشعار درج ہوئے ہیں ان

صاف ظاہر ہے، کہ اردو پر فارسی رنگ کس قدر غالب تھا، اس دور کے جتنے
شاعر استاد ہوئے، وہ سب یا تو خود فارسی دان تھے یا فارسی دان استادوں
کے شاگرد، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا، کہ ان کے کلام پر فارسی رنگ چھایا ہوا معلوم
ہوتا ہے۔

حاتم نے زبان کو پاک و صاف کرنے کی کوشش کی لیکن انہوں نے
جو طریقہ اختیار کیا، وہ کچھ زیادہ مفید ثابت نہیں ہوا، یعنی انہوں نے اپنے
کلیات کے انتخاب میں ایسے اشعار نکال دیئے جن میں ثقیل خلاف روزمرہ
اور ٹھیٹ ہندی الفاظ تھے، یا قافیہ کا کوئی سقم تھا، یا کوئی فارسی لفظ غلط نظم
ہوا تھا انہوں نے ان متروکات پر کسی سے عمل نہیں کرایا، اور یہی وجہ ہے
کہ ان کے فخر استاد شاگرد کے کلام میں بھی ان کے متروکات کافی تعداد
میں ملتے ہیں۔

اصناف سخن یوں تو اس دور میں قصیدہ بھی لکھا گیا، اور مثنوی بھی، مگر
اصلی کارنامہ اس دور کا غزل ہے۔

شاعری سطور گذشتہ میں بیان ہوا، کہ زبان اور طرز بیان پر فارسیت
غالب ہے لیکن عجب اتفاق ہے، کہ ہندی دوہوں کی ایک
خصوصیت نے اس دور کی غزلوں پر اپنا سکہ جمایا، یعنی ایہام و ذو معنیین الفاظ
کا استعمال خوب ہوا، اگر اعتدال سے اس صنعت کو برتا جائے، تو حسن ہے
لیکن اس دور میں شاعری کی بنیاد زیادہ تر اسی پر رکھی گئی اور اس صنعت
کی خاطر تکلف اور آورد سے کام لیا گیا، اگر اس دور کو ایہامی دور کہا جائے

تو پائے جاتے ہوگا، اس میں تکلف سے قطع نظر خیالات میں سادگی ہے، صاف و سادہ باتیں ہیں، اور بعض جگہ نری باتیں ہی باتیں ہیں، ولی کے خاص رنگ یعنی بھاشا شاعری کے جذبات نے اس دور میں فروغ نہیں پایا، شعراء نے ولی کی تقلید نہیں کی، بلکہ فارسی کی تقلید کر کے دیسی چیز کو پردیسی بنا دیا۔

نتیجہ

دکن کے ابتدائی دور سے شمالی ہند کے ابتدائی دور کا پلہ ہر حیثیت سے ہلکا ہے، کیا بلحاظ اصناف سخن، کیا بلحاظ نفس شاعری ہر لحاظ سے دکنی دور کو فوقیت حاصل ہے، البتہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں، کہ زبان کے لسانی ترقی کی، حاتم کی کوششیں گو اس دور میں بارآور نہ ہوئیں تاہم ایک راہ نکل گئی اگلی نسل کے لوگ اسی راہ پر چل کر مصلح زبان کہلائیں گے۔

آخر میں اس امر کا اعتراف ضروری ہے، کہ اس دور کے شعراء کے کلام میں پرتاثیر اور موثر اشعار جا بجا ملتے ہیں، اور اس قسم کے اشعار دکنی دور کے بہترین اشعار کے مقابلے ہی پر نہیں، بلکہ ہر آئندہ دور کے عمدہ اشعار کے مقابلہ پر پیش کئے جا سکتے ہیں، اگرچہ بلند خیالی نہیں ہے، تاہم فطری انداز بیان کی بدولت ان اشعار میں بے پناہ تاثیر پیدا ہو گئی ہے،

باب ۴

اُردو شعر و شاعری کا دوسرا دور عہدِ زریں

حضرت مرزا مظہر جانجاناںؒ زبدۃ العارفین، قدوۃ الواصلین حضرت مرزا مظہر جانجاناں ۱۶۹۹ء میں بمقام کالا باغ ریاست مالوہ بکتم عدم سے عالم وجود میں آشریف لائے آپ کے والد مرزا جان اورنگ زیب کے دربار میں منصب دار تھے شہنشاہ ان دنوں دکن میں فوج کی کمان کر رہا تھا، مرزا جان اس کے ہمراہ تھے، جب مرزا مظہر کی ولادت کا حال معلوم ہوا تو اورنگ زیب نے فرمایا "پسر جان پدر می باشد اس لئے ہم نے اس کا نام جان جاں رکھا کثرت استعمال سے جان جاناں ہو گیا۔

حضرت مظہر کا سلسلۂ نسب باپ کی طرف سے محمد بن حنیفہؓ سے ملتا ہے، ماں بیجاپور کے شریف گھرانے سے تھیں، دادا بھی شاہی دربار میں منصب دار تھے، دادی اسد خان وزیر کی خالہ زاد بہن تھیں، پردادا سے اکبر شاہ کی بیٹی منسوب ہوئی تھیں، ان رشتوں کے لحاظ سے تیموری خاندان کے نواسے تھے۔

مرزا مظہر کے رشتہ حیات میں ابھی کل اٹھارہ ہی گرہیں لگی تھیں کہ باپ نے وفات پائی اور آپ سایہ پدری سے محروم ہو گئے، ان کا منصب حاصل کرنے کا خیال پیدا ہوا لیکن بخت کی سعادت مندی نے دنیا سے جی اچاٹ کر دیا، مدرسوں اور خانقاہوں کی جاروب کشی شروع کی، شیخ محمد افضل

سیالکوٹی سے جو اس زمانہ میں شیخ المحدثین تھے، باقاعدہ حدیث پڑھی اور تیس
برس تک مشائخ نقشبندی سے کسب کمال کیا، اور صاحب حال و قال
بزرگ ہو گئے۔

آپ کی طبیعت میں سنجیدگی اور متانت بدرجہ اتم پائی جاتی تھی خوش
تقریر اس بلا کے تھے، کہ بات کرتے تو منہ سے پھول جھڑتے تھے۔ مزاج میں
لطافت اور طبع میں سلامتی تھی، میر تقی ان سے ملے تھے "نکات الشعراء" میں
لکھا ہے کہ "از ہند و نجدت او رفتہ سعادت اندوز گشتہ است ... خوش تقریر بمرتبہ
است کہ در تحریر نمی گنجد" انشاء اللہ خاں انشا نے بھی "دریائے لطافت"
میں آپ کی فصاحت و بلاغت کا ذکر کیا ہے۔ استغنا اور قناعت طبیعت
میں اس درجہ تھی، کہ عمر بھر کسی بادشاہ یا وزیر کے سامنے سر نیاز خم نہیں کیا۔
بادشاہوں اور امیروں نے اکثر پیش کش اور نذر و نیاز کے لئے دست دراز
وبعض بڑھایا، مگر انکے استغنا کا ہاتھ ہمیشہ زیر دامن ہی رہا، نہایت سادہ زندگی
بسر کرتے تھے، زندگی بھر کہیں مکان نہیں بنایا، کسی دوست کے گھر یا کرایہ
کے مکان میں عمر بسر کر دی، ایک جوڑے سے زیادہ کپڑا نہ رکھتے تھے، جب
بھوک لگتی، بازار سے منگواتے اور کھاتے، عام دعوتوں کو قبول نہ فرماتے تھے
نہ عرس کرتے تھے نہ تحفہ، روپے پیسے کی ضرورت ہوتی، تو کیونکر۔

ساتویں محرم کی تھی، کہ رات کے وقت ایک شخص آیا، دروازہ بند تھا
اس نے آواز دی، باہر نکلے، تو ایک قرابین ماری، وہ تو بھاگ گیا، مگر حضرت
کو زخم کاری لگ چکا تھا، تین دن زندہ رہے، دس محرم ۱۱۹۵ھ مطابق

سنہ ۱۱۹۵ھ کو اس جہانِ فانی سے کوچ کیا اور شہدائے کربلا کی خدمت میں جا حاضر ہوئے، سودا نے جب شہادت کی خبر سنی تو تاریخ کہی،

مرزا کا ہوا جو قتل ایک مرتد شوم / اور ان کی ہوئی خبرِ شہادت کی عموم

تاریخ از روئے درد یہ سن کے کہی / سودا نے کربلائے جانجاناں مظلوم

۱۱۹۵ھ

آپ کا ایک مختصر فارسی دیوان موجود ہے۔ اردو دیوان بھی مرتب کیا تھا مگر نایاب ہے۔ اردو شعر و ادب کے ارتقا میں آپ کا مرتبہ بہت بلند ہے تمام تذکرہ نویس مثلاً قدرت اللہ صدیقی، مصحفی وغیرہم متفق اللسان ہیں کہ مظہر نے اردو شاعری کے دامن کو ایہام کے بدنما داغ سے پاک کیا، سید انشا، آپ کے فصاحت و بلاغت کی شہادت دیتے ہیں۔ آپ کا کلام درد اور کیف کی جیتی جاگتی تصویر ہے زبان نہایت شستہ اور روزمرہ دہلی کا اعلیٰ نمونہ ہے، تصوف کی چاشنی نے جذبات کو بلند اور موثر کیا ہے

مرزا مظہر کا فیض شاعری بھی کچھ کم نہیں، بہت سے خوش مذاق موزوں طبع آپ کے دامنِ تربیت میں پرورش پا کر صاحبِ دیوان اور استاد ہوئے ان میں سے انعام اللہ خاں یقین، میر محمد باقر حزیں، خواجہ احسن اللہ خاں بیان، مصطفیٰ خاں یکرنگ، دولادل کے شاعر بلہاد، ولا [illegible] بیت قلی خاں حسرت، محمد فقیہ دردمند کے نام دنیائے شاعری میں مہر و ماہ کی طرح چمکتے ہیں ۔

اب مرزا صاحب کے کلام سے لطف اٹھائیے۔

چلی اب گل کے ہاتھوں سے لٹا کر کارواں اپنا
نہ چھوڑا ہائے بلبل نے چمن میں کچھ نشاں اپنا

یہ حسرت رہ گئی کس کس مزے سے زندگی کرتے
اگر ہوتا چمن اپنا گل اپنا باغباں اپنا

الم سے یاں تلک روئیں کہ آخر ہو گئیں رسوا
ڈبایا آہ آنکھوں نے مژہ کا خاندان اپنا

رقیباں کی نہ کچھ تقصیر ثابت ہے نہ خوباں کی
مجھے ناحق ستاتا ہے یہ عشق بدگماں اپنا

مرا جی جلتا ہے اس بلبل بیکس کی غربت پر
کہ جن نے آسرے پر گل کے چھوڑا آشیاں اپنا

جو تو نے کی سو دشمن بھی نہیں دشمن سے کرتا ہے
غلط تھا جانتے تھے تجھ کو جو ہم مہرباں اپنا

کوئی آزردہ کرتا ہے سجن اپنے کو ہے ظالم
کہ دولت خواہ اپنا مظہر اپنا جان جاں اپنا

بھیجے کی ہے تو چاہ دور میری جاتی ہے بہار
ہنسلی بس چلتا نہیں کیا مفت جاتی ہے بہار

والہ دل لے ہماری خاک سے اٹھتا ہے شور
کیا قیامت ہے مردوں کو بھی ستاتی ہے بہار

شاخ گل جلتی ہیں بیٹھو باغ میں
ہاتھ اپنے کے اشک سے جلتی ہے بہار

رنگ گل کی کھلی جاتی ہیں کلیاں سب
پھر نہیں خوابیدہ فتنوں کو جگاتی ہے بہار

ہم گرفتاروں کو اب کیا کام ہے گلشن سے لیک
جی نکلتا ہے جب سنتے ہیں آتی ہے بہار

مرزا محمد رفیع سودا مرزا محمد رفیع نام، سودا تخلص، مرزبان کابل سے تھے۔ ان کے والد محمد شفیع بغرض تجارت ہندوستان آگئے اور یہیں بود و باش اختیار کر لی۔ مرزا رفیع سنہ ۱۷۱۳ء میں بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ یہیں تربیت و پرورش پائی۔ رسم زمانہ کے بموجب پہلے سلطان قلی خاں وداد کے شاگرد ہوئے۔ خان آرزو کے شاگرد نہ تھے لیکن ان کی صحبت سے بہت فیض پایا تھا۔ شاعری کی ابتدا فارسی سے کی مگر خان آرزو کے کہنے سے اردو

میں کہنا شروع کیا اور شاہ حاتم کو اپنا استاد بنایا طبیعت کی مناسبت اور مشق کی کثرت سے دلی جیسے شہر میں انکی استادی مسلم الثبوت ہوئی استاد کی زندگی ہی میں وہ شہرت حاصل ہوئی کہ خاص و عام میں انکے کلام کا چرچا ہونے لگا شہنشاہ شاہ عالم اپنا کلام اصلاح کے لئے ان کو دینے لگے ۔

مرزا بہت نازک مزاج اور غیور طبع واقع ہوئے تھے۔ کہتے ہیں شاہ عالم سے کسی بات پر ناراض ہو کر گھر بیٹھ رہے، ہر چند بادشاہ نے بلوایا مگر نہ گئے دلی کے اکثر امرا انکی قدردانی کرتے تھے اور اس قدردانی کی بدولت فارغ البالی سے بسر ہوتی تھی۔

مرزا کا شہرہ جب لکھنؤ پہنچا تو نواب شجاع الدولہ نے سفر خرچ بھیج کر بکمال اشتیاق لکھنؤ بلایا مرزا سے دلی نہ چھوڑی گئی جواب میں یہ رباعی بھیج کر معذرت چاہی :—

سودا پئے دنیا تو بہر سو کب تک ... آوارہ ازیں کوچہ بآں کو کب تک
حاصل یہی اس سے نہ کہ دنیا ہووے ... بالفرض ہوا یوں بھی تو پھر تو کب تک

دلی کی سیاسی حالت بگڑتی، امرا بدحال سے بےحال ہوتے جاتے تھے، آخر جب شاہ عالم کا کھیل بگڑا، امرا کے زور و دست ختم ہو گئے، اور بسر اوقات کا کوئی ذریعہ نہ رہا تو بادل ناخواستہ وطن کو خیرآباد کہا، کچھ دنوں تک فرخ آباد میں قیام کیا اس کے بعد فیض آباد پہنچے۔ اس وقت ان کا سن ساٹھ برس کا ہوچکا تھا نواب شجاع الدولہ سر حکومت تھے وہ بہت عزت سے پیش آئے اور انکی تنخواہ مقرر کر دی، نواب شجاع الدولہ کے بعد نواب

آصف الدولہ مسند نشین ہوئے، تو انہوں نے لکھنؤ کو پایہ تخت بنایا، مرزا بھی ان کے ہمراہ لکھنؤ پہنچے۔ اور جب تک جیتے رہے شاہی قدر دانی کی بدولت فارغ البال رہے، آخر دم میں ۱۷۸۱ء میں داعی اجل کو لبیک کہا، انکے استاد شاہ حاتم زندہ تھے، سن کر بہت روئے، اور کہا کہ ہمارا پہلوان سخن مرگیا، مصحفی نے تاریخ کہی ع

سودا کجا و آں سخن دلفریب او

سودا اردو کے مسلم الثبوت اُستاد ہیں۔ جملہ اصناف سخن پر قدرت کاملہ رکھتے تھے۔ اُن [illegible] بیات ہر جگہ ملتا ہے۔ اُس میں غزلوں کے علاوہ قصائد۔ رباعیات۔ قطعات۔ مخمس۔ ترجیع بند، مستزاد۔ مثنویات۔ سلام مرثی وغیرہ شامل ہیں۔

سودا کو زبان پر حاکمانہ قدرت حاصل ہے۔ مضمون کو جس طرح چاہتے ہیں باندھتے ہیں۔ اور پھر الفاظ ایسے انتخاب کرتے ہیں کہ مضمون میں جدّت کے ساتھ اثر پیدا ہو جاتا ہے۔ تشبیہ و استعارہ سے بھی کام لیا ہے۔ لیکن خوش مذاقی کے ساتھ۔ عاشقانہ مضامین میں سادگی جذبات اور صفائی بیان سے تاثیر کے نشتر بھرے ہیں کلام میں متانت ہے، سوز و گداز بھی ہے لیکن اس میدان میں میرؔ سے پیچھے ہیں۔

مرزا قصیدے کے بادشاہ ہیں، یوں تو ان سے قبل بھی قصیدے لکھے گئے لیکن حقیقت یہ ہے، کہ انہوں نے اردو قصیدے کو فارسی قصیدے کا ہم پلہ بنا دیا۔ مشکل سے مشکل زمین کو اپنی فصاحت و بلاغت، چست

الفاظ اور بندش کی چستی سے دلآویز اور شگفتہ بنا دیتے ہیں، اور متانت بیان
پختگی کلام، زور الفاظ، علو تخیل، اور ندرت و جدت سے زمین قصیدہ کو آسمان
پہنچا دیتے ہیں۔

سودا کے کلیات میں متعدد ہجویں بھی شامل ہیں جو مرزا کی نازک مزاجی
اور تیزی طبع پر دلالت کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ مشاقی اور قادر الکلامی بھی ان سے
ٹپکتی ہے، واقعات کو اس بے تکلفی اور سادگی سے نظم کرتے ہیں، کہ دوسرا
شخص شاید نثر میں بھی اس سے بہتر ادا نہ کر سکے، جہاں پاکیزہ تمسخر اور شائستہ
مذاق ہے وہاں انکی ہجویں بہت پر لطف ہیں لیکن جہاں کہیں انہوں نے
طیش میں آکر اور آنکھیں بند کر کے لکھا ہے، وہاں کا نقشہ کچھ اور ہے عامیانہ
پن بھی ہے اور ابتذال بھی۔

مرزا نے زبان اردو کو پاک و صاف کر کے اسے ترقی دینے کی بھی
کوشش کی ہے، چنانچہ انہوں نے اردو میں فارسی محاوروں کو اس طرح کھپایا
ہے کہ وہ آج تک ہماری زبانوں پر چڑھے ہوئے ہیں۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو

مقدور نہیں اس کی تجلی کے بیاں کا ——— جوں شمع سراپا ہو اگر صرف زباں کا
پردے کو تعین کے در دل سے اٹھا دے ——— کھلتا ہے ابھی پل میں طلسمات جہاں کا
اس گلشن ہستی میں عجب دید ہے لیکن ——— جب آنکھ کھلی گل کی تو موسم تھا خزاں کا
دکھلائیے لے جا کے تجھے مصر کا بازار ——— لیکن نہیں خواہاں کوئی واں جنس گراں کا
سودا جو کبھو گوش سے ہمت کے سنے تو ——— مضمون یہی ہے جرس دل کی فغاں کا
ہستی سے عدم تک نفس چند کی ہے راہ ——— دنیا سے گزرنا سفر ایسا ہے کہاں کا

گل پھینکے ہے غیروں کی طرف بلکہ ثمر بھی	اے خانہ بر انداز چمن کچھ تو ادھر بھی
دل اس نے لیا مجھکو ملی دولت دیدار	کیا ہوش کا سامان دہر بھی ہے دہر بھی
کیا ضد ہے مرے ساتھ خدا جانے وگرنہ	کافی ہے تسلی کو مری ایک نظر بھی

سودا تری فریاد سے آنکھوں میں کٹی رات
آئی ہے سحر ہونے کو ظالم کہیں مر بھی

جس روز کسی اور پہ بیداد کروگے	یہ یاد رہے ہم کو بہت یاد کروگے
گلہ لکھوں میں اگر تیری بیوفائی کا	لہو میں غرق سفینہ ہو آشنائی کا
زباں ہے شکر سے قاصر شکستہ بالی کے	کہ جن نے دل سے مٹایا خلش رہائی کا
دماغ عجب گیا آخر ترا اے نمرود	چلا نہ پشہ سے کچھ بس تری خدائی کا
مرے سجود کی دیر و حرم سے گذری قدر	رکھوں ہوں دعوی ترے در پہ جبہ سائی کا
کبھو نہ پہنچ سکے دل سے تا زباں یکحرف	اگر بیان کروں طالع نارسائی کا
دکھاؤنگا تجھے زاہد اس آفت جاں کو	خلل دماغ میں تیرے ہے پارسائی کا

طلب نہ کچھ بھی کسی سے کر یاں خدا کے سوا
پھرے ہے آپ وہ کاسہ لئے گدائی کا

قاتل کے دل سے آہ نہ نکلی ہوس تمام	ذرہ بھی ہم نے تڑپنے دیا نہ کہ بس تمام
صیاد تجھ سے ہوں میں اے اثر نالہ منفعل	آتش وہی نہ اسکے دام کو ٹوٹے قفس تمام
تک آگے سے چلتے رہے نالے تیرے دل	جب قافلے چلے تو ہوا بانگ جرس تمام
آتش کو رنگ گل کی صبا تو نہ پھونک یہ	جلوا کے آشیاں کو مرے خار و خس تمام
سودا بھلی ہے شانہ کو زلفوں میں اسکی راہ	اس دست نارسا کو ہے کیا دسترس تمام

باتیں بکہ مگر کیں وہ تری بھولی بھولیاں
دل لے کے لگتا ہے جواب تیغ یہ بولیاں

ہر بات ہے لطیفہ و ہر یک سخن ہے رمز
ہر آن ہے کنایہ و ہر دم ٹھٹھولیاں

حیرت نے اس کو بند نہ کرنے دی پھر جو
آنکھیں تب آرسی نے ترے منہ پہ کھولیاں

اندام گل پہ ہو نہ قبا اس طرح سے چاک
جوں غنچہ جنہوں کے تن پہ مسکتی ہیں چولیاں

کن نے کیا خرام چمن میں کہ اے صبا
لاتے ہیں بوئے نالے سے بھر بھر کے جھولیاں

ساقی پہنچ کہ تجھ بن اس ابر بہار سے
ہوتے نہیں ہیں رنگ کہ ہم تو ہیں گولیاں

کس طرح ہووے آنکھوں کی روشنی دیکھیں
مژگاں نہ کر سکیں تو نگاہیں پہ جھولیاں

کیا چاہیے تجھے یہ سر انگشت پہ حنا
حس بے گنہ کے خوں میں جا ہیں ڈبولیاں

سوز کے دل سے صاف نہ تھی آج زلف یار
شانے نے بیچ پڑ کے گرہ اس کی کھولیاں

میر محمد تقی میر

میر محمد تقی نام، میر تخلص تھا۔ ان کے والد میر محمد علی شرفائے اکبرآباد سے تھے۔ میر بمقام آگرہ ۱۱۳۷ھ میں پیدا ہوئے۔ دس سال کی عمر تھی کہ سایہ پدری سر سے اٹھ گیا۔ آپ دہلی چلے آئے یہاں انکی بہن میر محمد حسین کلیم سے بیاہی تھیں۔ وہ اپنے بھائی کو بہت چاہتی تھیں۔ اسی کے لحاظ سے کلیم کو بھی میر سے محبت تھی۔ ان کے علاوہ خان آرزو بھی رشتہ میں میر کے ماموں ہوتے تھے۔ میر نے نکات الشعراء میں ان کا ذکر بہت محبت اور ادب سے کیا ہے۔

خواجہ محمد ناصر عندلیب کے یہاں ہر مہینہ کی پندرھویں کو مشاعرہ ہوا کرتا تھا۔ میر بھی اس میں شریک ہوا کرتے تھے۔ اور خواجہ میر درد سے بہت

خلوص تھا لیکن انقلابات زمانہ سے مشاعرہ کا یہ سلسلہ خواجہ میر درد کے یہاں درہم برہم ہوگیا، اور پھر مشاعرہ ان کے ایما سے میر تقی کے یہاں ہونے لگا، خواجہ صاحب بھی اس میں شرکت فرمایا کرتے تھے،

سلطنت کی تباہی میں میر بھی پریشان حال تھے لیکن ثابت قدمی سے جمے بیٹھے تھے، آخر وہ زمانہ بھی آگیا کہ ناچار وطن کو خیرباد کہنا پڑا، لکھنؤ میں نواب آصف الدولہ کا دور دورہ تھا، میر صاحب نے لکھنؤ پہنچ کر ایک قصیدہ حالیہ لکھا، نواب صاحب نے از راہ قدردانی تین سو روپیہ ماہوار مقرر کر دیا جو مرتے دم تک ان کو ملتا رہا۔

آب حیات میں لکھا ہے، کہ جب میر صاحب لکھنؤ پہنچے، تو ایک سرائے میں قیام کیا، اس دن کہیں مشاعرہ تھا، اسی وقت غزل لکھی، اور مشاعرہ میں جا کر شامل ہوئے، ان کی قدیمانہ وضع دیکھ کر لوگ ہنسنے لگے میر بیچارے دل تنگ ہوئے اور ایک طرف بیٹھ گئے، جب شمع ان کے سامنے آئی، تو بعض صاحب نے پوچھا حضور کا وطن کہاں ہے؟ میر صاحب نے یہ قطعہ فی البدیہہ کہہ کر غزل طرحی میں داخل کیا۔

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو ۔۔۔ ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب ۔۔۔ رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا ۔۔۔ ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

سب کو حال معلوم ہوا بہت معذرت کی اور میر صاحب سے عفو تقصیر چاہی، میر صاحب سنہ ۱۲۲۵ھ میں فوت ہوئے ناسخ نے تاریخ کہی ع

وا ویلا مرد شہ شاعراں

مولانا محمد حسین آزاد نے آب حیات میں میر صاحب کی بدمزاجی اور نازک مزاجی کو بہت بڑھا چڑھا کر بیان کیا ہے، لیکن اس کی حقیقت سنے سنائے افسانوں سے زیادہ نہیں، ہاں یہ ضرور ہے کہ آپ کے مزاج میں استغنا اور قناعت تھی طبیعت کو درویشی کی لگن اور تصوف کی چاشنی جلا دی تھی اور یہ انکی ابتدائی تعلیم کا نتیجہ تھا ان کے والد نے انہیں جو روحانی تعلیم دی تھیں، وہ ذکر میر میں درج ہیں ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کو دنیاداری سے کچھ سروکار نہ تھا آپ کے مزاج میں انصاف بھی کوٹ کوٹ کر بھرا تھا، آپ عمدہ اشعار کی دل کھول کر داد دیتے تھے، اور صاحب کمال کے اصلی جوہر کو پرکھتے تھے، نہایت مہذب، زندہ دل، یار باش، وضعدار آدمی تھے، میانہ قد، لاغر اندام، گندمی رنگ، ہر کام متانت اور آہستگی کے ساتھ کرتے تھے، بات کم کرتے تھے، وہ بھی آہستہ آواز میں، نرمی اور ملائمت کے ساتھ، عادات و اطوار نہایت سنجیدہ و متین ہر وقت محویت کا عالم طاری، اپنے خیالات میں ڈوبے رہتے تھے

میر صاحب کی تصانیف میں چھ دیوان ہیں، ان میں جملہ اصناف سخن مثلاً قصیدے، مثنویات، مراثی وغیرہ شامل ہیں، واسوخت آپ نے ایجاد کیا چنانچہ دو واسوخت بھی آپ کے کلام میں شامل ہیں علاوہ ازیں ایک تذکرہ نکات الشعراء فارسی میں لکھا ہے۔

میر صاحب غزل کے بادشاہ ہیں، قصیدے کے مرد میدان نہیں۔

یہ سوداکا حصہ ہے، اردو میں میر صاحب کو واسوخت کا موجد تسلیم کیا گیا ہے۔
اردو میں جس قدر بڑے بڑے شعراء میر کے بعد ہوئے، ان سب نے میر کی
استادی کا اعتراف کیا ہے، ناسخ فرماتے ہیں

آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

غالب بھی ناسخ کے ہم زبان ہیں۔ ذوق نہ مانتے ہیں ؎

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب — ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

حقیقت ہے، کہ رنگ تغزل کو جس خوبی اور خوش اسلوبی سے میر نے
برتا اس کی مثال اردو باوجود اس ترقی کے اب تک پیش نہ کر سکی، سوز و گداز، تشنگی
ملاحت، صداقت جذبات، وغیرہ غزل کی خصوصیات ہیں، اور یہ خوبیاں کلام
میر میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں، عشق کی واردات کو اس حسن و صداقت سے
بیان کرتے ہیں، کہ تاثیر کی رو رگ و ریشہ میں دوڑ جاتی ہے، میر کے نشتر اور
بہتر نشتر مشہور ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے، کہ اگر الگ الگ اشخاص ان نشتروں
کو انتخاب کریں، تو بہت کم اشعار ایسے بچیں گے جو نشتر نہ ہوں ۔

مثنوی میں بھی میر کا مرتبہ خاصا بلند ہے، اگرچہ میر حسن نے اس صنف
کو معراج کمال پر پہنچایا، تاہم میر کی مثنویوں میں بھی سوز و گداز اور واردات
عشق کی گرمی کم نہیں، البتہ ان سے منظر نگاری نہ نبھ سکی، یہ چیز میر حسن کے حصہ
میں آئی، میر کی مثنویاں چھوٹی چھوٹی ہیں، اور ان میں ڈرامائی عنصر پایا جاتا ہے

نمونہ کلام ملاحظہ ہو:۔

تھا مستعار حسن سے اسکے جو نور تھا — خورشید میں بھی اس ہی کا ذرہ ظہور تھا

ہنگامہ گرم کن جو دل ناصبور تھا
پیدا ہر ایک نالے سے شور نشور تھا

پہنچا جو آپ کو تو میں پہنچا خدا کے تئیں
معلوم اب ہوا کہ بہت میں بھی دور تھا

آتش بلند دل کی نہ تھی ورنہ اے کلیم
اک شعلہ برق خرمن صد کوہ طور تھا

مجلس میں رات ایک ترے پرتوے بغیر
کیا شمع کیا پتنگ ہر اک بے حضور تھا

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آ گیا
یکسر وہ استخوان شکستوں سے چور تھا

کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر
میں بھی کبھو کسو کا سر پر غرور تھا

تھا وہ تو رشک حور بہشتی ہمیں میں میر
سمجھے نہ ہم تو فہم کا اپنے قصور تھا

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا

عہد جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا

حرف نہیں جاں بخشی میں اس کی خوبی اپنی قسمت کی
ہم سے جو پہلے کہہ بھیجا سو مرنے کا پیغام کیا

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں جو آپ کرے ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

سارے رند اوباش جہاں کے تیرے سجود میں رہتے ہیں
بانکے ٹیڑھے ترچھے تیکھے سب کا تجھ کو امام کیا

کس کا کعبہ کیسا قبلہ کون حرم ہے کیا احرام

کوچے کے اس کے باشندوں نے سب کو یہیں سے سلام کیا

یاں کے سپید و سیہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے
رات کو رو رو صبح کیا یا دن کو جوں توں شام کیا

میر کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو ان نے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

بارہا گور دل جھکا لایا — اب کی شرط وفا بجا لایا
قدر رکھتی نہ تھی متاع دل — سارے عالم میں میں دکھا لایا
دل کہ یک قطرہ خوں نہیں ہے بیش — ایک عالم کے سر بلا لایا
سب پہ جس بار نے گرانی کی — اس کو یہ ناتواں اٹھا لایا
دل مجھے اس گلی میں لیجا کر — اور بھی خاک میں ملا لایا
ابتدا ہی میں مر گئے سب یار — عشق کی کون انتہا لایا

اب تو جاتے ہیں میکدے سے میر
پھر ملیں گے اگر خدا لایا

پل میں جہاں کو دیکھتے میرے ڈبو چکا — اک وقت میں یہ دیدہ بھی طوفان رو چکا
افسوس میرے مردے پہ اتنا نہ کر کہ اب — پچھتاوا یوں ہی سا ہے جو ہونا تھا ہو چکا
لگتی نہیں پلک سے پلک انتظار میں — آنکھیں اگر یہی ہیں تو بے بید سو چکا
یک چشمک پیالہ ہے ساقی بہار عمر — ہچکی لگی کہ دور بہ آخر ہی ہو چکا
ممکن نہیں کہ گل کرے ویسی شگفتگی — اس سہو سے ہم اپنی محبت میں رو چکا
پایا نہ دل بہایا ہوا سیل اشک کا — ناسا بہ شور سے سر پہ رو چکا

ہر صبح حادثے سے یہ کہتا ہے آسماں
دے جام خوں میر کو گر منہ وہ دھو چکا

جیتے ہیں ہم کہ عشق میں آزار ہر طرح
ہوتے ہیں ہم ستم زدہ بیمار ہر طرح

ترکیب و طرح ناز و ادا سب سے دل لگے
اس طرحدار کے ہیں گرفتار ہر طرح

یوسف کی اس نظیر سے دلکو جمع رکھ
ایسی متاع جاتی ہے بازار ہر طرح

جس طرح میں دکھائی دیا اس کے ملک پر
ہم کشت دیدوں کے منگتے سزاوار ہر طرح

چپ لگ گئے ہم درد سے گلی کوچے میں تیرے میر
میں دیکھ رہوں ہوں یار کو اکسار ہر طرح

خواجہ میر درد علیہ الرحمۃ

اسید محمد میر نام، درد تخلص، خواجہ محمد ناصر عندلیب کے خلف الرشید تھے، گیارہ واسطوں سے ان کا نسب خواجہ بہاؤالدین نقشبند اور چھبیس واسطوں سے امام حسن عسکری علیہ السلام تک پہنچتا ہے، خواجہ میر ۱۱۳۳ھ میں بمقام دہلی پیدا ہوئے، اور والد کے آغوش تربیت میں پرورش پائی، والد کی طرف سے شاعری اور استغنا وراثت میں پایا بائیس سال کی عمر میں دنیا سے منہ موڑا، اور والد کے سجادہ پر بیٹھ گئے۔

دلی کا نقشہ بگڑا، امراء اور شرفا شہر چھوڑ چھوڑ کر دشت غربت میں گامزن ہوئے، اکثر شعراء نے فیض آباد اور لکھنؤ کا رخ کیا، مگر درد کے پائے استقلال کو جنبش نہ ہوئی، اللہ پر توکل تھا اور جو سجادہ بزرگوں نے بچھایا تھا اس پر قناعت کا بوریا بچھائے بیٹھے رہے۔

تصوف اور موسیقی میں بڑی مہارت تھی، شاعری کا شوق ابتدا سے تھا

ہر مہینہ کی دوسری اور چوبیسویں تاریخ کو اپنے یہاں محفلِ سماع منعقد کیا کرتے تھے،
ان محفلوں میں علماء و مشائخ کے علاوہ شاہ عالم بادشاہ بھی شامل ہوتے تھے، ہر مہینہ
کی پندرہویں تاریخ کو مشاعرہ بھی کیا کرتے تھے، میر تقی میر سے دوستانہ تعلقات تھے،
خواجہ صاحب نے ۱۱۹۹ھ میں رحلت فرمائی، دہلی میں ترکمان دروازہ سے
باہر آپ کا مرقد زیارت گاہ خاص و عام ہے —

خواجہ صاحب کی تصانیف تین ہیں، ایک اسرار الصلوٰۃ، یہ رسالہ پندرہ برس
کے سن میں مکمل ہوا، دوسری تصنیف "واردات درد" انتیس برس کی عمر میں تکمیل کو
پہنچی، تیسری تصنیف دیوان اردو ہے، یہ سب تصانیف چھپ چکی ہیں —

بحیثیت شاعر خواجہ صاحب کا مرتبہ بہت بلند ہے، آپ کا دیوان مختصر
ہے، مختصر غزلیات، رباعیات اور کچھ مخمس، ترجیع بند بھی ہیں، سات سات یا نو نو اشعار
سے زیادہ کوئی غزل نہیں لیکن جیسا کہ میر حسن فرماتے ہیں کہ "دیوانش اگرچہ
مختصر لیکن مثل کلام حافظ سراپا انتخاب" آزاد فرماتے ہیں کہ "خواجہ میر درد کی غزل
سات شعر یا نو شعر کی ہوتی ہے مگر انتخاب ہوتی ہے، خصوصاً چھوٹی چھوٹی بحروں
میں جو اکثر غزلیں کہتے ہیں گویا تلواروں کی آبداری نشتر میں بھر دیتے ہیں، خیالات
ان کے سنجیدہ اور متین تھے کسی کی ہجو سے زبان آلودہ نہیں ہوئی، تصوف جیسا
انہوں نے کہا، اردو میں آج تک کسی سے نہیں ہوا" خواجہ صاحب کے کلام کی
تنقید اس سے بہتر نہیں ہو سکتی، ہم البتہ یہ کہنے کی جرأت کرتے ہیں کہ جہاں
تک غزلیات کا تعلق ہے خواجہ صاحب کا کلام میر و سودا کے کلام سے کسی
طرح کم رتبہ نہیں، بلکہ تصوف اور اخلاق کی چاشنی کے اعتبار سے کلام میر و

[illegible] ملاحظہ ہو۔

مدرسہ یا دیر تھا یا کعبہ یا بت خانہ تھا
ہم سبھی مہماں تھے یاں اک تو ہی صاحب خانہ تھا

وائے نادانی کہ وقت مرگ یہ ثابت ہوا
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

حیف کہتے ہیں ہوا گلزار تاراج خزاں
آشنا اپنا بھی واں اک سبزۂ بیگانہ تھا

ہو گیا مہماں سرائے کثرت موہوم آہ
وہ دل خالی جو تیرا خاص خلوت خانہ تھا

بھول جا خوش رہ عبث وے سابقے مت یاد کر
درد یہ مذکور کیا ہے آشنا تھا یا نہ تھا

تجھی کو جو یاں جلوہ فرما نہ دیکھا
برابر ہے دنیا کو دیکھا نہ دیکھا

مرا غنچۂ دل ہے وہ دل گرفتہ
کہ جس کو کسو نے کبھو وا نہ دیکھا

یگانہ ہے تو آہ بیگانگی میں
کوئی دوسرا اور ایسا نہ دیکھا

اذیت مصیبت ملامت بلائیں
ترے عشق میں ہم نے کیا کیا نہ دیکھا

کیا مجھ کو داغوں نے سرو چراغاں
کبھو تو نے آ کر تماشا نہ دیکھا

تغافل نے تیرے یہ کچھ دن دکھائے
ادھر تو نے لیکن نہ دیکھا نہ دیکھا

حجاب رخ یار تھے آپ ہی ہم
کھلی آنکھ جب کوئی پردا نہ دیکھا

شب و روز اے درد در پے ہوں اس کے
کسو نے جسے یاں نہ سمجھا نہ دیکھا

مثل نگیں جو ہم سے ہوا کام رہ گیا
ہم رو سیاہ جاتے رہے نام رہ گیا

یا رب یہ دل ہے یا کوئی مہماں سرائے ہے
غم رہ گیا کبھو کبھو آرام رہ گیا

ساقی مرے بھی دل کی طرف ٹک نگاہ کر
لب تشنہ تیری بزم میں یہ جام رہ گیا

سو بار سوزِ عشق نے دی آگ پر ہنوز | دل وہ کباب ہے کہ جگر خام رہ گیا
ہم کب کے چل بسے تھے پر افسردۂ وصال | کچھ آج ہو لے تجھ سے سرانجام رہ گیا
مدت لگی وہ تب تک تو موقوف ہو گئے | اب گاہ گاہ بوسہ بہ پیغام رہ گیا

ازبسکہ ہم نے حرفِ دوئی کا اٹھا دیا
اے درد اپنے وقت میں ابہام رہ گیا

پیغام پاس بھیج نہ مجھ بیقرار تک | ہوں نیم جاں سو وہ بھی کہیں انتظار تک
دے وہ شراب ساقی کہ تا روزِ رستخیز | جس کے نشے کا کام نہ پہنچے خمار تک
صیاد اب رہائی سے کیا مجھ اسیر کو | پھر کس کو زندگی کی توقع بہار تک
بے قدر میکشی ہوئی عالم میں یاں تئیں | ہے شیشہ سرنشیں کے سنگِ مزار تک

راہِ عدم میں درد میں تنہا ہوں تیز رو
پہنچا صبا کا ہاتھ نہ میرے غبار تک

کچھ لائے نہ تھے کہ کھو گئے ہم | تھے آپ ہی ایک سو گئے ہم
جوں آئینہ حسن پہ یاں نظر کی | ساتھ اپنے دو چار ہو گئے ہم
ماتم کدۂ جہاں میں جوں ابر | اپنے تئیں آپ رو گئے ہم
ہستی نے تو ٹک جگا دیا تھا | پھر کھلتے ہی آنکھ سو گئے ہم

یاروں ہی سے درد ہے یہ چرچا
پھر کوئی نہیں ہے جو گئے ہم!

نہ زلفِ بتاں کا گرفتار میں ہوں | نہ بیمار چشموں کا بیمار میں ہوں
کدھر بہکی پھرتی ہے اے بے کسی تو | تیری جنس کا یاں خریدار میں ہوں

ادھر بات کرنا ادھر دیکھ لینا — سمجھتا ہوں سب ایک عیار ہیں ہوں
اگر مجھ سے ملیے کبھو عیب کیسا ہے — نہ بد وضع تو ہے نہ بدکار ہیں ہوں
کسو پر بلا تیری تیوری چڑھا دے — تیری تیغ ابرو کا افگار ہیں ہوں
سبھی اپنے جیسے سے اے درد خوش ہیں
اگر ہوں تو یہ ایک بیزار ہیں ہوں

میر غلام حسن حسن

میر غلام حسن نام حسن تخلص، میر غلام حسین ضاحک کے بیٹے تھے، بمقام دہلی سنہ ۱۱۳۶ھ میں پیدا ہوئے، بارہ برس کے سن میں والد کے ہمراہ فیض آباد گئے، کچھ دنوں بعد لکھنو پہنچے۔ اور وہیں رہے۔

حسن اپنے والد سے اصلاح لیتے تھے لیکن لکھنو پہنچ کر میر ضیاء الدین ضیاء کے شاگرد ہوئے، ان کا رنگ حسب موافق طبع نہ پڑا تو خواجہ درد، میر تقی میر اور سودا کا تتبع کیا —

سنہ ۱۲۰۱ھ میں اس جہان فانی سے رخصت ہوئے۔ مصحفی نے "شاعر شیریں زبان" سے تاریخ نکالی —

آپ کی تصانیف میں ایک دیوان، متعدد مثنویاں، اور ایک تذکرہ شعرائے اردو، زبان فارسی ہے —

غزل میں حسن کا مرتبہ بہت بلند ہے، درد کے تتبع سے کلام میں تصوف اور روحانیت کی چاشنی پیدا ہو گئی ہے، سوز و گداز بھی کم نہیں، صفائی اور محاورے کا لطف عام طور پر آپ کے کلام میں پایا جاتا ہے۔ دیوان میں قصا

بھی ہیں لیکن رتبہ میں غزلوں سے بہت کم ہیں۔
حسن نے کل گیارہ مثنویاں لکھیں جن میں "گلزار ارم" "رموز العارفین"
"سحر البیان" زیادہ مشہور ہیں، اور ان میں بھی سحر البیان کو جو شہرت اور مقبولیت
حاصل ہوئی، وہ آج تک کسی اور مثنوی کو نصیب نہیں ہوئی شہرت اور مقبولیت
کا یہ عالم ہے کہ وہ حسن کی باقی تمام کلام پر چھائی ہے، اور اب میر حسن مصنف
سحر البیان کی حیثیت سے مشہور ہیں غزل گو کی حیثیت سے ان کی شہرت نہیں
آپ کی غزلیات کا دیوان ۱۹۱۲ء میں نولکشور پریس لکھنؤ سے شائع ہو چکا ہے
اس میں کم و بیش تین ہزار اشعار ہیں، نمونہ کلام ملاحظہ ہو:-

نہ رکتی تھیں آہیں نہ تھمتے تھے آنسو	حسن تجھ کو کیا رات غم تھا کسی کا
میں حشر کو کیا روؤں کہ اٹھ جاتے ہی تیرے	برپا ہوئی اک دھیر قیامت تو یہیں اور
پھر چھیڑا حسن نے اپنا قصہ	بس آج کی شب بھی سو چکے ہم
وہ جب تک کہ زلفیں سنوارا کیے	کھڑا اس پہ میں جان وارا کیا
ابھی دل کو لے کر گیا میرے آہ	وہ چلتا رہا میں پکارا کیا
قمار محبت میں باری سدا	وہ جیتا کیا اور میں ہارا کیا

کیا قتل اور جان بخشی بھی کی
حسن اس نے احسان دوہرا کیا

عیش وصال و صحبت یاراں فراغ دل	اس ایک جان کیلئے کیا کیا نہ چاہیئے
اظہار خموشی میں ہے سو طرح کی فریاد	ظاہر کا یہ پردہ ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
کہتا نہ تھا میں اپنے دل تو اس سے نہ لگا نہ	اس کا تو کہا گیا اب تو اپنی جی گنوانہ

میر خوب رو چکا ہوں ظالم بس اور مجھ کو
آزردگی کی باتیں کہہ کہہ کے تو رُلا نہ

جاتے ہی یار کے تو کہتا تھا مر رہوں گا
وقت وداع اے دل آخر تو مر گیا نہ

آہ کیا جانیے محفل میں یہ کس کی خاطر
شمع روتی ہے جدا جلتا ہے پروانہ جدا

درد کرتا ہے تپ عشق کی شدت سے مرا
سر جدا، سینہ جدا، قلب جدا، شانہ جدا

اس کی امید نہیں ہے کبھی پھر بسنے کی
اور ویرانوں سے اس دل کا ہے ویرانہ جدا

جان و دل ہیں اداس سے میرے
اٹھ گیا کون پاس سے میرے

کوئی بھی اب امید باقی ہے
پوچھ یو وداع یاس سے میرے

شاید اٹھنے کا قصد تم نے کیا
اڑ چلے کچھ حواس سے میرے

میر دل کا تو دور کر ماسے کہ میں کچھ نہیں کہتا
خطرہ مجھے تیرا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

تا مجھ سے رہ پوچھے میری خموشی کا باعث
مجھ کو یہ تمنا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

اظہار خموشی میں ہے سو طرح کی فریاد
ظاہر کا یہ پردہ ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

مثنوی سحرالبیان (سن تصنیف ۱۱۹۹ھ) اس میں بے نظیر اور بدر منیر کا قصہ نظم ہوا ہے۔ قصہ خود شاعر ہی کے زور تخیل کی ایجاد ہے لیکن قصہ کی دل آویزی مثنوی کی شہرت کا باعث نہیں، اس کی شہرت کا راز اس کی سحربیانی ہے، سادگی، صفائی اور برجستگی جو ہر عمدہ نظم کے لوازمات ہیں، اس میں بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں، اول تو بحر بہت رواں اختیار کی ہے، پھر اس پر بیان اور طرز

ادا کی رنگینی نے شگفتگی پیدا کر دی ہے، زبان ایسی صاف اور شستہ استعمال ہوئی ہے کہ آج کل کی زبان سے زیادہ قدیم معلوم نہیں ہوتی، ان خوبیوں کے ساتھ جب جذبات کی ترجمانی، کردار نگاری، مصوری، واقعہ نگاری کو دیکھا جائے تو یہ مثنوی ادبی حیثیت سے اور بھی ابھر جاتی ہے، یہ مثنوی مقامی حالات، وقتی کیفیات، رسم و رواج اور طریقۂ بود و باش کو بھی نمایاں کرتی ہے۔ مثنوی بار بار چھپ چکی ہے اور ہر جگہ وہ نصاب مروج ہے، اور آج بھی اسی ذوق و شوق سے پڑھی جاتی ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

شاہزادہ بے نظیر کے غائب ہو جانے پر اندرون محل کی حالت پریشانی

کروں حال تحریر زودی رقم — گرا در اصل جی سے کیا اک پہ غم
کھلی آنکھ جب ایک کی ناگہاں — تو دیکھا کہ وہ شاہزادہ نہیں
نہ ہے وہ پلنگ اور نہ وہ ماہرو — فقط گل ہے اس جا نہ وہ اسکی بو
رہے دیکھ یہ حال حیران کار — کہ یہ کیا ہوا ہائے پروردگار
کوئی دیکھ یہ حال رونے لگی — کوئی غم سے جی اپنا کھونے لگی
کوئی بلبلاتی سی پھرنے لگی — کوئی ضعف کھا کھا کے گرنے لگی
کوئی سر پہ رکھ ہاتھ دلگیر ہو — گئی بیٹھ ماتم کی تصویر ہو
کوئی رکھ کے زیر زنخداں چھڑی — رہی نرگس آسا کھڑی کی کھڑی
رہی کوئی انگلی کو دانتوں میں داب — کسی نے کہا گھر ہوا یہ خراب
کسی نے دیئے کھول سنبل سے بال — طمانچوں سے جوں گل کیے سرخ گال

یہ سن آئی کچھ ان کو اس کے سوا
کہ کیجے یہ احوال اب شبہ سے جا

بدر منیر کی حالت مفارقت

لگی کہنے نجم النسا سے بلا
خدا جانے اس شخص کو کیا ہوا

کہا اس نے، تمی تم کو سودا ہے کچھ
وہ معشوق ہے اس کی پروا ہے کچھ

خدا جانے کس شکل میں رنگ کس
مری جان ہے اتنا بھی ہونا فدا

وہ رہ رہ کے تم کو رلاتا ہے چاہ
عبث آپ کو مت کرو تم تباہ

رکے جو کوئی اس سے رک جائیے
کھنچے آپ اس سے تو کھنچ جائیے

ذرا دل بہلا کچھ نکالا کرو
ذرا آپ کو تم سنبھالا کرو

یہ سن چپ ہی ہو دل میں کھا پیچ و تاب
رہی پھر نہ اس بات کا کچھ جواب

گئے اس پہ جب دن کئی اور بھی
نظر آنے لگے پھر تو کچھ طور بھی

دوانی سی ہر طرف پھرنے لگی
درختوں میں جا جا کے گرنے لگی

ٹھہرنے لگا جان میں اضطراب
لگی دیکھنے وحشت آلودہ خواب

تپ ہجر گھر دل میں کرنے لگی
دم اشک سے چشم بھرنے لگی

خفا زندگانی سے ہونے لگی
بہانے سے جا جا کے سونے لگی

تو غم کی شدت سے پھر کانپ کانپ
اکیلی لگی رہنے منہ ڈھانپ ڈھانپ

نہ اگلا سا ہنسنا نہ وہ بولنا
نہ کھانا نہ پینا نہ لب کھولنا

جہاں بیٹھنا پھر نہ اٹھنا اسے
محبت میں دن رات گھٹنا اسے

کہا گر کسی نے کہ بی بی چلو
تو اٹھنا اسے کہہ کے ہاں جی چلو

جو پوچھا کسی نے کہ کیا حال ہے ۔ تو کہنا یہی ہے جو احوال ہے
کسی نے جو کچھ بات کی بات کی ۔ پہ دن کی جو پوچھی کہی رات کی
کہا گر کسی نے کہ کچھ کھائیے ۔ کہا خیر بہتر ہے منگوائیے
کسی نے کہا سیر کیجیے ذرا ۔ کہا سیر سے دل ہے میرا بھرا
جو پانی پلانا تو پی سانے ۔ غرض غیر کے ہاتھ جینا ہے
نہ کھانے کی سدھ اور نہ پینے کا ہوش ۔ بھرا دل میں اسکے محبت کا جوش
جدھر پر نہ مائل نہ گل پر نظر ۔ وہی سامنے صورت آٹھوں پہر
ہمیشہ اسی سے سوال و جواب ۔ سدا ورد اسکے غم کی کتاب
جو آ جائے کچھ ذکر شعر و سخن ۔ تو پڑھتا یہ اشعار میر حسن

غزل

یہ کیا عشق آفت اٹھانے لگا ۔ مرے دل کو تجھ سے چھڑانے لگا
ملا میرے دلبر سے مجھ کو خدا ۔ نہیں تو مرا جی ٹھکانے لگا
گرہ چشم خونبار کا کیجیے بس ۔ مرا دل ہی مجھ کو ڈبانے لگا
فلک نے تو آنا ہنسایا نہ تھا ۔ کہ جس کے عوض یوں رلانے لگا
نہیں مجھ کو دشمن سے شکوہ حسن ۔ مرا دوست مجھ کو ستانے لگا

غزل یا رباعی جو گاتا کوئی فرد ۔ اسی ڈھب کی پڑھتا کہ ہو جسمیں درد
سو وہ بھی جو مدنظر تھے کہیں ۔ نہیں تو کچھ اسکی بھی خواہش نہیں
سبب یہ کہ دل سے تعلق ہے سب ۔ نہ ہو دل تو پھر بات بھی ہے غضب
گیا ہو جب اپنا ہی جیوڑا نکل ۔ کہاں کی رباعی کہاں کی غزل

داستان خبر پانا ماہ رخ کا زبانی دیو کے عشق بے نظیر و بدر منیر سے اور قید کرنا بے نظیر کو

پلا جلد ساقی مجھے مے کے جام
کہ ستے ہیں اب دل پہ ٹوٹے تمام

یہ وہ دل کو یک جا بٹھاتا نہیں
کسی کو اسے وصل بھاتا نہیں

یہ ہے دشمن وصل و دلسوز ہجر
کرے ہے شب وصل کو روز ہجر

جدائی انہوں کی جو خوش آئی اسے
پھر ان کی بھی صحبت نہ بھائی اسے

کسی دیو نے دی پری کو خبر
کہ معشوق عاشق ہوا اور پہ

یہ سن کر وہ شعلہ بھبھوکا ہوئی
لگی کہنے ہیں یہ بلا کیا ہوئی

قسم مجھ کو حضرت سلیمان کی
ہوئی دشمن اب اس کی میں جان کی

کہا دیو سے سب مجھے تو بتا
کہاں وہ کسی باغ میں تھا کھڑا

کوئی ماہ سی تھی اک اس کے ساتھ
کھڑی تھی دیئے اس کے ہاتھوں میں ہاتھ

قضارا اڑا میں جو ہو کر ادھر
وہ دونوں مجھے واں لپٹتے نظر

یہ آتی ہی اس کو خبر سن چڑھی
کہو دیکھئے پاؤں اس کو کدی

تو کھا جاؤں کچا اسے وقت ہو
لگی ہے مرے جی میں تو وہ سوت آہ

وہ آنے تو آگے مرے نابکار
گریباں کو اس کے کروں تار تار

یہی قول و اقرار تھا میرے ساتھ
بھلا اس کا دامن ہے اور میرا ہاتھ

ہمارے بزرگوں نے سچ ہے کہا
کہ ہے آدمی زاد کل بے وفا

غضبناک ایسی تھی یہ تو ادھر
کہ اتنے میں آیا وہ رشک قمر

اسے دیکھ غصے میں وہ ڈر گیا ‏ ‏ ‏ کہے تو کہ جیتے ہی جی مر گیا
بلا سی وہ دیکھا اسکے پیچھے پڑی ‏ ‏ ‏ کہا میں تو اے موذی و مدعی
تجھے سیر کو میں نے گھوڑا دیا ‏ ‏ ‏ کہ اس مالزادی کو جوڑا دیا
الگ ہم سے یوں رہنا اور چھوٹنا ‏ ‏ ‏ یہ اوپری اوپر مزے لوٹنا
جھلکا دیا تھا نہ تو نے یہی! ‏ ‏ ‏ بھلا اس کا بدلہ نہ لوں تو سہی
پھرا جیسے راتوں کو دوشالہ تو ‏ ‏ ‏ کرے گا دنوں کو بہت یاد لو
مزا چاہ کا دیکھ اپنی ذرا! ‏ ‏ ‏ جھنکاتی ہوں کیسے کوئیں پہ بھلا
تجھے جی سے ماروں تو کیا اے غریب ‏ ‏ ‏ دلے جانتے ہیں یہ تیرے نصیب
کہ چاہ الم میں پھنساؤں تجھے ‏ ‏ ‏ ہنسا ہے تو جیسا رلاؤں تجھے
یہ کہہ اور بلا اک پری زاد کو ‏ ‏ ‏ کہا سنیو اس کی نہ فریاد کو
اسے کھینچتا یاں سے لے جا شتاب ‏ ‏ ‏ وہ صحرا جو ہے درد و محنت کا باب
کنواں اک ہے جو مصیبت بھرا ‏ ‏ ‏ کئی من کا پتھر ہے اس پر دھرا
اسے جا کے اس چاہ میں بند کر ‏ ‏ ‏ وہی سنگ پھر اس کے منہ پر تو دھر
سر شام کھانا کھلانا اسے ‏ ‏ ‏ اور اک جام پانی پلانا اسے
نہ دیجو سوا اس کے جو کچھ کہے ‏ ‏ ‏ یہی اس کا معمول دائم رہے

سید محمد میر سوز

سید محمد میر نام، سوز تخلص، میر ضیاء الدین کے بیٹے تھے، ۱۷۲۰ء میں دہلی میں پیدا ہوئے، اور وہیں تعلیم و ترتیب پائی، شاہ عالم کے عہد میں جب دہلی پر تباہی آئی، تو سوز نے فرخ آباد کا رخ کیا اور وہاں نواب مہربان خاں رند کی سرکار میں کچھ دنوں زندگی بسر کی، اس

کے بعد لکھنؤ پہنچے مگر رنگ نہ جما، مرشد آباد کا قصد کیا لیکن وہاں بھی قسمت نے یاوری نہ کی، پھر لکھنؤ واپس آئے، اس مرتبہ تقدیر نے زور کیا، نواب آصف الدولہ ان کے شاگرد ہوگئے، چند روز آرام سے گزر رہے تھے کہ سنہ ۱۷۹۹ء میں سفر آخرت پیش آیا ۔

میر سوز کی علمی قابلیت لوازمات شاعری کو نبھانے کے لئے کافی تھی، خط شفیعہ اور نستعلیق خوب لکھتے تھے، ورزش بھی کیا کرتے تھے، اور فن شہسواری و سپاہگری و تیر اندازی میں ماہر و مشاق تھے ۔

ابتداءً میر تخلص کرتے تھے لیکن میر تقی میر کی عالمگیر شہرت کے مقابلے میں میر کو بے فروغ پاکر سوز تخلص اختیار کیا،

میر سوز کی زبان غزل کے لئے خاص طور پر موزوں ہے یعنی صاف و سادہ اور شیریں، کلام تصنع اور تکلف سے قطعی پاک ہے، روزمرہ اور محاورہ کو نہایت خوش اسلوبی اور سادگی سے نظم کرتے ہیں، فارسی اضافت تشبیہ و استعارہ و تراکیب بہت کم بلکہ نہ ہونے کے برابر ہیں، خیالات سیدھے سادے بلکہ روزمرہ کی باتیں ہیں، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مخاطب سے بیٹھے باتیں کر رہے ہیں، معشوق کو فقط جان یا میاں یا میاں جان کہہ کر خطاب کرنا انکا خاص محاورہ ہے، مضمون جیسے سیدھے سادے ہوتے ہیں، ویسے ہی آسان آسان طرحیں بھی لی ہیں، ردیف چھوڑ کر اکثر قافیہ ہی پر اکتفا کرتے ہیں، پڑھنے کا طریقہ بھی وہ ایجاد کیا تھا کہ پڑھتے وقت خود مضمون کی تصویر بن جاتے تھے، آواز میں درد تھا، اور پھر اس ادا کاری سے شعر عجب مزا دیتا تھا، نمونہ کلام ملاحظہ ہو: ۔

سترہ غزلیں ہیں، اور سب پانچ پانچ شعر کی ہیں، اور کلام کا وہی رنگ ہے جو ان کے استاد مرزا مظہر کا ہے، نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

ہر گھڑی صحرا نشینی پر یہ رکھ جرأت یقین — آ گئی تھی راس مجنوں کو بیاباں کی ہوا

تری الفت مرا ناخوش نہیں آتا مجھے درد — یہ ایسا کار آساں اس قدر دشوار کیوں ہوتا

کعبہ سے ہم گئے نہ گیا پر بتوں کا عشق — اس درد کی عدو کے بھی گھر میں دوا نہیں

عشق میں ملتی نہیں راحت کبھی اے کوہکن — جان شیریں دیجئے تب جا کے شیریں لیجیے

میر محمد بیدار | میر محمد علی نام بیدار تخلص تھا، مگر شہرت میر محمدی کے نام سے ہوئی، دہلی کے رہنے والے تھے، وہیں نشو و نما بھی ہوا، حضرت خواجہ میر درد کے شاگرد تھے، طریقہ چشتیہ کے اذکار و اشغال کی ورزش کرنے کے بعد خرقہ خلافت پہنا، آخر عمر میں آگرہ جا بسے تھے، وہیں ۱۷۹۶ء میں راہی ملک بقا ہوئے، جب میر درد نے رعایت لفظی کے ناپسندیدہ رنگ کو ترک کیا، بیدار نے بھی اس میں کوشش کی، اور صفائی کے ساتھ تصوف کا رنگ بقدر مناسب شامل کر کے اپنے طرز کلام کو علیحدہ کر لیا، نمونہ کلام یہ ہے،

کس کس کا دل نہ شاد کیا تو نے اے فلک — اک میں ہی غمزدہ ہوں کہ ناشاد رہ گیا

بیدار راہ عشق کسی سے نہ طے ہوئی — صحرا میں قیس کوہ میں فرہاد رہ گیا

اب تک مرے احوال سے وہ ان بے خبری ہے — اے نالۂ جانسوز یہ کیسا بے اثری ہے

نے بت کدہ سے کام نہ مطلب حرم سے تھا — محو خیال یار رہے ہم جہاں رہے

تبصرہ

زبان | یہ دور زبان کی ترقی کے لئے خاص طور پر ممتاز ہے، میر درد

اور سوز نے زبان کی صفائی کی ایسی کامیاب کوشش کی کہ نظم اردو ان حضرات کے بار احسان سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی، سودا نے فارسی کی لطیف و دلنشیں ترکیب سے اردو میں وسعت پیدا کی، ایرانی محاوروں کو کہیں ترجمہ کر کے کہیں تصرف کی مدد سے اردو میں اس طرح کھپایا کہ جزو زبان بن گئے، ان ہندی الفاظ سے جو بدنما اور ثقیل تھے دامن اردو کو پاک کیا۔ اسی دور میں زبان کی ترقی کے لئے مشاعرے منعقد ہوئے چنانچہ اوپر لکھا جا چکا ہے کہ پہلے درد کے یہاں اور پھر میر کے یہاں مشاعرہ منعقد ہوا کرتا تھا، ان مشاعروں میں خاص طور پر زبان کی جانچ پڑتال اور دیکھ بھال ہوا کرتی تھی،

موضوع سخن | اس دور کو اگر صوفیانہ دور کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا، اکثر و بیشتر شعرا ذہنی یا اعتقادی طور پر صوفی اور بزرگ تھے حضرت مظہر، میر صاحب، بیدار یہاں تک کہ سودا کے کلام میں بھی تصوف اور اخلاق کی چاشنی مزا دیتی ہے، ان کے علاوہ خواجہ درد نے تو اپنے کلام کی بنیاد ہی تصوف اور اخلاق پر رکھی، اور سادگی بیان کے ساتھ وہ صوفیانہ اور اخلاقی مضامین نظم کئے کہ باید و شاید۔

اصناف سخن | اس دور میں غزل معراج کمال پر پہنچی، اور گو ناگوں اسلوب بیان غزل میں اضافہ ہوئے سوز و گداز جو غزل کی جان ہے اس دور کے ساتھ مخصوص ہے، ہر آئندہ آنے والے دور نے اس دور کی غزل کے روبرو سر تسلیم خم کیا ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ صفائی، سادگی، جوش و صداقت بیان، رنگینی جذبات، سوز و گداز اور اثر جس قدر اس دور نے غزلیات میں ابھار

گر جو یک نصیب نہ ہوا اور نہ آئندہ امید کیونکہ نہ وہ سادگی رہی نہ صفائی، وہ عشق رہا نہ وہ رنگینیٔ حسن، اور اگر ہو بھی تو وہ ٹھیٹھ بنی زبان کہاں،

قصیدے کے لئے بھی اس دور کو خاص اہمیت حاصل ہے، سودا نے اس زمین کو اس قدر بلند کیا کہ اس قصیدہ کے مرتبہ کر دیا، آئندہ ادوار میں بجز ذوق کے کوئی سودا کو نہ پہنچ سکا۔

مثنوی بھی اس دور میں خوب پھلی پھولی، میر نے بھی لکھی اور سودا نے بھی مگر میر حسن نے کمال کر دیا اور سحر البیان میں وہ سحر بیانی کی کہ آج تک اس کا جواب تو ایک طرف اس کا عشر عشیر بھی کسی مثنوی نے پیش نہ کیا،

واسوخت اسی عہد میں ایجاد ہوا اور میر اس کے موجد ٹھہرے، ہجو نے بھی اس دور میں فروغ پایا، کاش یہ اس دور کے دامن میں یہ خار نہ ہوتا،

اسلوب بیان موضوع سخن اور غزل کے عنوانات سے جو خصوصیات اس دور کی بیان ہوئیں وہی اسلوب بیان کی خصوصیات ہو سکتی ہیں لیکن سب سے زیادہ اہم خصوصیت اس دور کی یہ ہے کہ اردو شاعری کی جبین سے ایہام کا داغ مٹ گیا، حضرت مظہر پہلے بزرگ ہیں جنہوں نے اس تکلف کو ترک کر کے شعر کے لئے راستہ صاف کیا، اور ایک زبردست رکاوٹ کو ہٹا دیا، سودا نے تشبیہ و استعارہ برتا لیکن ایسا جیسے آٹے میں نمک، زیادہ تر اشعار ایسے لکھے گئے کہ خواہ انہیں حقیقت کی طرف لے جاؤ خواہ مجاز کی طرف، مدعا یہ کہ غزلیات میں جذبات نگاری ہے، خارجی اور صنفی حسن کی عریاں تعریف و توصیف نہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جس کے

بیان کا یہ موقع نہیں۔ انشاءاللہ آیندہ موقع و محل پر بیان ہوگی،

اس دور میں مرثیہ بھی لکھا گیا، لیکن مرثیہ کے لئے ایک علیحدہ باب مرثیہ کا انتظار کیجئے۔

باب ۵

اردو شعر و شاعری کا تیسرا دور

شیخ قلندر بخش جرأت قلندر بخش نام، جرأت تخلص، حافظ امان کے بیٹے، دہلی کے رہنے والے تھے، لیکن نشو و نما فیض آباد میں ہوا، ان کے بزرگ شاہی دربار میں دربانی کی خدمت رکھتے تھے لیکن جرأت نے ترقی کرکے اقلیم سخن کی بادشاہت حاصل کی، جوانی میں بینائی سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے لیکن مشق سخن جاری رہی، فیض آباد سے لکھنؤ پہنچے، اور مرزا سلیمان شکوہ کے دربار میں رسائی حاصل کی، ۱۸۱۰ء میں وہیں پیوند خاک ہوئے۔

جرأت جعفر علی خاں حسرت کے شاگرد تھے، موسیقی اور ستار بجانے میں بھی کامل تھے، اپنے زمانے میں بذلہ سنج اور لطیفہ گو مشہور تھے، انشاء اللہ خان کی صحبتیں خوب گرم رہتی تھیں،

جرأت کا دیوان چھپ چکا ہے، اس میں غزلیں، رباعیاں، مخمس، مستزاد، واسوخت، ہجویں وغیرہ اصناف شامل ہیں، جرأت اپنے رنگ کے باکمال

شاعر ہیں ، ان کی شاعری کا سطح بلند نہیں ، باتیں ہی باتیں ہیں ، نہ کلام میں عمق ہے نہ خیالات میں بلند پروازی ، عشق و محبت کی سیدھی سادی واردات ہیں لیکن عشق بھی بلند قسم کا نہیں ، اگر بجائے عشق کے ہوس کہا جائے تو بجا ہے لیکن زبان نہایت صاف اور سادہ پائی جاتی ہے ، محاورہ کا لطف بھی ہر جگہ موجود ہے ان کے ہاں مسلسل غزلیں بھی پائی جاتی ہیں ، نمونہ کلام ملاحظہ ہو :

لگ جا گلے سے تاب اب اے نازنیں نہیں
ہے ہے خدا کے واسطے مت کر نہیں نہیں

کیا رک کے وہ کہے ہے جو ٹک اس سے لگ چلوں
بس بس پرے ہو شوق پر اپنے تئیں نہیں

پوچھے ہے کیا کہوں جگر و دل کا کیا ہے رنگ
کس روز اشک خونیں سے تر آستیں نہیں

فرصت جو پا کے کہیے کبھو درد دل سو ہائے
وہ بدگماں کہے ہے کہ ہم کو یقیں نہیں

آتش سی پھنک رہی ہے میرے تن بدن میں آہ
جب سے کہ روبرو وہ رخ آتشیں نہیں

اس بن جہان کچھ نظر آتا ہے اور ہی
گویا وہ آسماں نہیں وہ زمیں نہیں

کیا جانے کیا وہ اس میں ہے لوٹے ہے جس پہ دل
یوں اور کیا جہان میں کوئی حسیں نہیں

سنتا ہے کون کس سے کہوں درد بے کسی
ہمدم نہیں ہے کوئی میرا ہم نشیں نہیں

ہر چند ہے یہ لطف شب ماہ سیر باغ
اندھیر ہی ہے کہ وہ مہ جبیں نہیں

آنکھوں کی راہ نکلے ہے کیا حسرتوں سے جی
وہ رو برو جو اپنے دم واپسیں نہیں

طوفان گریہ کیا کہیں کس وقت ہم نشیں!
موج سرشک تا فلک ہفتمیں نہیں

حیرت ہے مجھ کو کیونکہ وہ جرأت سے چیں سے
جس بن ف[illegible] کہ ہمارے کہیں نہیں

میر انشاء اللہ خاں انشاء

والد ماشاء اللہ خاں نام انشا، تخلص میر ماشاء اللہ خاں کے بیٹے تھے، آپ کی ولادت کا فخر مرشد آباد کو حاصل ہے میر ماشاء اللہ خاں طبیب اور شاعر ہونے کے علاوہ عالم و فاضل بھی تھے، چنانچہ میر انشاء اللہ خاں کی تعلیم و تربیت اپنے ہاتھوں میں لی۔ انشاء خود بلا کے ذہین اور ذکی تھے نتیجہ یہ ہوا کہ عربی و فارسی میں استعداد کامل پیدا کی، فن طبابت خاندانی طرۂ امتیاز تھا اسے بھی حاصل کیا، اور آخر میں شاعری کی طرف متوجہ ہوئے، عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں طبع آزمائی کی، اردو میں خصوصاً وہ کمال پیدا کیا کہ آسمان شاعری پر مہر و ماہ ہو کر چمکے۔

لے خاص طور سے رنگ آمیزیاں کی ہیں۔ حیات دبیر کے مصنف نے مرزا دبیر کی زبانی لکھا ہے جو انشا کے حواسے تھے کہ انشا نہ مجنون ہوئے نہ ان کی تنخواہ بند ہوئی۔ صرف اتنا صحیح ہے کہ نواب صاحب نے حکم دے دیا تھا کہ سوا دربار کے دن یہیں نہ آنے پائیں۔ اور دربار میں بھی اسی وقت حاضر ہوں جب بلایا جائے۔ چنانچہ انشا نے اسی حکم کی طرف اشارہ کیا ہے

دروں ہم و دیر اسماں کے لئے آئی چساں کم حرکت تو کری ست یا یاری

آخری حالت میں ۱۸۱۷ء میں قید حالت کے ساتھ قید حیات سے آزاد ہوئے۔

انشا کے علم و فضل ذہن و ذکاوت مشق سخن اور قدرت کلام میں کسی شک و گمان کو دخل نہیں۔ کلیات چھپ چکا ہے۔ اس میں کیا کیا کچھ نہیں ہے۔ اردو فارسی کے علاوہ قصیدے، غزلیں، خطوط، منظوم رباعیاں، پہیلیاں، سیٹھنیاں، چوپی اور چھوٹی چھوٹی مثنویاں وغیرہ سبھی کچھ موجود ہے۔ اردو فارسی کے علاوہ پنجابی، پوربی، مارواڑی، مرہٹی، کشمیری وغیرہ زبانوں کے ساتھ استعمال کرکے اپنی طبیعت کی ہمہ گیری کا ثبوت دیا ہے لیکن افسوس ہے کہ ان کی شاعری کو تمسخر نے ڈبو دیا۔ ان کی شوخ اور چلبلی طبیعت انہیں کبھی جم کر بیٹھنے نہیں دیتی۔ ابھی متانت سے بیٹھے ہیں، ابھی آزادی کے انداز میں مستانہ اُدھم مچا رہے ہیں۔ کہیں ہجو کے کانٹوں میں الجھے ہوئے ہیں کہیں لطافت و ظرافت کے زور میں طبیعت کو بے لگام چھوڑ دیا ہے۔ مدعا یہ کہ انشا اگر قادر الکلامی اور طبیعت پر قابو رکھتا تو زبان اردو کے لئے خصوصاً اور ملک کے لئے عموماً مفید ثابت ہو

کلیات کے علاوہ انشا نے ایک کتاب "دریائے لطافت" بھی لکھی جو
۱۸۰۲ء میں تکمیل کو پہنچی، یہ اردو قواعد کی پہلی کتاب ہے، اگرچہ فارسی میں لکھی
گئی ہے لیکن جا بجا اردو اشعار اور نثر کے ٹکڑے اس میں درج کئے ہیں، اس
کے علاوہ "رانی کیتکی" کی کہانی خالص اردو میں لکھی ہے یعنی عربی اور فارسی الفاظ
کو اس میں دخل نہیں، تاہم فصاحت، روزمرہ اور محاورہ سے گری ہوئی نہیں
ہے، قصیدوں میں انگریزی الفاظ کو نہایت بے ساختگی سے استعمال کیا
ہے جن میں سے اکثر الفاظ آج ہماری زبان میں گھل مل گئے ہیں نمونہ کلام ملاحظہ ہو

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹھکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

تصور عرش پر ہے اور سر ہے پائے ساقی پر
غرض کچھ اور دھن میں اس گھڑی مے خوار بیٹھے ہیں

بسان نقش پائے رہرواں کوئے تمنا میں
نہیں اٹھنے کی طاقت کیا کریں لاچار بیٹھے ہیں

یہ اپنی چال ہے افتادگی سے اب کہ پہروں تک
نظر آیا جہاں پر سایۂ دیوار بیٹھے ہیں

کہاں صبر و تحمل آہ ننگ و نام کیا شے ہے
میاں رو پیٹ کر ان سب کو ہم یک بار بیٹھے ہیں

نجیبوں کا عجب کچھ حال ہے اس دور میں یارو
جہاں پوچھو یہی کہتے ہیں ہم بیکار بیٹھے ہیں
بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشا
غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

اٹھا کے برف میں ساقی صراحیٔ مے لا — جگر کی آگ بجھے جس سے جلد وہ شے لا
قدم کو ہاتھ لگاتا ہوں اٹھ کہیں گھر چل — خدا کے واسطے اتنے تو پاؤں مت پھیلا
نکل کے وادیٔ وحشت سے دیکھ اے مجنوں — کہ زور دھوم سے آتا ہے ناقۂ لیلا
گرا جو ہاتھ سے فرہاد کے کہیں تیشہ — درون کوہ سے نکلی صدائے واویلا
نزاکت اس گل رعنا کی دیکھیو انشا
نسیم صبح جو چھو جائے رنگ ہو میلا

مجھے کیوں نہ آوے ساقی نظر آفتاب الٹا
کہ پڑا ہے آج خم میں قدح شراب الٹا
عجب الٹے ملک کے ہیں اجی آپ بھی کہ تم سے
کبھی بات کی جو سیدھی تو ملا جواب الٹا
چلے تھے حرم کو رہ میں ہوئے اک صنم کے عاشق
نہ ہوا ثواب حاصل یہ ملا عذاب الٹا
یہ شب گذشتہ دیکھا وہ خفا سے کچھ ہیں گویا!
کہیں حق کرے کہ ہووے یہ ہمارا خواب الٹا
ابھی جھڑ لگا دے بارش کوئی مست بھر کے نعرہ

جو زمیں پہ پھینک مارے قدح شراب الٹا

یہ عجیب ماجرا ہے کہ بروز عید قرباں
وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب الٹا

ہوئے وعدہ پر جو جھوٹے تو نہیں ملاتے تیور
اسے لو دیکھا کچھ تم شاہد سے تو عتاب الٹا

کھڑے چپ ہو دیکھتے کیا میرے دل اجڑ گئے کو
وہ گنہ تو کہہ دو جس سے یہ ہوا خراب الٹا

شیخ غلام ہمدانی مصحفی غلام ہمدانی نام مصحفی تخلص ہے شیخ ولی محمد کے بیٹے ۱۱۵۰ھ میں بمقام امروہہ پیدا ہوئے، اور عنفوان شباب میں دہلی آئے طبیعت میں موزونیت مادر زاد تھی علوم متداولہ سے فارغ ہو کر شعر و سخن کی طرف مائل ہوئے، بزرگان دہلی کی صحبتوں نے مذاق شاعری درست اور کثرت مشق نے بزم شعرا میں پہنچایا، جب تک دہلی میں رہے اپنے گھر پر مشاعرہ کیا کرتے تھے، مزاج میں غربت، مسکینی اور ادب کی پابندی تھی، اس وجہ سے سب شعرا اور معززاسی اصحاب لطف و مروت سے پیش آتے تھے، انہیں بھی دہلی اور اہل دہلی سے اس قدر محبت تھی، کہ دہلی ہی کو اپنا وطن بنا لیا اور مرتے دم تک اس کی محبت دل میں رہی۔

جب دہلی تباہ ہوئی، اور اہل کمال کا مجمع منتشر ہوا، مصحفی نے بھی بادل ناخواستہ دہلی کو خیرباد کہا، چند روز ٹانڈہ میں نہایت فارغ البالی کے ساتھ رہے، اس کے بعد لکھنؤ پہنچے لیکن قسمت نے کچھ یاوری نہ کی، ناچار دہلی واپس آ گئے،

مگر کچھ دنوں کے بعد گردش آب و دانہ پھر انھیں لکھنؤ لے گئی اس مرتبہ مرزا سلیمان شکوہ کی سرکار میں ملازم ہو گئے، مرزا سلیمان شکوہ نے انہیں اپنا استاد بنا لیا رفتہ رفتہ مصحفی جگت استاد ہو گئے۔

دوران قیام لکھنؤ میں مصحفی اور انشا کے خوب معرکے ہوئے، یہ معرکے شاعرانہ تعریضوں سے شروع ہو کر ہجو ذل تک نوبت پہنچی اور آخر میں تو یہ حال ہو گیا، کہ ابتذال اور رکاکت پر تہذیب و شائستگی نے آنکھیں بند کر لیں۔

مصحفی کو مرزا سلیمان شکوہ کی سرکار سے صرف پچیس روپیہ ماہوار ملتے تھے، جب میر انشاء اللہ خاں کو باریابی ہوئی ہے اور وہ شاہزادہ کی غزلیں بنانے لگے، لیکن پچیس روپوں میں بھی تخفیف ہو گئی، خود فرماتے ہیں

اے وائے کہ پچیس سے اب پانچ ہیں اپنے

غرض اس افلاس میں گذر اوقات کے لئے غزلیں اور اشعار بیچتے تھے، اور صبر و شکر کے ساتھ زندگی کے ایام بسر کرتے تھے، آخر اسی حالت میں ۱۸۲۴ء میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

مصحفی نے آٹھ دیوان اپنی یادگار چھوڑے جو آپ کی استادی اور قادر الکلامی کو مسلم کرتے ہیں، ان کے علاوہ تذکرہ شعرائے اردو زبان فارسی لکھا اس میں محمد شاہی عہد سے مصحفی کے معاصرین تک کل شعرا کا حال درج ہے۔

"آب حیات" میں مولانا آزاد نے جا بجا سید انشا کو مصحفی پر ترجیح دی ہے، مگر اب وہ زمانہ نہیں رہا۔ اب ہمارے روبرو کلیات انشا موجود اور دواوین مصحفی موجود ہیں۔ انشا کی ذہانت، طباعی، بذلہ سنجی اور ظرافت میں جا سکے

کلام نہیں علم و فضل بھی مسلم ہے، لیکن سخن سنجی مشاقی اور متانت میں مصحفی سید صاحب سے بہت آگے ہیں، اگر مصحفی کے آٹھ دیوانوں میں سے بلند مرتبہ معیاری اشعار انتخاب کئے جائیں، تو سید صاحب کے مجموعہ ہزل و غزل کے برابر ایک مجموعہ ان کے منتخب اشعار کا تیار ہو سکتا ہے، علاوہ بریں مصحفی کی استادی مشاقی اور ہر دلعزیزی کا ایک زندہ ثبوت یہ بھی ہے کہ خواجہ حیدر علی آتش میر مستحسن خلیق، میر مظفر حسین ضمیر، میر مظفر علی اسیر جو اپنے وقت میں مسلم الثبوت استاد ہوئے، ان ہی کے دامن تربیت میں پل کر جوان ہوئے تھے

مصحفی کا کلام اس امر کا مقتضی ہے، کہ انہیں اردو شعر و شاعری کے عہد زریں یعنی دور دوم میں جگہ دی جائے، کیونکہ جہاں ان کے کلام میں میر کا سوز و گداز، سودا کا ساز ور اور میر سوز کی سی سادگی پائی جاتی ہے وہاں خیالات میں متانت اور طرز ادا میں استواری بھی ہے، زبان پر بھی بہت سے قدیم الفاظ چڑھے ہوئے ہیں قصیدوں میں جوش و خروش نہ سہی لیکن انداز وہی سودا کے قصیدوں کا ہے لیکن چونکہ عہد زریں کے شعراء اور مصحفی میں بیس پچیس تیس برس کا تفاوت ہے، اور ان کی اور سید انشا کے درمیان خوب نوک جھونک رہتی ہے، اس لئے مجبوراً انہیں دور سوم میں جگہ دی گئی ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس دور کا صدر اگر کسی کو بنایا جا سکتا ہے، تو وہ آپ ہی ہیں۔

سطور بالا سے مصحفی کے کلام کے متعلق کچھ اندازہ ہوگا ان کا کوئی خاص فارسی رنگ نہیں ہے، بزرگوں ہی کے نقش قدم پر چلتے ہیں اور اسی میں سعادت سمجھتے ہیں، البتہ سید انشا کے خلاف اصول فن کی پوری پابندی کرتے ہیں، غزلوں میں

سنگلاخ زمینیں اختیار کی ہیں، اور اپنی قادر الکلامی کی مدد سے انہیں ہرا بھرا کیا ہے
نواب کلب علی خاں مرحوم نے ان کے آٹھوں دیوانوں کا خلاصہ کرا کر
چھپوا دیا ہے، نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

دن جوانی کے گئے موسم پیری آیا — آرزو خواب ہے اب وقت حقیری آیا
نہ بہ طاقت رہے کیا حال کہ اعضا گئے تھک — حاکم ضعف سے فرمان تغیری آیا
جبکہ تو بلبل لے پڑھا مجھ سے ڈلے — نہ اسے قاعدۂ تازہ صفیری آیا
شاعری پر کبھی اپنی جو گئی اپنی نظر — نہ ضمیر اپنے میں اس وقت ضمیری آیا
پوچھ مت معرکۂ عشق کا ہنگامہ کہ واں — قیس مارا گیا وامق ہا سیری آیا

چشم کم سے نہ نظر مصحفیؔ خستہ پہ کر
وہ اگر آیا تو محفل میں نظیری آیا

نگاہ لطف کے کرتے ہی رنگ انجمن بگڑا
محبت میں تیری ہم سے ہر اک اہل وطن بگڑا
خدا کہتا تھا روز حشر میں تجھ سے سمجھ لوں گا!
تیرے تیشہ سے گر شیریں کا نقش اے کوہکن بگڑا
جو جھنگ نالہ کو ہم نے اڑایا ہجر کی شب میں
کہیں گے سب کہ تیرا کھیل اے چرخ کہن بگڑا
مکان تنگ میں پانی نہ جا کلک تخیل نے
مناسب خال و خط مانی سے پر اس کا دہن بگڑا
گیا مارا حج یوں پیری نے حسن تو جوانی کو

میں نظیر کے لئے ایک الگ باب قائم کیا ہے، اور اس میں ساہ نصیر دہلوی کو بھی شامل کر لیا ہے، مشرقی کو ہم بیلی نے انہیں مصحفی و انشاء کے دور میں جگہ دی ہے میں حیران ہوں کہ کیا کروں چھوڑ جاؤں یہ ناممکن ہے، الگ دورقائم کروں تو اس کے لئے نظیر کے ہم زبان شعراء کی جماعت کہاں سے لاؤں، ناچار مشرقی گرہم بیلی کے نقش قدم پہ چلتا ہوں

شیخ ولی محمد نام نظیر تخلص حلف محمد فاروق، دہلی میں پیدا ہوئے، آپ اپنے والدین کے اکلوتے بیٹے تھے، اس لئے بڑے ناز و نعم میں پرورش پائی لڑکپن میں اپنی والدہ کے ہمراہ آگرہ پہنچے، اور محلہ تاج گنج میں سکونت اختیار کی علوم متداولہ حاصل کئے چنانچہ عربی اور فارسی میں کامل دستگاہ رکھتے تھے، نظیر آزاد منش، درویش مزاج اور قناعت گزیں آدمی تھے، نواب سعادت علی خاں نے لکھنؤ بلایا، مہاراجہ بھرت پور نے بھی طلب کیا، مگر آپ نے گوشہ عزلت کو چھوڑ کر دربارداری کے دردسر کو قبول نہ کیا، آگرہ ہی میں ایک معلم کی حیثیت سے بسر اوقات کرتے رہے، اور اسی حال میں اس سرائے فانی سے کوچ کیا۔

نظیر کا کلیات چھپ چکا ہے، اس میں مختلف قسم کے بہت سے عنوانات پر نظمیں ہیں، زیادہ تر مسدس اور مخمس ہیں، اکثر و بیشتر نظمیں ظرافت آمیز ہیں حقائق و معارف کو نہایت خوش اسلوبی سے بیان کرتے ہیں، واقعات کی مانند کو اچھے اور برے، دونوں پہلوؤں سے اس طرح پیش کرتے ہیں کہ تصویر کھینچ دیتے ہیں، کلیات گوناگوں خوش رنگ پھولوں کا گلدستہ ہے کہیں رندی کا رنگ

جھلکتا ہے کہیں زہد و پارسائی کا، کہیں پند و نصائح ہیں، اور کہیں حقائق و معارف۔ بعض نظمیں موت، فنا، ترک دنیا وغیرہ پر نہایت موثر طریقہ پر لکھی گئی ہیں،

لیکن افسوس کہ نظیر کے کلام میں ہمواری نہیں ہے، جو نظمیں متانت اور قواعد کے زیور سے آراستہ ہیں، وہ نہایت بلند پایہ ہیں، اور نظیر کی قادر الکلامی پر دلالت کرتی ہیں، لیکن اکثر نظمیں فحش گوئی، ابتذال، رکاکت کے علاوہ بے اصولی اور خلاف قواعد تصرفات کی وجہ سے پایۂ اعتبار سے ساقط ہیں، اور قوافی کی غلطیاں اور غلط الفاظ کا استعمال بکثرت ملتا ہے، اور اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ وہ عوام کی زبان زیادہ استعمال کرتے ہیں، بہرکیف اگر کلیات نظیر کا انتخاب کیا جائے، اور مبتذل مضامین کو خارج کر دیا جائے، تو نہایت نفیس اور کارآمد گلدستہ تیار ہو سکتا ہے، چنانچہ مکتبہ ابراہیمیہ نے "جواہر کلیات نظیر" شائع کی ہے، نمونۂ کلام یہ ہے:

سرشک چشم سے موتی بہت پرو گئے — ولے یہ داغ جگر کے نہ ہم سے دھو گئے
غرور نے تو ہمارے بہت ہی کھینچا سر — پیا کو ہم بھی سدا خاک میں ملو دے گئے
ہماری ان کی رہی عمر بھر یہی صحبت — ادھر وہ ہنستے گئے ہم ادھر سے روتے گئے
ہمارے ایسے ہیں گر کہ پھر سرہانے سے — نہ جاگتے ہی گئے اور کبھی نہ سوتے گئے

نظیر کیا ہی مزا تھا کہ کل خوشی سے ہم
گئے تھے یار کو لینے سو آپ ہی کھوئے گئے

بحر ہی ہیں صحبت احباب — یوں ہے جیسے پڑے ہے آب حباب
بادۂ ناب کب ہے خون جگر — زردی رنگ ہے شب مہتاب
جس کو رقص و سرود کہتے ہیں — وہ بھی ہے ایک ہوئے خانہ خراب

پر اپنا ہوا پردیس اس ہنس نے مارا

. . . .

دیکھا تو اسے جاکے بچے ان سے تو آگاہ | سب ساتھ چلے اس کے وہ مرزند ہو نہ ہوا؟
ہر ایک نے اڑنے کے لئے پنکھ پسارا

. . . .

. . . . . . | دو کوس اڑے تھے کہ ہوئی ماندگی غالب
پھر پر میں کسی کے نہ رہا توت و یارا

کچھ بن نہ سکے ان سے ذینی کے جو واں کام | اور اتنے اڑے ساتھ کہ کچھ ہوش نہ اظہار
جب دیکھی وہ مشکل تو پھر آخر کے تئیں ہار | کوئی یاں رہا کوئی واں رہا کوئی گیا پار
کوئی اور اڑا آگے جو تھا سب میں کرارا

تھی اس کی محبت کی جو ہر ایک نے پی مے | سمجھے تھے بہت دل میں وہ الفت کے بڑی شے
جب ہو گئے بے بس تو پھر آخر یہ ہوئی رے | چیلیں ہیں کوے گدھ اور بیا بھی تھک گئے
اس پہلی ہی منزل میں کیا سب نے کنارا

دنیا کی جو الفت ہے تو اسکی ہے یہ کچھ راہ | جب مشکل آ پڑے تو بھلا کیونکہ ہو نباہ
ناچاری جو جس جا میں تھے واں بیٹھے کہاں جا | سب رہ گئے جو ساتھ کے ساتھی تھے بکھیرا
آخر کے تئیں ہنس اکیلا ہی سدھارا

تبصرہ

زبان | اصلاح زبان کے لحاظ سے یہ دور کچھ اہم نہیں الول تو غیر ارادی طور

پر زبان کی اصلاح ہمیشہ ہوتی ہی رہتی ہے لیکن اس دور میں کوئی خاص کوشش نہیں کی گئی، نظیر کے کلام سے قطع نظر انشا، مصحفی وغیرہ شعرا کے ہاں کثرت سے قدیم الفاظ موجود ہیں مثلاً نت، تک، بھلا رے، ندور، واچھڑے، جھمکڑا وغیرہ۔

انشا نے بہت سے الفاظ استعمال کیے، مگر سنجیدگی سے نہیں، اور یہی وجہ ہے کہ وہ اکثر کرخت اور غیر فصیح ہیں مثلاً ڈونڈ، لُنڈ، مُنڈ، بھنڈ، شنڈ، رُنڈ وغیرہ۔

زبان کے سلسلے میں البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ادائے مطالب کی وسعت بڑھی ہوئی ہے مصحفی کی قادر الکلامی سے ہر قسم کے مطالب کو نہایت صفائی سے ادا کر دیا ہے۔ جرأت کے ہاں بھی صفائی اور سادگی بہت پائی جاتی ہے۔

اسلوب بیان

اسلوب بیان کے لحاظ سے بھی یہ دور زیادہ اہم نہیں ہے، سید انشا اور نظیر اکبر آبادی کے کلام میں ظرافت اور تمسخر کی چاشنی ہے۔ نظیر کی ظرافت اکثر مقامات پر مبتذل ہے لیکن انشا کا تمسخر حد سے بڑھ کر رکاکت تک پہنچ جاتا ہے، مصحفی کے کلام میں متانت اور سنجیدگی ہے لیکن اسلوب بیان وہی ہے جو متقدمین شعرا کا، نظیر اکبر آبادی نے البتہ کئی نئے اسلوب پیش کئے ہیں، جو اس دور کے لئے ہی نہیں، بلکہ ہر آئندہ دور کے لئے باعث فخر ہو سکتے ہیں۔ تنگنائے غزل سے نکل کر انہوں نے ہر قسم کے ملکی، سماجی، اخلاقی مضامین پر طبع آزمائی کی، ان کے کلام کی قدر اگرچہ اس عہد میں نہیں ہوئی، مگر موجودہ عہد میں بہت سے شعرا ان کے ہم زبان ہو گئے ہیں۔

موضوع سخن

نظیر کو چھوڑ کر باقی تمام شعرا کے ہاں اخلاقی مضامین، اور

صوفیانہ خیالات کی کمی معلوم ہوتی ہے۔ رفتہ رفتہ غزل میں ہر رسم کے وہ مضامین آتے جاتے ہیں جن کو غزل سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ وہ غزل کے لئے قطعی ناموزوں معلوم ہوتے ہیں، اگرچہ موضوع سخن عشق کو عاشقی ہے لیکن لطیف جذبات اور احساسات کی کمی ہے، عام طور پر کلام میں ناہمواری اور بے اعتدالی پائی جاتی ہے، کسی رنگ کو اس عہد کا خاص رنگ نہیں کہہ سکتے۔

مقامی خصوصیات اس دور کے شعراء نے خصوصاً نظیر نے ملکی اور مقامی خصوصیات کو زیادہ برتا ہے، مقامی جلوں، میلوں، موسموں اور رسم ورواج وغیرہ کے متعلق کافی نظمیں لکھیں،

ریختی (۱) اگرچہ اردو کے ابتدائی دور میں مولانا ہاشمی بیجاپوری اور حاتم وغیرہ شعراء کے یہاں ریختی کا سراغ ملتا ہے لیکن غور کرنے پر یہ حقیقت واضح ہوتی ہے

(۱) ریختی اس نظم کا نام رکھا گیا ہے جس میں زنانی زبان میں زنانہ جذبات و احساسات نظم کئے جاتے تھے۔ وضح ہو کہ اردو میں مردانی اور زنانی زبان میں شروع سے فرق چلا آتا ہے، جو خاص خاص الفاظ، محاورات عورتوں کے لئے مخصوص ہوتے ہیں، اسی طرح فارسی عطف و اضافت مردوں کے لئے مخصوص ہیں ریختی میں جہاں عورتوں کے مخصوص الفاظ محاورات وغیرہ نظم ہوتے ہیں وہاں فارسی عطف و اضافت اور فارسی و عربی کے عالمانہ الفاظ سے قطعی گریز کیا جاتا ہے،

ریختی کے امام جان صاحب ہوئے ہیں، ان کا نام میر یار علی خاں اور تخلص جان صاحب تھا، لکھنؤ کے رہنے والے تھے، رام پور میں ۱۸۷۶ء میں ان کا انتقال ہوا، ایک دیوان ریختی آپ کی یادگار ہے اگر اس دیوان کو طرح طرح کے خطرناک کانٹوں سے پاک کرکے ایک مختصر انتخاب مرتب کر لیا جائے تو بیگمات کی زبان، ان کے خیالات، جذبات، احساسات، طریقہ بود و باش اور رسم ورواج اور عقائد

کہ وہ ریختی نتیجہ تھی ہندی اثر کا۔ ہندی شاعری کا یہ خاص رنگ ہے کہ اس میں اظہار
عشق جنس لطیف کی طرف سے ہوتا ہے۔ زیادہ تر عورتوں کے جذبات و احساسات
نظم کیے جاتے ہیں۔ چنانچہ ابتدائی دور کی ریختی میں ہوا و ہوس، دل لگی اور ٹھٹھول
کا پتا نہیں۔ پیش نظر ورتیں سعادت یار خاں رنگین اور ان کے دوست سید
انشا نے بقول مصنف؛ "ریختہ کے تئیں چھوڑ کر ایک ریختی ایجاد کی۔"

(آب حیات صفحہ ۱۱۰)

باب ۶

اردو شعر و شاعری کا چوتھا دور (لکھنؤ میں)

تمہید

اب تک جس قدر اساتذہ اردو شاعری میں گذرے، وہ سب دلی کے رہنے والے تھے۔ اگرچہ مصحفی امروہے کے رہنے والے تھے، مگر انہیں بھی دلی سے وہ محبت تھی کہ دہلی کی وطنیت پر فخر کیا کرتے تھے۔ شہر دہلی زبان و ادب کا مرکز تھا۔ بیرونجات کے شعراء زبان و ادب کے معاملات میں اساتذہ دہلی کی تقلید کرتے تھے۔ اہل لکھنؤ میں اب تک کوئی صاحب کمال پیدا نہیں

(بقیہ نوٹ ۱۳۷) وغیرہ کا اچھا خاصا دلچسپ مرقع تیار ہو سکتا ہے۔

موجودہ عہد بھی ریختی گو شعراء سے خالی نہیں۔ چنانچہ رشید صاحب الہ آبادی اسی شاعری
کو ابھی ریختی سے شکستہ کر دیتے ہیں۔ ان کا ایک مجموعہ آرسی کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اس
میں ریختیاں اور قصیدے وغیرہ شامل ہیں۔

ہو، تھا شعرائے لکھنؤ بھی چنانچہ اساتذہ دہلی کو اپنا استاد مانتے تھے، اور انکی تقلید
کا دم بھرتے تھے لیکن اب اساتذہ دہلی ایک ایک کر کے پیوند خاک ہونا شروع
ہوئے، میر، سودا، انشا، مصحفی، جرأت غرض سب میدان زندگی کے ساتھ حر
شعر و ادب سے کنارہ کش ہوئے، میدان صاف تھا اہل لکھنؤ نے صاحب
کمال پیدا کرنے شروع کئے چنانچہ دہلی کی طرح لکھنؤ بھی مرکز سمجھا جانے لگا
اہل لکھنؤ نے صاحب زبانی کا دعویٰ کیا، اور دہلی کی تقلید کا جوا کندھے سے
اتار پھینکا، اور حقیقت یہ ہے، کہ زبان کی اصلاح میں بڑے سلیقے سے کام کیا
لکھنؤ اسکول کے بانی مبانی شیخ امام بخش ناسخ اور خواجہ حیدر علی آتش ہیں۔

شیخ امام بخش ناسخ امام بخش نام، ناسخ تخلص، خدا بخش خیمہ دوز کے بیٹے تھے
سنہ ولادت معلوم نہیں بچپن فیض آباد میں بسر ہوا، جب
لکھنؤ اودھ کا دار الحکومت قرار پایا، تو آپ بھی لکھنؤ چلے آئے، یہاں علوم
متداولہ حاصل کئے اور عربی فارسی میں کمال پیدا کیا، میر تقی میر حیات تھے،
غزل لے کر ان کی خدمت میں پہنچے، میر نے اصلاح کے شرف سے پہلوتہی کی
آپ مایوس ہو کر واپس آئے، اور خود ہی لکھتے اور خود ہی اصلاح کرتے تھے
بعض لوگوں کا خیال ہے، کہ میر کے انکار کے بعد مصحفی اور تنہا سے مشورہ سخن
کیا تھا

کہتے ہیں، کہ جب ناسخ لکھنؤ پہنچے، تو وہاں میر کاظم علی ایک رئیس تھے،
انہوں نے ان کو اپنا فرزند بنا لیا، وہ مرے تو آپ ہی حاصی دولت حیثیت نام کی
روپے انکو ملی، پھر کیا تھا، ٹکسال میں مکان لیا، اور فارغ البالی سے بسر اوقات

گزر گیا ہے۔ آپ نے ایک مثنوی "نظم سراج" تصنیف کی جو مشہور نہیں ہوئی۔
ناسخ کی شہرت زیادہ تر ان کی غزلیات کی وجہ سے ہے۔ تاریخ گوئی میں بھی
ناسخ کو کمال حاصل تھا چنانچہ سینکڑوں تاریخیں دیوانوں میں موجود ہیں۔

غزلیات میں ناسخ کا رنگ گذشتہ تمام شعراء سے مختلف ہے۔ سب
سے پہلی خصوصیت ان کے کلام کی یہ ہے کہ اغلاط اور عیوب سے قطعی پاک
ہے۔ قواعد اور اصول کی بڑی سختی سے پابندی کی گئی ہے، اور اس پابندی
کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ کلام پھیکا اور بے مزہ ہو گیا ہے، جذبات اور احساس کا
حسن پامال ہو کر منظور ہے لیکن بے قاعدگی اور بے اصولی گوارا نہیں، اور
یہ پھیکا پن ان کے کلام کی دوسری خصوصیت ہو سکتی ہے۔

کلام میں تشبیہات اور استعارات کی بہتات سے، نازک خیالی مضمون
آرائی اور بلند پروازی کو دور از کار تشبیہ اور استعارے کے پیچ میں الجھا کر بے
اثر اور بے کیف کر دیئے ہیں۔ کلام میں مبالغہ بے اثری کی حد سے گذر کر
بعض اوقات دردسری تک پہنچ جاتا ہے۔ اخلاقی مضامین کو نیم منطقی دلیل
تمثیل حسن تعلیل اور بعض اوقات نقلی ہیر پھیر سے اس طرح ثابت کرتے
ہیں کہ ان میں اثر مطلق نہیں رہتا۔ خارجی مضامین زیادہ پائے جاتے ہیں۔
مختصر یہ کہ باقاعدگی تصنع، مبالغہ، بے اثری اور ابہام ناسخ کے کلام کی خصوصیات
ہیں۔ علاوہ ازیں فارسی اور عربی کے ثقیل الفاظ سے کہیں کہیں کلام میں عدم
بے ہوئی پیدا ہو گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ خصوصیات شعر و شاعری کے مقصد کے
منافی ہیں، لیکن اس امر کو فراموش نہیں کر دینا چاہیئے کہ ناسخ ارتقاء و اصلاح

زبان کی تاریخ میں سنہرے صفحات کے مستحق ہیں اردو زبان ان کے احسانات سے تا قیامت سبکدوش نہیں ہو سکتی،

ناسخ نے زبان اردو پر جو احسانات کئے ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) فارسی، عربی اور ہندی الفاظ کے لئے تذکیر و تانیث کے قاعدے مقرر کئے۔

(۲) ثقیل اور بدنما الفاظ و محاورات کو ترک کر کے لطیف و فصیح الفاظ اور محاورات رائج کئے مثلاً "ٹک" کی بجائے "ذرا" "نیٹ" کی بجائے "بہت" "تجھ سوا" کے بجائے "تیرے سوا" وغیرہ،

(۳) ثقیل اور بھونڈے ہندی الفاظ کو ترک کیا، فارسی اور عربی الفاظ زیادہ استعمال کئے جس سے زبان میں وسعت پیدا ہو گئی ہے،

(۴) غلط افعال کو ترک کیا مثلاً کاہلی سے کہلانا وغیرہ متروک قرار دیے،

(۵) غزل میں عاشقانہ مضامین کے علاوہ اور اور مضامین شامل کئے اور آئندہ ترقیوں کے لئے میدان صاف کر دیا،

(۶) فحش، مبتذل اور عامیانہ الفاظ ترک کر دیئے، اور غزل میں متانت اور سنجیدگی کی بنیاد قائم کی۔

اب نمونہ کلام ملاحظہ ہو،

یہ نور ہے رخ مہ جبیں کا کہ ہو خجل چاند چودھویں کا
جو حلقہ ہے زلف عنبریں کا وہ ایک نافہ ہے مشک چیں کا
زبسکہ وصف دہان تیرے بر رہا ہے وہ دہ زبان شیریں

بدن میں جب تک ہے جان شیریں مزا دہن میں ہے انگبیں کا

وہ چشم خال ہے غیرت گل وہ زلف پیچاں ہے رشک سنبل

صفا میں ہے شباہت گل بدن میں ملاحت یاسمیں کا

یہ جوش پر یاں ہے اشک کا لم کہ ساتوں دریا ہیں قطرے سے کم

جسے کہ کہتے ہیں سب جہنم شرر ہے اک آہ آتشیں کا

اگر ہو پہنچا پر سمندر یقیں ہے ہو خاک دم میں جل کر

سنا جو ہو آفتاب محشر گھمنڈ ہے داغ آتشیں کا

زبس کہ ہے جوش داغ ہجراں ہوا ہے سینہ یہ باغ رضواں

برائے گلگشت جائے غلماں خیال پھرتا ہے اک حسین کا

یہ ساعد دل کا ہے اس کے عالم کہ جس نے دیکھا ہوا دم لے

نیام تیغ قضا کے محرم لقب ہے قاتل کی آستیں کا

بلا ہو بدبخت عاشقی کا نہ دیں ہو برباد یوں کسی کا!

بنا ہے عشق بتاں کا ٹیکا نشان سجدہ میری جبیں کا

طمع ہے انصاف دوستاں سے کہ اتنا فرمائیں سب زباں سے

کیا ہے ناسخ نے آسماں سے بلند رتبہ اس زمیں کا

دم بلبل اسیر کا تن سے نکل گیا — جھونکا نسیم کا جو نہی سن سے نکل گیا

لایا وہ ساتھ غیر کو میرے جنازہ پر — شعلہ سا ایک جیب کفن سے نکل گیا

ساقی بغیر شب جو پیا آب آتشیں — شعلہ وہ بن کے میرے دہن سے نکل گیا

اب کی بہار میں یہ ہوا جوش اے جنوں — سارا لہو ہمارے بدن سے نکل گیا

اس رشک گل کے جاتے ہی بس آگئی خزاں — ہر گل بھی ساتھ ہو کے چمن سے نکل گیا

اہل زمیں نے کیا ستم تو کیا کوئی — نالہ جو آسمان کہن سے نکل گیا

سنسان مثل وادیٔ غربت ہے لکھنؤ
شاید کہ ناسخ آج وطن سے نکل گیا

مرتبہ کم حرص رفعت سے ہمارا ہو گیا — آفتاب ایسا ہوا اونچا کہ تارا ہو گیا

ہے تصور نوک مژگاں کا جو ہر دم سامنے — دیدۂ گریاں ہمارا اب ہزارا ہو گیا

باعث چاک کتاں ہوتا ہے جلوہ ماہ کا — واں چھپا وہ ماہ یاں دل پارا پارا ہو گیا

ایک درہم اور دو افلاس گنج قاروں میں ملا — پس ایسا میرے طالع کا ستارہ ہو گیا

بے ثباتی جو ہوئی عالم کی ثابت اے فلک — آفتاب اپنی نظر میں اک شرارا ہو گیا

ختم ہے جادوگری تم پر کلے چشمان یار
ناسخ جادو بیاں عاشق تمہارا ہو گیا

شاگردانِ ناسخ یوں تو سینکڑوں موزوں طبع شیخ امام بخش ناسخ کے دامن تربیت میں پرورش پا کر شاعر ہوئے، اور آدھے سے زیادہ لکھنؤ آپ کا معتقد تھا، مگر چند شاگرد صاحب دیوان اور فخر استاد ہوئے۔

خواجہ وزیر خواجہ محمد وزیر نام، وزیر تخلص، لکھنؤ کے رہنے والے تھے، پہلے خواجہ آتش سے مشورۂ سخن کرتے تھے، پھر ناسخ کے شاگرد ہوئے، نازک خیال اور قادر الکلام شاعر تھے، شیخ صاحب بھی ان کی شاگردی پر فخر کرتے تھے ۱۸۵۴ء میں آپ کا انتقال ہوا۔

میر علی اوسط رشک

پورا نام و لقب والا جاہ میر علی اوسط اور رشک تخلص ہے، لکھنؤ میں نشو و نما ہوا، ایک ضخیم دیوان آپ کی یادگار ہے، تاریخ میں ید طولیٰ حاصل تھا، ۱۸۶۷ء میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

برق

مرزا محمد رضا خاں نام اور برق تخلص تھا، واجد علی شاہ اختر کے مصاحب اور استاد تھے، بہت پرگو اور قادر الکلام شاعر تھے، ۱۸۵۷ء میں جہان فانی سے کوچ کیا۔

بحر

شیخ امداد علی نام اور بحر تخلص تھا، صحت الفاظ، تحقیق لغت اور فن عروض میں مشہور تھے، تمام عمر عسرت اور تنگی میں بسر ہوئی، نواب کلب علی خاں والی رامپور نے شہرہ سنکر بلا بھیجا اور عزت افزائی فرما کر تنخواہ مقرر کر دی، آخر وقت میں وطن یاد آیا، دربار سے رخصت ہو کر لکھنؤ واپس چلے آئے، آخر ۱۸۸۲ء میں رحلت فرمائی۔

منیر شکوہ آبادی

سید اسمٰعیل حسین نام، منیر تخلص، شکوہ آباد کے رہنے والے تھے، پہلے نواب باندہ کی سرکار میں ملازم تھے، غدر کے بعد نواب صاحب رامپور نے قدر افزائی فرمائی، آخر ۱۸۸۱ء میں انتقال ہوا، غزلیات میں وہی رنگ ہے جو ناسخ کا، مثنوی بھی لکھی لیکن وہ بھی اسی رنگ کی، البتہ قصاید ان کے بہت دھوم دھام کے ہیں، سودا اور ذوق کے بعد ان ہی کے قصیدوں پر نظر پڑتی ہے۔

خواجہ حیدر علی آتش

خواجہ حیدر علی نام، اور آتش تخلص تھا، آباؤ اجداد دہلی کے رہنے والے تھے، نواب شجاع الدولہ کے عہد میں ان کے والد خواجہ علی بخش فیض آباد پہنچے، آتش وہیں پیدا ہوئے ابھی جوان بھی نہ ہونے پائے تھے، اور تعلیم بھی خوب نہ ہوئی تھی، کہ سایۂ پدری سر سے اٹھ گیا، ابتدائی عمر زیادہ تر فوج کے لڑکوں میں گزری جس کی وجہ سے آپ بانکے اور شورہ پشت ہو گئے تھے۔

نواب محمد تقی کے ہمراہ لکھنؤ پہنچے، تو یہاں جرأت، انشا، مصحفی کا دور دورہ تھا، گھر گھر شاعری کا چرچا تھا، ان کو بھی شعر و سخن کا شوق پیدا ہوا مصحفی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا، اور کثرت مشق سے خود استاد ہو گئے

علمی استعداد معمولی تھی لیکن بزرگوں کی صحبت اور مصحفی کی استادی نے شاعری کی ضروریات سے واقف کر دیا تھا، اصناف سخن میں غزل کے سوا اور کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا، زبان کی تراش خراش، صفائی اور پاکیزگی میں اتنی کوشش کی کہ اپنے وقت کے مسلم الثبوت استاد ہو گئے۔

اسی روپے مہینہ بادشاہ کے یہاں سے ملتا تھا، شاگردوں یا امیروں میں سے کوئی سلوک کرتا، تو انکار نہ تھا، باپ دادا سے توکل ترکہ میں پایا تھا اور ہوش سنبھالتے ہی بانکپن اور شورہ پشتی کی تعلیم ملی تھی، یہ دونوں باتیں بڑھاپے تک قائم رہے۔

گیروا تہبند باندھتے تھے، ڈنڈا ہاتھ میں رہتا تھا، سپاہیانہ کام کا سلیم شاہی جوتا پاؤں میں، ڈنڈے میں ایک چھلا سونے کا لگا رہتا، دوسرے تیسرے واقعہ

کی حالت میں چلا رہن رکھ کر فاقہ کشی کرتے بھنگ پیتے کاٹ کر زندگی بسر رہا۔

لکھنؤ میں نخاس گنج کے قریب ایک کچا مکان خرید لیا تھا اسی میں رہتے تھے، شادی بھی کر لی تھی ایک بیٹا تھا محمد علی آتش۔ بیوی کے مرنے کے بعد آنکھوں کی بینائی بھی جاتی رہی تھی۔

اخیر زمانے میں معلی حال کی سرپرستی میں اٹھ آئے تھے، داڑھی ڈھلی تھی، اس پر مہندی کا خضاب کیا کرتے تھے مگر وضعداری کی دوسری باتوں میں کوئی فرق نہیں آیا، وہی رندانہ مزاج، وہی فقر و فاقہ، ایک ٹوٹے کھٹولے پر بیٹھے رہتے تھے، سامنے حقہ رکھا رہتا تھا، کوئی امیر یا غریب آتا اس کے سامنے وہی ٹوٹا ہوا حقہ پیش کیا جاتا، آخر اسی فقر و فاقہ میں ۱۸۴۷ء میں قفس عنصری سے آزاد ہوئے، میر دوست علی خلیل نے تجہیز و تکفین کی۔

ایک دیوان مکمل اور ایک تتمہ ان کی یادگار ہے، دیوان میں غزلیات کے سوا اور کچھ نہیں۔

آپ ناسخ کے معاصر ہیں، اور کبھی کبھی ان سے نوک جھونک بھی ہو جاتی تھی لیکن مصحفی اور انشاء کی طرح ہجو تک نوبت نہیں پہنچی۔

زبان اردو کی اصلاح میں جو مرتبہ ناسخ کو حاصل ہے، وہی خواجہ صاحب کو بھی حاصل ہے، ناسخ نے اصول مرتب کئے، آتش نے صفائی اور محاورہ اور روزمرہ کا بہترین صرف کیا، ناسخ کے خلاف آتش کے ہاں ثقیل الفاظ بہت کم ہیں یعنی ان کے کلام میں فصاحت زیادہ ہے۔

نازک خیالی اور بلند پروازی میں ناسخ بہت بلند ہیں لیکن سوز و گداز

معانی و ماخذ کے لحاظ سے آتش کا کلام بہتر ہے کہیں کہیں اخلاقی مضامین پائے جاتے ہیں اور تصوف کی چاشنی بھی مزا دے جاتی ہے،

اس دور کے عام رنگ یعنی تصنع سے آتش کا کلام قطعی پاک نہ رہ سکا، خارجی اور سطحی مضامین بھی ان کے ہاں بکثرت ملتے ہیں کلام میں [illegible] عامیانہ مضامین اور حسن کے خارجی واردات کی تعریف سے کہیں کہیں کلام میں پستی آ جاتی ہے۔ غلط الفاظ کا استعمال بھی کہیں کہیں نظر سے گذرتا ہے مثلاً المضاعف بجائے المتضاعف، حلوہ بجائے حلوا وغیرہ استعمال کئے ہیں،

اس کو علمی استعداد کی کمی سمجھئے یا کچھ اور۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا — کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا

کیا کیا الجھتا ہے تری زلفوں کے تار سے — بخیہ طلب ہے سینۂ صد چاک شانہ کیا

زیر زمیں سے آتا ہے جو گل سو زر بکف — قاروں نے راستے میں لٹایا خزانہ کیا

اڑتا ہے شوق راحت منزل سے اسپ عمر — مہمیز کس کو کہتے ہیں اور تازیانہ کیا

زینہ صبا کا ڈھونڈتی ہے اپنی مشت خاک — بام بلند یار کا ہے آستانہ کیا

چاروں طرف سے صورت جاناں ہو جلوہ گر — دل صاف ہو ترا تو ہے آئینہ خانہ کیا

صیاد اسیر دام رگ گل ہے عندلیب — دکھلا رہا ہے چھپ کے اسے آب و دانہ کیا

طبل و علم ہی پاس ہے اپنے نہ ملک و مال — ہم سے خلاف ہو کے کرے گا زمانہ کیا

آتی ہے کس طرح سے مری قبض روح کو — دیکھوں تو موت ڈھونڈ رہی ہے بہانہ کیا

ہوتا ہے زرد سن کے جو نامرد مدعی — رستم کی داستاں ہے ہمارا فسانہ کیا

بے یار سازگار نہ ہوگا وہ گوش کو — مطرب ہمیں سناتا ہے اپنا ترانہ کیا

صیاد گلعذار دکھاتا ہے سیر باغ　　بلبل قفس میں یاد کرے آشیانہ کیا

ترچھی نظر سے طائر دل ہو چکا شکار　　جب تیر کج پڑے گا اڑے گا نشانہ کیا

بیتاب ہے کمال ہمارا دل حزیں　　مہمان سرائے جسم کا ہوگا روانہ کیا

یاں مدعی حسد سے نہ دے داد تو نہ دے
آتش غزل یہ تو نے کہی عاشقانہ کیا

خموشی سے اپنی رسوائی گھٹا ہو نہیں سکتی　　گریباں پھاڑتا ہے تنگ جب دیوانہ آتا ہے

بگولے کیطرح کس کس خوشی سے ناچتا ہوں　　تلاش گنج میں جو سامنے ویرانہ آتا ہے

طلب دنیا کو کرکے زن مریدی ہو نہیں سکتی　　خیال آبرو ہے ہمت مردانہ آتا ہے

تماشا گاہ ہستی میں عدم کا دھیان ہے کس کو　　کسے اس انجمن میں یاد خلوت خانہ آتا ہے

زیارت ہوگی کعبہ کی یہی تعبیر ہے اس کی　　کئی شب سے ہمارے خواب میں بتخانہ آتا ہے

شباب لطف جمع خاطر و ہر صحبت کے راضی ہیں　　حکایت سے نہیں واقف ہمیں شکرانہ آتا ہے

خدا کا گھر ہے بتخانہ ہمارا دل نہیں آتش
مقام آشنا ہے یاں نہیں بیگانہ آتا ہے

فریب حسن سے گبرو مسلماں کا چلن بگڑا
خدا کی یاد بھولا شیخ بت سے برہمن بگڑا

تری تقلید سے کبک دری نے ٹھوکریں کھائیں
چلا جب جانور انساں کی چال اس کا چلن بگڑا

وہ بدخو طفل اشک اے چشم تر ہیں دیکھنا اک دن
گھروندے کی طرح سے گنبد چرخ کہن بگڑا

کسی کی جب کوئی تقلید کرتا ہے میں روتا ہوں
ہنسا گل کی طرح غنچہ جہاں اُس کا دہن بگڑا

ملا دو میرے کھانے کا نہ اے زاغ و زغن کچھ
وہ کشتہ ہوں جسے سونگھے سے کتوں کا بدن بگڑا

امانت کی طرح رکھا زمیں نے روزِ محشر تک
نہ اک مو کم ہوا میرا نہ اک تارِ کفن بگڑا

لگے منہ بھی چڑھانے دیتے دیتے گالیاں صاحب
زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجے دہن بگڑا

بناوٹ کیفِ مے سے کھل گئی اس شوخ کی آتش
لگا کر منہ سے پیمانہ کو وہ پیماں شکن بگڑا

شاگردانِ آتش

شاگردانِ آتش میں یوں تو میر دوست علی خلیل، صاحب مرزا شناور، میر وزیر علی صبا، نواب محمد علیخاں رند، نواب مرزا شوق بڑے بڑے نامور شعرا اور استاد گزرے ہیں لیکن ہم یہاں صرف پنڈت دیا شنکر نسیم کا تذکرہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

نسیم لکھنوی

پنڈت دیا شنکر کول نام، نسیم تخلص، لکھنؤ کے کشمیری برہمن تھے۔ سالِ ولادت سنہ ۱۸۱۱ء ہے۔ آپ کے والد کا نام منشی گنگا پرشاد کول تھا۔ عام دستور کے موافق اردو فارسی کی تعلیم عالمِ صغر سنی میں پائی۔ شعرائے اردو کا کلام برابر نظر سے گذرتا رہا۔ شعر و شاعری کی طرف طبیعت مائل ہوئی تو خواجہ حیدر علی آتش کے شاگرد ہوئے۔

نسیم پستہ قامت، گندمی رنگ، سیہ چشم اور چھریرے بدن کے آدمی تھے سلسلہ معاش یہ تھا کہ شاہی فوج میں وکیل تھے، مزاج میں ظرافت، اور بذلہ سنجی بھی تھی، مگر افسوس کہ یہ چہچہاتا ہوا بلبل عین عالم شباب میں بعمر ۳۲ سال ۱۸۴۳ء میں دفعتہ خاموش ہو گیا۔

ایک مختصر دیوان غزلیات کا، اور ایک مثنوی گلزار نسیم آپکی یادگار رہے غزلیات میں استاد آتش کا رنگ بہت کچھ نمایاں ہے۔ زبان کی صفائی اور فصاحت ہر جگہ جلوہ گر ہے، اگرچہ کلام میں اس دور کی کل خصوصیات مثلاً تصنع، تناسب لفظی وغیرہ پائی جاتی ہیں، لیکن نسیم کا کلام قطعی بے نمک نہیں،

نسیم کی شہرت ان کی غزلیات کی وجہ سے نہیں، بلکہ گلزار نسیم کی وجہ سے ہے، اہل لکھنؤ خصوصاً اور اردو دان ہندوستانی عموماً اس مثنوی کو جسقدر قدر کریں بجا ہے، شمالی ہند کی مایہ ناز مثنوی سحر البیان کے بعد جس مثنوی کا نظر پڑتی ہے، وہ گلزار نسیم ہی ہے، اس میں گل بکاؤلی کا قصہ نظم ہوا ہے جو پہلے نثر میں تھا۔

گلزار نسیم کا خاص جوہر ایجاز و اختصار ہے، یہاں تک کہ اگر کہیں سے ایک شعر بھی حذف کر دیا جائے، تو تسلسل قائم نہیں رہ سکتا، کلام میں پختگی ہے معمولی سے معمولی بات بھی رعایت لفظی اور صنائع بدائع کی نقش طرازیوں سے خالی نہیں، لیکن باوجود ان لایعنی تکلفات کے نسیم نے واقعہ نگاری، مصوری جذبات نگاری، لطافت و متانت، روانی و برجستگی کا حق ادا کر دیا ہے نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

آوارہ ہونا بکاؤلی کا تاج الملوک کی تلاش میں

گل کا جو الم چمن چمن ہے
یوں بلبل خامہ نعرہ زن ہے

گلچیں نے وہ پھول جب اڑایا
اور غنچۂ صبح کھلکھلایا

وہ سبزۂ باغ خواب آرام
یعنی وہ بکاؤلی گل اندام

جاگی مرغ سحر کے غل سے
اٹھی نکہت سی فرش گل سے

منہ دھونے کو آنکھ ملتی آئی
پایاب وہ چشم حوض پانی

دیکھا تو وہ گل ہوا ہوا ہے
کچھ اور ہی گل کھلا ہوا ہے

گھبرائی کہ ہیں کدھر گیا گل!
جھنجھلائی کہ کون دے گیا جل

ہے ہے مرا پھول لے گیا کون
ہے ہے مجھے خار دے گیا کون

ہاتھ اس پہ اگر پڑا نہیں ہے
بو ہو کے تو پھول اڑا نہیں ہے

نرگس تو دکھا کدھر گیا گل!
سوسن تو بتا کدھر گیا گل!

سنبل میرا تازیانہ لانا
شمشاد انہیں سولی پر چڑھانا!

تھرائیں جو اصیلیں صورت بید
ہر ایک سے پوچھنے لگی بھید

نرگس نے نگاہ ہاریاں کیں
سوسن نے زباں درازیاں کیں

چلا سی چتے کر جب نہ پایا
کہنے لگیں کیا ہوا خدایا!

آنکھوں میں سے پھول لے گیا کون
بیگانہ تھا سبزے کے سوا کون

شبنم کے سوا چرانے والا
اوپر کا تھا کون آنے والا

جس کف میں وہ گل ہو داغ ہو جائے
جس گھر میں وہ گل چراغ ہو جائے

بولی وہ بکاؤلی کہ افسوس — غفلت نے یہ پھول پر تری اوس

آنکھوں سے عزیز گل مرا تھا — پتلی وہی چشم حوض کا تھا

نام اس کا صبا نہ لیتی تھی میں — اس گل کو ہوا نہ دیتی تھی میں

گلچیں کا جو ہلتے ہاتھ ٹوٹتا — غنچہ کے بھی منہ سے کچھ نہ ہوتا

او خار چبھا نہ تیرا چنگل! — مشکیں کس لیں نہ تو نے سنبل!

او باد صبا ہوا نہ بتلا — خوشبو ہی سنگھا پتا نہ بتلا

بلبل تو چہک اگر خبر ہے — گل تو ہی مہک بتا کدھر ہے

لرزاں تھی زمیں یہ دیکھ کہرام — تھی سبزے سے یاس مو بر اندام

انگلی لب جو پہ رکھ کے شمشاد — تھا محو دعا کی سن کے فریاد

جو نخل تھا سوچ میں کھڑا تھا — جو برگ تھا ہاتھ مل رہا تھا

رنگ اس کا غش لگا بدلنے — گل برگ سے کف لگی وہ ملنے

بدلے کی انگوٹھی ڈھیلی پائی — دست آور اس کے ہاتھ آئی

خاتم تھی نام کی نشانی! — انساں کی دست برد جانی

ہاتھوں کو ملا کہا کہ ہیہات — خاتم بھی بدل گیا ہے بد ذات

جس نے مجھے ہاتھ ہے لگایا — وہ ہاتھ لگے کہیں خدایا

عریاں مجھے دیکھ کر گیا ہے — کھال اسکی جو کھینچیے سزا ہے

یہ کہہ کے جنوں میں ہو غضبناک — خون روئی لباس کو کیا چاک

گل کا سا ہوا جو چاک گریباں — سبزے کا سا تار تار داماں

دکھلا کے کہا سمن پری کو — اب چین کہاں بکاؤلی کو

تھی بسکہ غبار سے بھری وہ — آندھی سی اٹھی ہوا ہوئی وہ
کبھی تھی پری کہ اڑ کے جاتی — گلچیں کا کہیں پتہ لگاتی
ہر باغ میں پھولتی پھری وہ — ہر شاخ پہ جھولتی پھری وہ
جس تختہ پہ مثل باد جاتی — اس رنگ کے گل کی بو نہ پاتی

بے وقت کسی کو کچھ ملا ہے
پتا نہیں حکم بن ہلا ہے

پابزنجیر ہونا بکاؤلی کا سودائے فراق تاج الملوک میں

سودائے الم ہے اب جو تحریر — حرفوں سے قلم ہے پا بزنجیر
حیران وہ دم بخود تھی رہتی — کچھ کہتی تو ضبط سے تھی کہتی
گھٹتی تھی جو ہوک پیاس بس میں — آنسو پیتی تھی کھا کے قسمیں
جلنے سے جو زندگی کے تھی تنگ — گرگٹ کے عوض بدلتی تھی رنگ
کچھ چند جو گزرے بے خور و آب — زائل ہوئی اس کی طاقت و تاب
صورت میں خیال رہ گئی وہ — ہیئت میں مثال رہ گئی وہ
آنے لگے بیٹھے بیٹھے چکر — فانوس خیال بن گیا گھر
پریاں جو انیس و پاسباں تھیں — دانا و عقیل و خوش بیاں تھیں
سمجھانے لگیں کہ مرنی ہے یوں — ترک خور و خواب کرتی ہے کیوں
شامت کچھ اثر ستارے کا ہے — اس چاند کو کیا گہن لگا ہے
رحم اپنی جوانی پر ذرا کر! — منہ دیکھ تو آئینہ منگا کر!

صورت تیری نار ہو گئی ہے ‌ ‌ ‌ گل ہو گئے تو خار ہو گئی ہے

ہے ہے تیری عقل کس نے کھوئی ‌ ‌ ‌ نا جنس کو چاہتا ہے کوئی

سہتی نہیں آگ ماہی تر ‌ ‌ ‌ رہتا نہیں پانی میں سمندر

مذکور نہیں ہے کچھ حسد کا ‌ ‌ ‌ ساتھی نہیں کوئی کار بد کا

روشن ہے جو کچھ کیا ہے اندھیر ‌ ‌ ‌ یہ پھیر اپنی سمجھ سمجھ کا ہے پھیر

محبوس کیا ہے تجھ کو ہر چند ‌ ‌ ‌ توبہ کا تو در نہیں کیا بند

بھولے سے بھی کر نہ یاد آدم ‌ ‌ ‌ پھر گھر وہی تو وہی وہی ہم

اے شمع نہ سوچ گر بد و نیک ‌ ‌ ‌ رشتہ کہاں لگے گا تجھ سے سرا ایک

سمجھانے سے تھا ہمیں سروکا ‌ ‌ ‌ ایمان نہ مان تو ہے مختار

تو قید جفا میں ہے کہ ہم ہیں ‌ ‌ ‌ تو دام بلا میں ہے کہ ہم ہیں

غم راہ نہیں کہ ساتھ دیجے ‌ ‌ ‌ دکھ بوجھ نہیں کہ بانٹ لیجے

جھنجھلا کے بکاؤلی نے بس بس ‌ ‌ ‌ اب یک کہو گی تم تو میں دس

رنجور جو ہوں تو میں تمہیں کیا ‌ ‌ ‌ مجبور جو ہوں تو میں تمہیں کیا

مانا میری حالت اب بدی ہے ‌ ‌ ‌ بہتر ہے وہی جو کچھ بدی ہے

بلبل اسی رشک گل کی ہو تمیں ‌ ‌ ‌ تم کیا ہو ہزار میں کہوں میں

سوچیں وہ کہ یہ نہیں سمجھتی ‌ ‌ ‌ ہے بلا یہ رنگ زلف الجھتی

مجنوں ہوا گر تو فصد لیجے ‌ ‌ ‌ سایہ ہو تو ڈھونڈ دھوپ لیجے

کچھ روگ جو درپے خلش ہو ‌ ‌ ‌ درماں کے لئے دوا و دوش ہو

بیماری عشق لا دوا ہے ‌ ‌ ‌ اس باغ کی اور ہی ہوا ہے

آخر یہ تو جی سے اپنے ہے تنگ — ایسا نہ ہو لائے اور کچھ رنگ

یاد آئیں جو ابروانِ خمدار — پھر جائے نہ کہیں گلے پہ تلوار!

وہ سبزۂ خط جو یاد آئے — جھنجھلا کے کہیں نہ زہر کھائے

گر یاد کہیں چاہِ ذقن کو — کود پڑے نہ کنوئیں میں باؤلی ہو

دیوانے کی مطلق العنانی — ہے باعثِ مرگِ ناگہانی

تدبیر کا جو صلہ نکالا! — زنجیر کا سلسلہ نکالا!

بیڑی تھی رخِ خوشی پاؤں میں — پابوسیٔ گل کو آیا سنبل!

جب وحشتِ عشق ہو زیادہ — زنجیر ہو بس پہ ستادہ

شوریدہ بکاؤلی تصدق تھی — زنجیر قدم بھی وہ کب تھی

بڑھتی جب دل کی بیقراری — پڑھتی یہ غزل بہ آہ و زاری

غزل

عالم کا ترے جمال بیاں ہے — شیدائی دو جہاں جہاں ہے

زنجیرِ جنوں کڑی نہ پڑ جو — دیوانے کا پاؤں درمیاں ہے

ذرے کا بھی چمکے گا ستارہ — قائم جو زمین و آسماں ہے

جو داغ کہ صورتِ قمر پر — دل میں میرے اب تلک نہاں ہے

کس سوچ میں اے نسیم ہو تم!
آنکھیں تو ملاؤ دل کہاں ہے

غزل کے دو شعر ملاحظہ ہوں:-

جب نہ جیتے جی میرے کام آئیگی — کیا یہ دنیا عاقبت بخشائے گی

جان نکل جائے گی تن سے اے نسیم
گل کو بوئے گل ہوا بتلائے گی

باب ۔ ۷

اردو شعر و شاعری کا چوتھا دور (لکھنؤ میں) ضمیمہ

مرثیہ اور شعرائے مرثیہ گو

مرثیہ اس نظم کو کہتے ہیں جس میں کسی کی موت پر اظہار غم کیا جائے، اور مرحوم کے اوصاف اس طرح بیان کئے جائیں، کہ سننے والوں کے دل میں بھی غم و الم کا دریا موجزن ہو جائے۔ ان معنوں میں اردو میں کئی مرثیوں نے شہرت عام و بقائے دوام حاصل کی ہے، مثلاً غالب کا مرثیہ عارف کی موت پر، حالی کا مرثیہ غالب کی موت پر، اور مومن کا مرثیہ اپنی محبوبہ کی موت پر۔

لیکن اردو میں مرثیہ مع اپنی جملہ خصوصیات کے ایک خاص اصطلاحی معنوں میں سمجھا جانے لگا یعنی اس نظم کو مرثیہ کہنے لگے، جس میں امام حسین کی شہادت اور ان کے اہل و عیال کے مصائب کا ذکر کر کے عزاداری کی جائے۔

اس باب کا موضوع بحث یہی مرثیہ ہے۔

ارتقائے مرثیہ صنف مرثیہ نگاری اردو شعر و شاعری کے ساتھ ہی عالم وجود میں آئی۔ باب دوم کے آخر میں مرثیہ کی ابتداء کے متعلق عرض کیا جا چکا ہے، یہاں اس کا اعادہ کرنا چنداں ضروری نہیں۔

البتہ اتنا ضرور ہے کہ نوری، ہاشم علی برہانپوری اور قطب شاہ کے بعد دکن میں ہر شاعر مرثیہ گوئی کو ثواب اخروی اور نجات دارین کا ذریعہ سمجھتا تھا، اور بطور توشہ آخرت تھوڑا بہت ضرور کہہ لیا کرتا تھا۔

شمالی ہند میں ابتدائی شعراء کے ہاں مرثیہ کا سراغ نہیں ملتا۔ البتہ فضلی نے ۱۷۳۲ء کے لگ بھگ "روضۃ الشہداء" کا اردو میں ترجمہ کیا۔ اس میں ان کی ایک مسلسل نظم درج ہے جس میں حضرت فاطمۃ الکبریٰ کے جذبات کی ترجمانی کی ہے، چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

یہ کیا ہوا ہے پیر الٰہا میرا ہے اے لوگو — دولہا کو سوہائی نہ مہندی ہو موت سہائی
لاشے کے تئیں ملیے کہاں اے میرے نوشہ — تو مر گیا اور میرے تئیں موت نہ آئی
اے میرے بنے تیری یہی تیرے بنا ہے — کفنی گلے میں ڈال کرے کی یہ گدائی
اے میرے بنے ساس کوں مت کر یاد کہاں — دل میں لگی کیسی یہ دو بیرا کہے آئی

فضلی کے بعد میر تقی میر نے بھی مرثیہ لکھا، مگر وہ ان کے شان کے شایاں نہ تھا، اس وجہ سے ان کے کلیات میں جگہ نہ پا سکا، بطور نمونہ ایک بند ملاحظہ ہوں:-

دلوں پر محبوں کی حالت عجب ہے — مصیبت کے ہم ہے غم بے سبب ہے
غرض کیا لکھوں کس و تن کا غضب ہے — حسین علی کی شہادت کی شب ہے

محبوں نے دل سے خوشی سب بھلا دی ہے — ہر اک گھر میں ماتم کی مجلس رچی ہے
عجب طرح کی واں سے ویلا مچی ہے — کہ روز قیامت کی گویا یہ شب ہے

کوئی دل نہیں جس کو ماتم نہ ہوئے گا — وہ دل جو ہے جس میں یہ غم نہ ہوئے گا

یہ دن کچھ قیامت سے بھی کم نہ ہووے گا   قیامت میں یہ کچھ نہ ہوگا جواب ہے

اس وقت تک جو کچھ لکھا گیا، اس کو بہ نظر غور دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شعرا نے اس صنف کو کبھی ادبی اہمیت نہیں دی، محض مذہبی فریضہ سمجھ کر جو کچھ ہو سکا لکھ لیا اور مجالس عزا میں پڑھ کر ثواب اخروی حاصل کر لیا۔ "غلط الفاظ غلط محاورات، خلاف روزمرہ، عروض و قافیہ کی فروگذاشتیں بہ کثرت پائی جاتی ہیں، کسی سخن فہم کو مذہبی عظمت کے خیال سے ان فروگذاشتوں پر اعتراض کرنے اور ان مراثی کی تنقیص کرنے کی ہمت نہ پڑتی تھی لیکن دبی زبان سے اتنا ضرور کہہ دیا کرتے تھے کہ بگڑا شاعر مرثیہ گو" اور شعرا تو خیر ایک طرف میر سے قادر الکلام نے بھی اس زمین کو کچھ بلند نہ کیا۔

سب سے اول سودا نے اس صنف کی ادبی اہمیت دریافت کی، اور ان کے کارناموں کے بعد مرثیہ جو اب تک حصول ثواب کے لئے کہا جاتا تھا مقتضیات شاعری کے ہم عنان ہو کر ترقی کے منازل طے کرنے لگا چنانچہ وہ اپنے مراثی کے دیوان کے دیباچہ میں فرماتے ہیں،

"لیکن مشکل ترین دقائق طریق مرثیہ کا معلوم کیا کہ مضمون دو مصرعہ نثر رنگ میں ربط معنی سے دیا، چنانچہ اس کلام میں متقدم سا کسو نے عرض قبول نہیں پایا۔ پس لازم ہے کہ مرتبہ در نظر رکھ کر مرثیہ کہے، تا کہ بڑے گریہ عوام اپنے تئیں ماخوذ کرے۔"

ابتدائی عہد سے لے کر میر تک مرثیہ نے صرف اس قدر ترقی کی تھی کہ منفردہ سے مربع ہو گیا تھا، اور لب و لہجے مختلف ہوگئی تھیں، اور خصوصاً

وہ شگفتہ بحریں زیادہ مستعمل تھیں، جو بطریق سوز بھی جا سکتی ہیں۔

سوداؔ کی جدت پسند طبیعت نے منفردہ اور مربع کے علاوہ دیگر شکلیں بھی استعمال کیں، اور اس طرح مرثی میں کسی حد تک تنوع پیدا کر دیا، ان کے کلیات میں مراثی کی مندرجہ ذیل شکلیں پائی جاتی ہیں،

منفردہ، مستزاد منفردہ، مثلث، مستزاد مثلث، مربع، مستزاد مربع، مخمس ترکیب بند، مخمس ترجیع بند، مسدس، مسدس ترکیب بند،

مسدس جس نے سوداؔ کے بعد مرثیے کے لئے خصوصیت حاصل کر لی سودا سے قبل کہیں نہیں پایا جاتا، یہ جدت سوداؔ ہی کا حصہ ہے بعض کے نزدیک اس کے موجد میاں سکندرؔ پنجاب کے رہنے والے تھے، یہ سوداؔ کے ہم عصر تھے، ان کا ایک مسدس نواح لکھنؤ میں زبان زد خاص و عام ہے اس مسدس کے علاوہ سکندرؔ کا اور کلام دستیاب نہیں ہوتا، یہ بات کچھ سمجھ میں نہیں آتی، کہ سوداؔ نے میاں سکندرؔ کی تقلید میں مسدس لکھا ہو، مرزا نے جملہ شکلوں میں مرثیہ لکھا، چنانچہ مسدس بھی لکھا ہوگا، کوئی وجہ نہیں ہے کہ مسدس کو چھوڑ دیا ہو،

ایک مربع کے تین بند بطور نمونہ ملاحظہ ہوں

کریں نہ اہل حرم کس طرح سے شیون و شین ۔۔۔ سرو کو اپنے پیٹیں سو کیوں نہ وا کر کے بین
ہوئے ہیں آج کے دن قتل کربلا میں حسین ۔۔۔ یہ تعزیہ ہے رموز خدا کے محرم کا

ہزار طرح کے بیمار واں تھے دنیا میں ۔۔۔ جو کوئی تھا سو وہ سیراب ہو کے جا بیں
کئی غریب جو تھے کربلا کے صحرا میں ۔۔۔ نصیب انکو نہ قطرہ ہوا کسی یم کا

یہ ظلم کس کی زبان کو ہے کہنے کا یارا | نبی کا قتل کیا ظالموں نے گھر سارا
جوان ہیں طفل ہفتاشش ماہہ اسکو بھی مارا | کیا نہ عمر نے کچھ فرق زائد و کم کا

شعرائے مرثیہ گو اس وقت تک مرثیہ لے کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں کی تھی، سودا نے اول اول او بیت کا خیال رکھکر مرثیہ لکھا اس کے بعد اس نے ترقی کی منزلیں طے کرنی شروع کیں، اور رفتہ رفتہ ایک مستقل صنف شاعری کی حیثیت پیدا کرلی، اور ایک جماعت شعراء کی پیدا ہوگئی، جنہوں نے اس صنف کے لئے اپنی زندگیاں وقف کردیں، چنانچہ میر خلیق، میر ضمیر، مرزا فصیح، اور میاں دلگیر کو عہد حاضرہ کے مرثیہ کے ابتدائی شعراء کی حیثیت سے پیش کیا جا سکتا ہے،

مرزا فصیح اور میاں دلگیر حج بیت اللہ کے لئے مکہ معظمہ تشریف لے گئے اور وہیں مستقل سکونت اختیار کرلی، میر خلیق، اور میر ضمیر یہیں رہے اور اپنی کوششوں سے مرثیہ کو آسمان شہرت پہنچا دیا،

میر ضمیر گذشتہ سطور میں عرض کیا جا چکا ہے، کہ سودا نے سب سے پہلے مرثیہ کو مسدس میں لکھا، چنانچہ میر ضمیر نے سودا کے نقش قدم پر چل کر مسدس کو مرثیہ کے لئے انتخاب کیا، اور اسی پر اپنے کمالات کی بنیاد قائم کی، مرثیہ جواب تک رونے رلانے کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا، اسے میر ضمیر نے خوشنما تشبیہوں اور استعاروں سے، روایات اور مناظر قدرت سے اور بوسی، مقامی اور رزمیہ بیانات سے مالامال کردیا، سراپا کی ایجاد سے مرثیہ میں جان ڈال دی، اور طول دے کر سو سو بند تک پہنچا دیا، علاوہ ازیں پڑھنے کا ایک

نیا طریقہ ایجاد کیا، پہلے سوز کے طرز پر پڑھا جاتا تھا، میر ضمیر نے تحت اللفظ پڑھا اور ان کے بعد یہ روش عام ہو گئی۔

میر خلیق

میر مستحسن خلیق خلف ارشد میر غلام حسن حسن صاحب مثنوی سحر البیان دہلی میں پیدا ہوئے، لکھنؤ اور فیض آباد میں تعلیم و تربیت پائی، سولہ برس کی عمر سے شعر و شاعری کا شوق دامنگیر ہوا، اور مصحفی کے شاگرد ہوئے والد کے انتقال کے بعد عیال کا بوجھ ان کے سر پر آ پڑا، غریبانہ بیچ بیچ کر گذارا کیا کرتے تھے، بڑے پر گو شاعر تھے، ایک دیوان غزلوں کا مکمل کر لیا تھا، لیکن اُسے رواج نہیں دیا، مرثیہ گوئی میں خاص شہرت تھی،

خوبی محاورہ اور لطف زبان خلیق کی شاعری کی خصوصیت ہے لکھنؤ میں انکی اور ان کے تمام گھرانے کی زبان محاورے کے لحاظ سے سند سمجھی جاتی تھی، مرثیے میں میر خلیق کی توجہ تمام تر زبان کی صفائی اور جذبات کی صداقت کی طرف رہتی تھی، سوز و گداز کو تخیل کی بلند پروازی پر مقدم سمجھتے تھے، اور مضمون آفرینی کی ہوس کم رکھتے تھے، اور بقول آزاد ان کا کلام بہ نسبت سبحان اللہ اور واہ واہ کے نالہ و آہ کا زیادہ طلب گار تھا،

میر ببر علی انیس

میر ببر علی نام، انیس تخلص، میر مستحسن خلیق کے بیٹے میر حسن کے پوتے تھے، ۱۸۰۳ء میں بمقام فیض آباد پیدا ہوئے، اور وہیں تعلیم و تربیت پائی، اپنے خاندانی کمال یعنی شاعری میں اپنے باپ کے شاگرد ہوئے، اور جب سے مرثیہ کہنا شروع کیا، اس وقت سے تمام عمر اسی میں صرف کر دی،

جب آصف الدولہ نے لکھنؤ کو رونق دی تو میر انیس بھی وہاں پہنچے، اور اپنے کمالات سے آدھے سے زیادہ لکھنؤ کو اپنا گرویدہ کر لیا میر خلیق کی زندگی ہی میں میر انیس نے کافی شہرت حاصل کر لی تھی۔

انیس کا خیال تھا کہ میری شاعری کی خاطر خواہ قدر کچھ لکھنؤ والے ہی کر سکتے ہیں، اور اسی خیال سے انہوں نے انتزاع سلطنت اودھ تک بیرونجات کا سفر نہیں کیا لیکن آخر واقعات نے مجبور کیا، اور انہیں سفر کرنا پڑا ۱۸۵۹ء اور ۱۸۶۰ء میں دو مرتبہ عظیم آباد گئے، واپسی پر کچھ روز کے لئے بنارس قیام کیا ۱۸۷۱ء میں حیدر آباد تشریف لے گئے، اور واپسی پر الہ آباد کو شرف بخشا، ان مقامات پر آپ نے اپنے مرثیے پڑھے، اور ہزاروں آدمیوں سے خراج تحسین وصول کیا، آخر لکھنؤ میں ۱۸۷۴ء میں داعی اجل کو لبیک کہا، اور اپنے مکان میں دفن ہوئے۔

انیس کی کل تصانیف شایع نہیں ہو سکیں بیان کیا جاتا ہے کہ ہزاروں مرثیے، سلام، رباعیاں اور قطعے تصنیف کئے، ان کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی تھی لیکن فی الحال یہ تین جلدیں مراثی کی شایع ہو کر دستیاب ہوتی ہیں، باقی تصانیف ان کے خاندان میں محفوظ ہیں۔

زبان کے لحاظ سے میر انیس کی شاعری کی خصوصیت صفائی، سادگی، روانی، اور فصاحت ہے، زبان پر قدرت کامل حاصل ہے، مضامین کو نہایت سادگی سے پر تاثیر انداز میں ادا کر دیتے ہیں، زبان کی لطافت، محاورات کی دلآویزی اور تشبیہوں کی ندرت سے کلام کو تازگی بخشتے ہیں۔

شاعری میں انیسؔ کا مرتبہ بہت بلند ہے، انسانی فطرت، جذبات اور احساسات کا مطالعہ جس قدر انیسؔ نے کیا ہے، اور کسی اردو شاعر کے ہاں نہیں ملتا مسرت و غم محبت و نفرت رشک و حسد، بیم و رجا، رحم و غضب، غرض ہر ایک کیفیت کا کامل مرقع ان کے مرثیوں میں موجود ہے، ان مرقعوں کی تیاری میں مختلف اشخاص کے درمیان حفظ مراتب کو انیسؔ کبھی نظر انداز نہیں کرتے، بچے کے منہ سے وہی بات ادا کرتے ہیں جو اس کی عمر کے شایاں ہوتی ہے، اسی طرح عورت کے وہی خیالات ہوتے ہیں، جو عورت کے ہونے چاہئیں، مرد عورت، آقا، خادم، دوست، دشمن، غرض ہر شخصیت میں وہی فرق ہے جو ہونا چاہیئے، مدعا یہ کہ کردار نگاری میں خود انیسؔ کی طبیعت کو دخل نہیں ہوتا بلکہ وہ کردار کا صحیح اور اصلی مرقع پیش کرتے ہیں، اور اس سے ان کے مرثیوں میں ڈرامائی عنصر پیدا ہو جاتا ہے۔

مناظر قدرت، رزمیہ بیانات، اور موسموں کی کیفیات جیسی میر انیسؔ کے مرثیوں میں ہیں، اردو شاعری ان کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے، انیسؔ ہر چیز کو اس طرح بیان کرتے ہیں، کہ پڑھنے والوں کی آنکھوں میں اس کی تصویر پھر سے کھنچ جاتی ہے، رزمیہ بیان میں آپ کو کمال حاصل ہے، اس لحاظ سے اگر انیسؔ کو اردو کا فردوسی اور ہومر کہا جائے، تو کچھ مبالغہ نہیں۔

انیسؔ کے بعد ان کے بیٹے میر نفیسؔ اپنے والد کے نقش قدم پر چلے، اور مرثیہ نگاری میں اچھا نام پیدا کیا، انیسؔ کے پوتے میر جلیسؔ بھی اچھے شاعر ہوئے نمونۂ کلام انیسؔ ملاحظہ ہو۔

نمودِ سحر

طے کر چکا جو منزلِ شب کاروانِ صبح ہونے لگا افق سے ہویدا نشانِ صبح
گردوں سے کوچ کرنے لگے اخترانِ صبح ہر سو ہوئی بلند صدائے اذانِ صبح
پنہاں نظر سے روئے شبِ تار ہو گیا
عالم تمام مطلعِ انوار ہو گیا

خورشید نے جو رخ سے اٹھائی نقابِ شب در کھل گیا سحر کا ہوا بند بابِ شب
انجم کی فرد فرد سے لے کر حسابِ شب دفتر کشائے صبح نے الٹی کتابِ شب
گردوں پہ رنگ چہرۂ مہتاب فق ہوا
سلطانِ شرق و غرب کا نظم و نسق ہوا

بھیجا جو مہر نے سے فرمانِ عزلِ شب گردوں پہ عاملانِ سحر کا ہوا نصب
منشیٔ آسماں مع دفتر ہوا طلب بس چل بچلے سے اٹھ گئی انجم کی فوج سب
تا صبح فرد فرد میں بیگانگی ہوئی
رقاصت کی چراغوں کو پروانگی ہوئی

اہلِ گلشنِ فلک کے ستارے جو تھے رواں چن لے چمن سے جیسے پھولوں کو باغباں
آئی بہار میں گلِ مہتاب پر خزاں مرجھا کے گر گئے ثمرِ شاخِ کہکشاں
دکھلائے طور بادِ سحر نے سموم کے
پژمردہ ہو کے رہ گئے غنچے نجوم کے

کھیتا ادو ماہتاب کا وہ صبح کا ظہور بادِ خدا میں زمزمہ پردازیٔ طیور
وہ رونق اور وہ سرد ہوا وہ فضا وہ نور خنکی ہو جس سے چشم کو اور قلب کو سرور

انساں زمیں پہ محو ملک آسماں پر
جاری تھا ذکر قدرت حق ہر زباں پر

وہ سرخئ شفق کی ادھر چرخ پر بہار
وہ بار ور درخت وہ صحرا وہ سبزہ زار
شبنم کے وہ گلوں پہ گہر ہائے آبدار
پھولوں سے سب بھرا ہوا دامان کہسار
نافے کھلے ہوئے وہ گلوں کی شمیم کے
آتے تھے سرد سرد وہ جھونکے نسیم کے

شام کربلا

گذرا جو وہ دن شام مصیبت نظر آئی
پردے میں چھپا مہر تو ظلمت نظر آئی
ماتم کی غریبوں کے علامت نظر آئی
کھولے ہوئے گیسو شب آفت نظر آئی
راحت دل عالم سے فراموش ہوئی تھی
دنیا غم سرور میں سیہ پوش ہوئی تھی

جنگل میں اداسی تو وہ اور شام کا ہونا
بچوں کا وہ کھانے کیلئے بھوک میں رونا
پانی کی تمنا میں وہ منہ اشکوں سے دھونا
فاقوں میں کہاں نیند کہاں چین سے سونا
لو چلتی تھی جب خاک میں اٹ جاتے تھے بچے
ماؤں سے اندھیرے میں لپٹ جاتے تھے بچے

آتی تھی درندوں کی صدا گونجتے تھے بشر
سب فرش پہ بیٹھے تھے خس و خاک کا تھا ڈھیر
گل بجھنے میں شمعوں کے نہ لگتی تھی ذرا دیر
کرتی تھی اندھیرے میں ہوا اور بھی اندھیر
جب تھکتی تھیں چوبیں تو جھکا جاتا تھا خیمہ

بھرتی تھی ہوا جب تو اڑا جاتا تھا خیمہ

اجڑے ہوئے جنگل کی ڈراؤنی وہ صدائیں
تھرّاتا تھا کوئی کوئی پڑھتا تھا دعائیں!

دھڑکا تھا کہ جائیں نہ کہیں بچوں کی جانیں
کس طرح اس آفت سے جگہ امن کی پائیں

یاں آنکھ کے پانی سے چھٹے کھانے سے چھوٹے
ہو صبح تو جائیں کہ سیہ خانے سے چھوٹے

نقشہ میدان جنگ

نقارۂ وغا پر لگی چوٹ یک بہ یک
اٹھا غریو کوس کہ ہلنے لگے فلک

شہپور کی صدا سے ہراساں ہوئے ملک
قرنا پھنکی کہ گونج گیا دشت دور تک

شور دہل سے حشر تھا افلاک کے تلے
مردے بھی ڈر کے چونک پڑے خاک کے تلے

حد سے فزوں تھی کثرت افواج نابکار
نیزہ پہ نیزہ تیغ پہ تھی تیغ آبدار

ہر سمت تھی سناں پہ سناں شکل نوک خار
ہر صف میں تھی سپر پہ سپر مثل لالہ زار

پیکاں بہم تھے جیسے چمن گل ہیں کھلے ہوئے
گوشوں سے تھے کمانوں کے گوشے ملے ہوئے

امنڈی ہوئی تھی فوج پہ فوج اور چہل پہل
تھے برچھیوں کے صورت مقراض پھل پہ پھل

خنجر وہ جن کی آب میں ہے تلخی اجل!
وہ گرز جن کے ڈر سے گریں دیو منہ کے بل!

وہ وہ تبر تھے پاس ہر اک خود پسند کے
حلقوں پہ تھے بچھے ہوئے سقے کمند کے

شبِ شہادت

تھا خانۂ غم خیمۂ شاہنشہِ والا — آندھی یہ پریشاں تھی کہ گُل تھا تہ و بالا
مشعل نہ ٹھہرتی تھی نہ شمعوں کا اجالا — خیمہ بھی اندھیرے میں نظر آتا تھا کالا
خاک اڑتی تھی منہ پر حرمِ شیرِ خدا کے
تھا چین بچھیں فرش بھی جھونکوں سے ہوا کے

جنگل کی ہوا اور درندوں کی صدائیں — تھراتی تھیں بچوں کو چھپائے ہوئے مائیں
دھڑکا تھا کہ دہشت سے نہ جانیں کہیں جائیں — روتی تھی کوئی اور کوئی پڑھتی تھی دعائیں
گودوں میں بھی راحت نہ ذرا پاتے تھے بچے
جب بولتے تھے شیر تو ڈر جاتے تھے بچے

بچوں کے بلکنے پہ حرم کرتے تھے زاری — غش ہو گئی تھی بالی سکینہ کئی باری
چلاتی تھی رو رو کے وہ شبیر کی پیاری — یا حضرتِ عباس چلی جان ہماری
افسوس کہ پانی کا تو قطرہ نہیں گھر میں
اور آگ لگی ہے مرے ننھے سے جگر میں

تھے دوسرے خیمے میں ادھر سبطِ پیمبر — دربار میں حاضر تھے رفیقانِ دلاور
اک پہلو میں قاسم تھے اور اک پہلو میں اکبر — اکبر کے ادھر لختِ دلِ زینبِ مضطر
شبیر محبت سے سخن کرتے تھے سب سے
عباس علی سامنے بیٹھے تھے ادب سے

سرگرم تھے مر جانے پہ سب شاہ کے انصار — عباس سے یہ کہتا تھا وہ کل کا مددگار
تم اٹھیو ذرا خیمۂ ناموس سے ہشیار — ڈر ہے نہ کرے بے ادبی لشکرِ اشرار

بے دینوں کو راحت مری منظور نہیں ہے
تم دوں جو ادھر سے ہو تو کچھ دور نہیں ہے

مناقب رفقائے امام حسین رض

آگئے سجادۂ طاعت پہ امام دو جہاں — اسطرف طبل بجا یاں ہوئی لشکر میں اذاں
وہ مصلی کہ زباں جن کی حدیث و قرآں — وہ نمازی کہ جو ایماں کی تن پاک کی جاں
زاہد ایسے تھے کہ ممتاز تھے ابراروں میں
عابد ایسے تھے کہ سجدے کئے تلواروں میں

کیا جوانان خوش اطوار تھے سبحان اللہ — کیا رفیقان وفادار تھے سبحان اللہ
صفدر و صابر و جرار تھے سبحان اللہ — زاہد و عابد و ابرار تھے سبحان اللہ
زن و فرزند سے فرقت ہوئی مسکن چھوڑا
مگر احمد کے نواسے کا نہ دامن چھوڑا

گو مصیبت میں بلا طرح بپا ہی میں رہے — سر کٹے پاؤں مگر راہ الٰہی میں رہے
یوں سرافراز وہ سب لشکر شاہی میں رہے — جسطرح تیغ دو دم دست سپاہی میں رہے
اس مصیبت میں نہ پایا کبھی شاکی ان کو
آئی جو حضرت باری نے عطا کی ان کو

موم فولاد ہوا آواز دل میں وہ سوز و گداز — اپنے معبود کے سجدوں میں تھے اہل نیاز
سر تو سجادوں پہ تھے عرش معلی پہ نماز — شیر دل منتخب دہر و رشید و ممتاز
چاند سے منہ تھے چہرے تھے مجلی ایسے — نہ امام ایسا ہوا پھر نہ مصلی ایسے

مرزا سلامت علی دبیر مرزا سلامت علی نام، دبیر تخلص، مرزا غلام حسین کے بیٹے ۱۸۰۳ء میں بمقام دہلی پیدا ہوئے، سات سال کی عمر میں باپ کے ہمراہ لکھنؤ آئے، اور تحصیل علم میں مصروف ہوئے عربی اور فارسی میں فضل و کمال حاصل کیا، شعر و سخن سے قدرتی مناسبت تھی میر مظفر حسین ضمیر اس زمانے میں مرثیہ گو شاعروں میں بہت ممتاز تھے، ان کی مجلسوں میں شریک ہوتے ہوتے ان کو بھی ذوق پیدا ہوا، اور یہ ان کے شاگرد ہو گئے۔

جب انیس فیض آباد سے لکھنؤ آئے، تو لکھنؤ میں دبیر کا طوطی بول رہا تھا تاریخ ادب اردو کے مطالعہ سے یہ عجیب بات ذہن نشین ہوتی ہے، کہ ہر دور میں دو شاعر مد مقابل رہے ہیں، میر و سودا، مصحفی و انشا، ناسخ و آتش، ذوق و غالب، داغ و امیر، غرض مرثیہ کا دور بھی اس خصوصیت سے مبرا نہیں ضمیر اور خلیق پہلے حریف رہ چکے ہیں، اب انیس و دبیر کا عہد آیا، لکھنؤ کے سخن فہم دو حصوں میں تقسیم ہو گئے، آدھا لکھنؤ انیسیہ ہو گیا، اور آدھا دبیریہ، لیکن خیریت یہ رہی، کہ انیس و دبیر مصحفی و انشا کی طرح دست و گریباں نہیں ہوئے، بلکہ انیسیوں اور دبیریوں کے اکسانے سے دونوں استادوں کے جوہر خوب چمکے، دبیر و انیس میں اگرچہ حریفانہ معرکہ آرائی رہی لیکن ایک دوسرے کو قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھتے رہے، میر انیس کے انتقال کے بعد ایک سال تک دبیر زندہ رہے لیکن انھوں نے اس عرصے میں شعر کہنا ترک کر دیا تھا، اور کہا کرتے تھے، ع طور سینا بے کلیم اللہ و منبر بے انیس۔

انیس کی طرح مرزا دبیر نے بھی غدر تک لکھنؤ نہیں چھوڑا، غدر کے بعد

مرشد آباد اور پٹنہ کا سفر کیا، اور آخر ۱۸۷۵ء میں وفات پائی اور لکھنؤ میں جس مکان میں سکونت تھی اسی میں پیوند خاک ہوئے۔

مرزا صاحب نے چودہ پندرہ برس کی عمر سے مرثیہ کہنا شروع کیا، اور تمام عمر مشق سخن جاری رہی، پچاس پچپن برس میں کم سے کم تین ہزار مرثیہ لکھا ہوگا نوحوں اور رباعیوں کا کچھ شمار نہیں۔

مرزا صاحب کے کلام کا خاص جوہر تشبیہات اور استعارات ہیں، یہ اپنی قوت متخیلہ کے زور سے عجیب عجیب استعارے اور نادر تشبیہیں ڈھونڈھ کر پیدا کرتے ہیں، مرزا کا کلام مضمون آفرینی، دقت پسندی، جدت بیان، شاعرانہ استدلال اور شدت مبالغہ میں اپنا جواب نہیں رکھتا، مرزا بیان کی صفائی بندش کی چستی اور مناظر قدرت کی صحیح تصویر کھینچنے سے عاری نہیں ہیں، ان کے ہاں بھی انسانی فطرت کے نمونے نظر آتے ہیں، مگر یہ ان کا خاص رنگ نہیں، یہ انیس کا حصہ ہے۔

مرزا دبیر کے بیٹے مرزا محمد جعفر اوج نے اپنے باپ کے نقش قدم پر چل کر نام پیدا کیا، اور پٹنہ، حیدرآباد اور رامپور میں ان کی خوب قدر و منزلت ہوئی، نمونہ کلام دبیر یہ ہے۔

صبح کربلا

عالم میں جب کہ نور سحر جلوہ گر ہوا — رخ سے فلک پہ سہو کا نقطہ قمر ہوا
آراستہ گروہ عدو سر بسر ہوا — آواز طبل جنگ کا بھی شور و شر ہوا

خوابیدگان خاک اٹھے اپنے خواب سے
پنبہ بگوش چرخ ہوا آفتاب سے

سرگرم حث گھوڑوں کو کرنے لگے سوار — پہنچا غبار تا سر افلاک بے مدار
صف بستہ تھی جو فوج وہ اپنے کارزار — تھی وہ ہجوم گرد سے سطر خط غبار

آلودۂ غبار زمیں یاں تلک ہوا
جو اک گھڑی میں شدۂ ساعت فلک ہوا

یاں تشنگان تیغ تھے بشاش و مستقل — دو راز فرات چشمۂ کوثر سے متصل
سبحہ بدست و شکر لب یاد حق بدل — سجادہ زیب ذکر الٰہی سے مشتغل!

چہروں سے تو نمود شہادت کی شان تھی
پر تشنگی سے ہونٹوں کے اوپر زبان تھی

رنگ شفق نے جب کہ کیا آسماں پہ جوش — فوج حسین ہوگئی میدان میں سرخ پوش
آواز یا حسین کا تھا ہر طرف خروش — اور دست بستہ سامنے صبر و قرار و ہوش

دریا کو دیکھتے تھے نہ پانی کی چاہ میں
لہرا رہا تھا چشمۂ کوثر نگاہ میں!

تھا گھر میں ابن ساقی کوثر کے قحط آب — تھے جام سرنگوں صفت ساغر حباب
اطفال خورد سال کو تھی پیاس بے حساب — کہتے تھے شدت سے العطش اے ابن بوتراب

پیاسا جو یاں حسین علیہ الصلوٰۃ تھا
موجوں سے پیچ و تاب میں آب فرات تھا

آتی تھی طبل جنگ کی خیمہ میں جو صدا — دہشت سے دل دھڑکتا تھا سب اہلبیت کا

بانو نے اپنے سر سے ردا کو گرا دیا　　کہتی تھی دل سے زینب مضطر بصد بکا
گردن کٹے گی تیغ سے سبط رسول کی
لٹ جائے گی اب آج کمائی بتول کی

تلوار کی تعریف

رستہ نہ تھا سروں پہ پھری اور ہوا ہوئی　　تیری لہو میں ڈوبی تری اور ہوا ہوئی
بدلی کی طرح تڑپ کے گھری اور ہوا ہوئی　　بجلی گرائی خود بھی گری اور ہوا ہوئی
پانی بھرا گھٹا لے یہ طوفاں عیاں ہوا
یا ارض ابلعی سبق آسماں ہوا
کاٹا پلک کو آنکھ پہ پتلی میں نور کو　　پاؤں میں کجروی کو سروں میں غرور کو
نیت میں معصیت کو طبیعت میں زور کو　　سینہ میں بغض و کینہ کو دل میں فتور کو
ذات اک طرف مٹا دیا بالکل صفات کو
کیسی زباں دہاں میں یہ کاٹ آئی بات کو
عیسیٰ کی طرح اوج فلک پر چلی گئی　　ظلمت میں صاف مثل سکندر چلی گئی
مانند نبض ہاتھ کے اندر چلی گئی　　سینہ میں ٹھہری دم لیا باہر چلی گئی
ممکن نہیں کسی سے کمال اس نے جو کیا
اڑنے دیا نہ رنگ کو چہرے پہ دو کیا

صبح کربلا

جس وقت شمس شمسۂ برج فلک ہوا　　مشرق سے فرش نور کا مغرب تلک ہوا

شرمندہ ماہ دیکھ کے اسکی جھلک ہوا — عالم میں ذکر خالق جن و ملک ہوا
شب کی روانگی تھی سحر کا ظہور تھا
ہر جا پہ روشنی تھی ہر اک جا پہ نور تھا

نقارۂ سحر کی کہیں تھی صدا بلند — تھا اک طرف تو نالۂ تکبیر خدا بلند
خیموں میں تھی اذاں کی صدا جا بجا بلند — تھے سوئے حق حسین کے دست دعا بلند
سرسبز ساں قلم ہو حسین غریب کا
روشن جہاں میں نام ہو میرے حبیب کا

ہر جا خدا کے ورد زباں تھا خدا خدا — تھے مرغ صبح مستعد ذکر کبریا
دیتے تھے بندگان الٰہی کو یہ صدا — جاگو نماز صبح پڑھو سو رہے ہو کیا
دیکھو صلوٰۃ قبلۂ اہل صلاۃ کو!
سجدے میں اور رکوع میں کاٹا ہے رات کو

روشن ہوئے خطوط شعاعی بآب و تاب — گویا عیاں ہوئی مژۂ چشم آفتاب
بوسے کو آیا سوئے در ابن ابوتراب — کہتا یہ مہر دیکھ کے دروازۂ جناب
جاروب چاہئے نہیں ایسے مکان کو
پلکوں سے اپنی جھاڑ دوں ہوں اس آستان کو

سجادہ ماہتاب کا واں چرخ سے اٹھا — اور کعبۂ زماں کا مصلیٰ یہاں بچھا
تسبیح دست پاک میں لو سلک تھی عیا — روشن تھے دانے اختر تابندہ سے سوا
نور جبین شہ سے عجب آب و تاب تھی
یہ نور سجدہ گہ صفت آفتاب تھی

ہاں شاہِ دیں تھے مستعدِ ذکرِ کبریا ورد زباں نجاتِ خلائق کی تھی دعا
واں لشکرِ یزید میں غور و تشور تھا تدبیرِ قتلِ سبطِ پیمبر تھی جابجا
سب کی خوشی یہ تھی دلِ زہرا دو نیم ہو
بن باپ کی سکینہ ہو عابد یتیم ہو

وہ صبح کا ظہور وہ میدانِ کربلا بجنا ہر ایک سمت کو وہ طبلِ جنگ کا
فوجِ عدو میں ایک کو تھا اک جگا رہا اور ایک سونے والوں کو دیتے تھے یہ صدا
جاگو درست فوج ادھر اور ادھر ہوئی
لو گردنِ حسین کو کاٹو سحر ہوئی

دھوتا تھا منہ کنارۂ دریا کوئی عدو مشغولِ غسل نہر میں تھا کوئی زشت رو
ملبوس رخت تن کی کسی کو تھی شست و شو بستر سے اٹھ کے تھا کوئی آمادۂ وضو
یاں پیاس سے حسین کے اطفال رو رہے تھے
منہ وقتِ صبح اشکوں سے سادات دھو رہے تھے

آنکھوں کو مل رہا تھا کوئی خوابگاہ پر بستر پہ اپنے باندھ رہا تھا کوئی کمر
شمشیر باندھتا تھا کوئی اور کوئی سپر لعنت کہہ رہی تھی یہ ساماں دیکھ کر
سب خلق روئے گی شہِ دلگیر کے لئے
حربے یہ سب ہیں حضرتِ شبیر کیلئے

کہتا تھا کوئی شیر کا ہے آج سامنا جس نے پیا ہے دودھ جنابِ بتول کا
آساں نہیں مقابلۂ شاہِ کربلا بہتوں کے سر کو کاٹ کے کٹوائے گا گلا
مشکل ہے قتل راحتِ جانِ بتول کا

شبیر کا گلا بھی گلا ہے رسول کا

باب ۸

اردو شعر و شاعری کا چوتھا دور (دہلی میں)

تمہید سلطنت مغلیہ کی جڑ کھوکھلی ہو چکی تھی۔ دہلی میں ارباب کمال کا شیرازہ منتشر ہو چکا تھا۔ شعر و شاعری کا مرکز لکھنؤ ہوتا جاتا تھا۔ میر و سودا دہلی کو خیرباد کہہ چکے تھے مصحفی جرأت و انشاء نے لکھنؤ کی صحبتوں کو گرما رکھا تھا لیکن یہ خیال کرنا غلط ہوگا۔ کہ دہلی میں شعر و شاعری کا چراغ قطعی گل ہو چکا تھا۔ نہیں دہلی میں اب بھی کوئی نہ کوئی صاحب کمال گذشتہ عظمت و شان پر آنسو بہانے کیلئے موجود تھا۔ یوں تو حکیم ثناء اللہ خاں فراق حکیم قدرت اللہ خاں قاسم شاگرد خواجہ میر درد میاں شکیبا شاگرد میر مرزا عظیم بیگ اور شیخ ولی اللہ محب شاگرد سودا حافظ عبدالرحمن خاں احسان وغیرہم موجود تھے مگر ان سب کا حال اس مختصر کتاب میں درج نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ نصیر دہلوی کا مختصر حال تمہید میں بیان کر دینا ضروری ہے۔ اول تو یہ کہ شاہ نصیر ذوق جیسے مسلم الثبوت استاد کے استاد تھے۔ دوسرے انہوں نے دکن پر وہی احسان کیا جو ولی نے شمالی ہند پر کیا تھا یعنی وہاں ذوق شاعری کو جو ایک عرصے سے سرد ہو چکا تھا گرمایا۔ تیسری خاص بات یہ ہے کہ نصیر نے شعرائے لکھنؤ کے رنگ کو دہلی میں پھیلایا۔ جس کا اثر ان کے شاگرد ذوق کے کلام میں کہیں

کہیں ملتا ہے۔

شاہ نصیر

نصیر الدین نام۔ نصیر تخلص۔ شاہ غریب کے بیٹے تھے چونکہ رنگت کے سیاہ فام تھے۔ اس لئے گھرانے کے لوگ میاں کلو کہتے تھے وطن خاص دہلی تھا۔ شاہ غریب گوشۂ عافیت میں بیٹھے اپنے معتقد مریدوں کو ہدایت کرتے تھے۔ نصیر ان کے اکلوتے بیٹے تھے۔ اسلئے بڑے نازونعم میں پرورش پائی۔ نصیر کی ابتدائی تعلیم نامکمل رہی۔ مگر شاعری نے اس کمی کو کما حقہ پورا کر دیا آپ شاہ محمدی مائل کے شاگرد تھے۔

کثرت مشق اور لطف سخن کی بدولت شاہ عالم بادشاہ کے دربار میں رسائی ہوگئی اور کچھ دنوں ان کی قدردانی کے سایہ میں بسر اوقات کی۔

نصیر نے متعدد سفر کئے خصوصاً لکھنؤ اور حیدرآباد کے۔ دو مرتبہ لکھنؤ تشریف لے گئے اور چار مرتبہ حیدرآباد۔ اور ہر جگہ ان کی خاطر خواہ قدر و منزلت ہوئی۔ لکھنؤ میں آتش اور ناسخ کا عہد دیکھا۔ ان کے ساتھ مشاعروں میں شامل ہوئے معرکوں میں غزلیں پڑھیں اپنی مشاقی کا سکہ جمایا۔ ناسخ اور آتش جیسے مسلم الثبوت استادوں کی موجودگی میں اپنے شاگرد پیدا کئے۔ لیکن ان معرکوں سے لکھنؤ کا رنگ کچھ کچھ ان پر بھی اثر کر گیا۔ حیدرآباد میں بڑی قدر ہوئی۔ سینکڑوں شاگرد ہوئے۔ چار مرتبہ وہاں گئے اور چوتھی مرتبہ ایسے گئے کہ پھر وہیں کی خاک دامنگیر میں پیوست ہو گئے۔ سنہ وفات ۱۸۴۰ء ہے۔

شاہ صاحب نے خود اپنا دیوان مرتب نہیں کیا۔ ان کی وفات کے بعد انکے کسی شاگرد نے ان کے کلام کا مجموعہ مرتب کیا تھا جس کو نواب صاحب رامپور

نے خرید لیا تھا۔ مگر حیدرآباد میں ان کی غزلوں کا مکمل دیوان چھپ گیا ہے۔ اس میں صرف غزلیں ہی غزلیں ہیں اور کچھ نہیں۔

کلام میں شکوہ الفاظ کے ساتھ نئی نئی تشبیہیں اور استعارے پائے جاتے ہیں۔ زمینیں بھی نئی نئی اور سنگلاخ نکالی ہیں جنکو سر سبز کرنا بھی ان ہی کا کام ہے زبان وہی ہے جو سید انشا اور جرأت کی۔ لکھنؤ کے اثر سے کہیں کہیں تصنع اور آورد سے کام لیا گیا ہے۔

اس تمہید کے بعد اب اس دور کے خاص خاص نمایندوں کے حالات پڑھئے

شیخ محمد ابراہیم ذوق

شیخ محمد ابراہیم نام۔ ذوق تخلص۔ شیخ محمد رمضان کے بیٹے تھے جو نواب لطف علی خاں کے حرم کے دربان تھے ذوق ۱۷۸۹ء میں پیدا ہوئے۔ حافظ غلام رسول کے مکتب میں ابتدائی تعلیم پائی انہیں شاعری کا چسکا تھا۔ ان ہی کی صحبت میں ذوق کو بھی شعر و شاعری کا ذوق پیدا ہوا جب کچھ مشق ہو گئی تو شاہ نصیر دہلوی کے شاگرد ہو گئے اور ان کے مشاعروں میں شامل ہونے لگے۔

شعر و سخن سے کچھ ایسی فطری مناسبت تھی کہ چند روزہ مشق سے شہر بہ شہر ہو گئی۔ رفتہ رفتہ مرزا ابوظفر کے دربار میں رسائی ہو گئی جو ان ایام میں ولیعہد تھے اور شعر و سخن سے بھی ذوق رکھتے تھے۔ وہ اپنا کلام اصلاح کے لئے انہیں دینے لگے۔

انیس سال کی عمر میں ذوق نے اکبر شاہ ثانی کی مدح میں ایک پر زور قصیدہ لکھا جس کے صلے میں ان کو "خاقانی ہند" کا خطاب ملا۔ ابتداً ظفر انہیں

چار روپیہ ماہوار وظیفہ دیتے تھے۔ کچھ دنوں بعد پانچ روپے کر دیے تھے جب ظفر تخت نشین ہوئے تو ان کی تنخواہ پچیس روپے اور کچھ عرصے بعد سو روپے کر دی اور خلعت اور تحفوں سے ہمیشہ سرفراز کرتے رہتے تھے ایک گاؤں بھی جاگیر میں دیا تھا مگر اس سے زیادہ متمتع نہ ہو سکے غدر سے دو ڈھائی سال قبل ۱۸۵۴ء میں وفات پائی۔ مرنے سے چند گھنٹے پیشتر یہ شعر کہا تھا۔

کہتے ہیں آج ذوق جہاں سے گذر گیا ۔۔۔ کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

غدر میں انکا تمام کلام تلف ہو گیا۔ حافظ غلام رسول ویران نے جو ان کے شاگرد تھے محنت و کاوش کے بعد ایک مختصر دیوان مرتب کرکے شائع کیا۔ اس کے بعد ذوق کے سعادتمند اور فرماں بردار شاگرد مولانا محمد حسین آزاد نے ایک دوسرا مجموعہ مرتب کیا مگر یہ بھی مختصر ہے۔ ذوق کو اگر فنا فی الشعر کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا ان کی تمام عمر شعر و شاعری میں بسر ہوئی۔ بات بات پر قصیدے لکھتے تھے غزلوں کا تو کہنا ہی کیا ہے۔ اگر ان کا کلام ضائع نہ ہوتا تو تین چار ضخیم جلدیں بھی اس کی متحمل نہ ہو سکتیں۔ اب جو یہ مختصر مجموعہ نظر پڑتا ہے تو فلک کج رفتار کی ستم کوشی پر رونا آتا ہے کہ کیا کیا جواہر پارے ہونگے کہ یوں برباد ہو گئے۔

ذوق قصیدے کے بادشاہ ہیں۔ متقدمین میں سودا اور متوسطین میں ذوق ہیں۔ ان کے بعد اس صنعت کی سرد بازاری ہو جاتی ہے۔ ذوق کا مرتبہ اس صنف میں سودا سے کسی طرح کم نہیں بلکہ زبان کی صفائی اور بر ترکیب کی چستی میں اکثر سودا سے آگے نکل جاتے ہیں۔

غزلیات میں ذوق کا رنگ مختلف وقتوں میں مختلف رہا ہے۔ کہیں خواجہ میر درد کا انداز ہے۔ کہیں جرأت کا رنگ ہے اور کہیں سودا کی جھلک نمایاں ہے اور پھر رفتہ رفتہ یہ تینوں رنگ مل کر ان کا ایک خاص رنگ بن گیا ہے۔ آزاد فرماتے ہیں کہ ان کی غزل اخیر کو ایک گلدستہ گلہائے رنگا رنگ کا ہوتی تھی۔ دو تین شعر بلند خیالی کے۔ ایک دو تصوف کے۔ دو تین معاملے کے“۔

عام طور پر ان کے کلام میں برجستگی اور رنگینی پائی جاتی ہے۔ زبان نہایت صاف اور شستہ طرز بیان سیدھا سادا اور عام فہم۔ محاورہ اور ضرب الامثال کا صرف ایسا برجستہ اور برمحل کرتے ہیں کہ شعر کی دلآویزی بڑھ جاتی ہے۔ عام طور پر کلام میں آمد ہے لیکن کہیں کہیں تصنع اور آورد سے بھی کام لیا ہے اور یہ ان کے استاد کا اثر ہے۔

ان تمام خوبیوں کے علاوہ کلام میں اخلاقی اور صوفیانہ مضامین نہایت سلیقے سے سجائے ہیں حقائق و معارف کو باتوں باتوں میں نہایت صفائی سے اس طرح کہتے ہیں کہ الجھاؤ پیدا ہونے نہیں دیتے۔

نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:-

مزے یہ دل کیلئے تھے نہ تھے زباں کیلئے
سو ہم نے دل میں مزے سوزش نہاں کیلئے

نہیں ثبات بلندیٔ عزوشاں کیلئے
کہ ساتھ اوج کے پستی ہے آسماں کیلئے

ہزار لطف ہیں جو ستم میں جاں کیلئے
ستم شریک ہوا کون آسماں کیلئے

فروغ عشق سے ہے روشنی جہاں کیلئے
یہی چراغ ہے اس تیرہ خاکداں کیلئے

صبا جو آئے خس و خار گلستاں کے لئے
قفس میں کیونکہ نہ پھڑکے دل آشیاں کیلئے

دمِ عروج ہے کیا فکرِ نردباں کے لئے
کمندِ آہ تو ہے بامِ آسماں کے لئے

سدا تپش پہ تپش ہے دلِ تپاں کے لئے
ہمیشہ غم پہ ہے غم جانِ ناتواں کیلئے

حجر کے چومنے ہی پر ہے حجِ کعبہ اگر
تو بوسے ہم نے بھی اس سنگِ آستاں کیلئے

نہ چھوڑ تو کسی عالم میں راستی کہ یہ شے
عصا ہے پیر کو اور سیف ہے جواں کیلئے

جو پاس مہر و محبت کہیں یہاں بکتا
تو ہم بھی لیتے کسی اپنے مہرباں کیلئے

خلش ہے عشق کی ہے خارِ بسترِ تن زار
ہمیشہ اس تنِ مجنونِ ناتواں کیلئے

تپش سے عشق کے یہ حال ہے مرا گویا
بجائے مغز ہے سیماب استخواں کے لئے

مرے مزار پہ کس وجہ سے نہ برسے نور
کہ جان دی ہے ترے روئے عرق فشاں کے لئے

ابھی کان میں کیا اس صنم نے پھونک دیا
کہ ہاتھ رکھنے ہیں کانوں پہ سب اذاں کیلئے

نہیں ہے خانہ بدوشوں کو حاجتِ ساماں
اثاثہ چاہئے کیا خانۂ کماں کے لئے

نہ دل رہا نہ جگر دونوں جل کے خاک ہوئے
رہا ہے سینہ میں کیا چشمِ خونفشاں کیلئے

نہ لوحِ گور پہ مستوں کے ہو نہ ہو تعویذ
جو ہو تو خشتِ خم ہے کوئی نشاں کیلئے

اگر امید نہ ہمسایہ ہو تو خانۂ یاس
بہشت ہے ہمیں آرامِ جاوداں کے لئے

وہ مول لیتے ہیں جس دم کوئی نئی تلوار
لگاتے پہلے مجھی پر ہیں امتحاں کے لئے

صریح چشمِ سخن گو تری کہے نہ کہے
جوابِ صاف ہے بر طاقت و تواں کے لئے

رہے ہے ہول کہ برہم نہ ہو مزاج کہیں
بجا ہے ہولِ دل ان کے مزاجداں کیلئے

مثالِ نے ہے مرا جب تلک کہ دم میں دم
فغاں ہے میرے لئے اور میں فغاں کیلئے

بلند ہووے اگر کوئی میرا شعلۂ آہ !
تو ایک اور ہو خورشید آسماں کے لئے

چلے ہیں دیر کو مدت میں خانقاہ سے ہم
شکستِ توبہ لئے ارمغاں مغاں کیلئے

وبالِ دوش ہے اس ناتواں کو سر لیکن　　لگا رکھا ہے ترے خنجر و سناں کے لئے
بیانِ دردِ محبت جو ہو تو کیونکر ہو!　　زباں نہ دل کیلئے ہے نہ دل زباں کیلئے
اشارہ چشم کا تیرے یکایک اے قاتل　　ہوا بہانہ مری مرگِ ناگہاں کے لئے

بنایا آدمی کو ذوق ایک جزوِ ضعیف
اور اس ضعیف سے کل کام دو جہاں کیلئے

ہنگامہ گرمِ ہستیِ ناپائیدار کا　　چشمک ہے برق کی کہ تبسم شرار کا
آتا ہے گر تو آؤ کہ سینہ سے چل کے اب　　آنکھوں میں آکے ٹھہرا ہے دم انتظار کا
رو باکدامنوں کو جلتی گر سے کیا خطر　　کھٹکا نہیں نگاہ کو مژگاں کے خار کا

اے ذوق ہوش گر ہے تو دنیا سے دور بھاگ
اس میکدے میں کام نہیں ہوشیار کا

کیا غرض لاکھ خدائی میں ہوں دولت والے　　ان کا بندہ ہوں جو بندے ہیں محبت والے
ہے جوں شیشۂ ساعت وہ مکدر دونوں　　کبھی مل بھی گئے دو دل جو کدورت والے
نہیں جز شمع مجاورِ مری بالینِ مزار　　نہیں جز کثرتِ پروانہ زیارت والے

کبھی افسوس ہے آتا کبھی رونا آتا!
دلِ بیمار کے یہ دو ہیں عیادت والے

ایک قطعہ ملاحظہ ہو۔

کہوں اے ذوق کیا حالِ شبِ ہجر　　کہ تھی اک اک گھڑی سو سو مہینے
نہ تھی شب خیال رکھا تھا اک اندھیر　　مری بخت سیہ کی تیرگی نے
شبِ غم شمع ساں ہوتی نہ تھی کم!　　ڈبوتے تھے مجھے پسینوں پر پسینے

یہی کہا تھا گھبرا کر فلک سے ! — کہ او بے مہر بد اختر کمینے
کہاں ہیں اور کہاں ہیں سب نگر تھے — مری جانب سے تیرے دل میں کینے
سواس ظلمت کے پردے میں کئے ظلم — ارے ظالم تری کینہ وری نے
عوض کس بادہ نوشی کے مجھے آج — پڑے یہ زہر کے سے گھونٹ پینے
حواس و ہوش جو مجھ سے قریں تھے — قرینے سے ہوئے سب بے قرینے
مری سنسنہ زنی کا شور سُن کر — پھٹے جاتے ہیں ہمسایوں کے سینے
اٹھا با گاہ اور گلے نے نبھایا — مجھے بیتابی دی بے طاقتی نے
کہا جب دل نے تو کچھ کھڑکے سورہ — بہت الماس کے توڑے نگینے
نہ ٹوٹا جان کا قالب سے رشتہ — بہت سی جان توڑی جانکنی نے
بہت دیکھا نہ دکھلایا ذرا بھی — طلوع صبح سے منہ روشنی نے
کہا جی نے مجھے بہ ہجر کی رات — نفس ہے صبح تک دیگی نہ جینے
لگے بانی چوانے منہ میں آنسو — پڑھی یاسین سرہانے بیکسی نے
مگر دن عمر کے تھوڑے سے باقی — لگا رکھے تھے میری زندگی نے
کہ قسمت سے قریب خانہ میرے — اذاں مسجد میں دی بارے کسی نے
بشارت مجھ کو صبح وصل کی دی — اذاں کے ساتھ یمن و فرخی نے
ہوئی ایسی خوشی اللہ اکبر — کہ خوش ہو کر کہا خود یہ خوشی نے

مؤذن مرحبا بر وقت بولا
تری آواز مکے اور مدینے

مرزا اسد اللہ خاں غالب

اسد اللہ خاں نام۔ مرزا نوشہ لقب نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ خطاب تھا۔ پہلے اسد تخلص تھا پھر بہ مناسبت اسد اللہ غالب غالب اختیار کر لیا۔ والد کا نام عبد اللہ بیگ تھا۔ غالب ۱۷۹۷ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے۔ ابھی نو برس کے بھی نہ ہونے پائے تھے کہ باپ کے سایہ سے محروم ہو گئے۔ مرزا نصر اللہ بیگ غالب کے حقیقی چچا انگریزی فوج میں رسالدار تھے۔ ان کی ذات اور رسالے کی تنخواہ میں دو پرگنے نواح آگرہ میں مقرر تھے۔ انہوں نے بھتیجے کی پرورش کی۔

ابتدائی عمر آگرہ میں بسر ہوئی۔ شیخ معظم اور میاں نظیر اکبر آبادی سے تعلیم پائی۔ اس کے بعد ہرمزد نامی ایک ایرانی سے جو آتش پرست سے مسلمان ہوا تھا فارسی کی تکمیل کی۔ اپنے چچا کے ہمراہ دہلی آئے جن کی شادی نواب فخر الدولہ جاگیردار لوہارو کے خاندان میں ہوئی تھی۔ مرزا خود بھی نواب فخر الدولہ کے بھائی نواب الٰہی بخش معروف کی بیٹی سے منسوب ہوئے۔

چچا کے مرنے کے بعد ان کے وارثوں کی پنشنیں سرکار نے فیروزپور جھرکہ کی ریاست میں مقرر کرا دیں۔ جس میں سے سات سو روپیہ سالانہ مرزا کو بھی غدر تک ملتا رہا۔ پچاس روپیہ ماہوار خلعت و خطاب کے ساتھ تاریخ خاندان تیموریہ کے لکھنے کے معاوضہ میں ابوظفر بہادر شاہ نے مقرر کر دئیے تھے غدر کے بعد یہ تنخواہ بند ہو گئی اور بہادر شاہ سے تعلقات رکھنے کی پاداش میں پنشن بھی جاتی رہی دو برس انہوں نے بڑی مصیبت میں کاٹے۔ آخر نواب یوسف علیخاں ناظم والیٔ رامپور نے سو روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر کر دی لیکن یہ رامپور زیادہ نہ رہ

گئے۔ واپس آئے اور تین سال کی جدوجہد کے بعد پنشن جاری ہوئی اور کچھ
فارغ البالی سے بسر ہونے لگی۔

۱۸۳۰ء میں مرزا کلکتہ بھی گئے تھے واپسی پر لکھنؤ بھی قیام کیا واجد علیشاہ
کی مدح میں قصیدہ لکھا۔ انہوں نے پانچ سو روپیہ سالانہ وظیفہ مقرر کیا جو انتزاع
حکومت تک انہیں ملتا رہا۔

مرزا ۱۸۶۹ء میں راہی ملک بقا ہوئے اور درگاہ حضرت نظام الدین
اولیاء (دہلی) کے متصل پیوند خاک ہوئے۔

مرزا شگفتہ مزاج تھے، ذہن و ذکاوت کے ساتھ قوت حافظہ بھی لاجواب
رکھتے تھے۔ شوخی اور ظرافت مزاج میں بہت تھی۔ تحریر ہو یا تقریر کوئی بات ان
کی لطافت و ظرافت سے خالی نہ ہوتی تھی۔ طبیعت میں فیاضی، سیر چشمی اور خود
داری کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ کبھی کوئی کام ایسا نہیں کیا جو وضعداری کے
خلاف ہو۔ مذہبی تعصبات سے آزاد تھے ہندو مسلمانوں کے ساتھ یکساں
محبت اور رواداری کا برتاؤ تھا۔ خود عقیدہ کے اعتبار سے مسلمان تھے توحید
اور رسالت پر پکا ایمان رکھتے تھے۔ صوفی منش انسان اور تفضیل علی کے
قائل تھے۔

یوں تو مرزا کی کل فارسی اور اردو تصانیف بارہ تک پہنچی ہیں مگر یہاں ہمیں
صرف اردو تصانیف سے تعلق ہے سو وہ تین ہیں (۱) عود ہندی (۲) اردوئے معلے
یہ دونوں آپ کے خطوط کے مجموعے ہیں اور نثر میں ہیں (۳) دیوان اردو۔

مرزا فارسی کے بڑے زبردست شاعر تھے اور انہیں اس پر بجا طور پر ناز

بھی تھا۔ اپنے اردو کلام کو فارسی کلام کے مقابلے میں بلند پایہ نہ سمجھتے تھے۔
لیکن زمانہ کے انقلاب اور اردو کی عالمگیری نے ان کے فارسی کلام کو بھلا دیا۔
اور اردو کلام کو لوگوں نے حرز جان بنایا۔

مرزا کے عہد شاعری کو تین ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے (۱) وہ دور
جس میں فارسیت کا رنگ ان کی قوت متخیلہ پر خوب چڑھا ہوا تھا۔ مرزا بیدل
کی روش پر چلتے تھے چنانچہ اس دور کے کلام کے متعلق کہا گیا ہے

کلام میر سمجھے اور بیان میرزا سمجھے مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

لوگوں نے اس ناپسندیدہ انداز اور بے راہ روی کی مذمت کی چنانچہ غالب
فرماتے ہیں :۔

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل سن سن کے اسے سخنوران کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

اس دور کے کلام کا نمونہ یہ ہے۔

شمار سبحہ مرغوب بت مشکل پسند آیا!
تماشائے بیک کف بردن صد دل پسند آیا

بہ فیض بے دلی نومیدی جاوید آساں ہے
کشائش کو ہمارا عقدۂ مشکل پسند آیا

ہوائے سیر گل آئینۂ بے مہری قاتل
کہ انداز بخوں غلطیدن بسمل پسند آیا

(۲) اس کے بعد ان کے کلام میں انقلاب واقع ہوتا ہے اور وہ رنگ اختیار

کہا جاتا ہے جو عام طور پر دیوان میں موجود ہے (۲۳) لیکن آخر عمر میں کلام بہت سہل ہو گیا ہے۔ زبان کی صفائی اور بے ساختگی اس قدر بڑھ گئی ہے کہ معلوم ہوتا ہے گویا باتیں کر رہے ہیں۔

لیکن یہ امر واقع ہے کہ ان کے جیتے جی اور ایک عرصہ بعد تک بھی ان کے کلام کی خاطر خواہ قدر نہیں ہوئی۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کا آسان سے آسان کلام بھی اس زمانہ کے مذاق کے خلاف تھا۔ مگر اب امتداد زمانہ نے ثابت کر دیا ہے کہ غالب صحیح راستہ پر تھے اور غالب نے جب کہا تھا۔ ع

شہرت شعرم بگیتی بعد من خواہد شدن

تو گویا حقیقت کی ترجمانی کی تھی۔

سب سے پہلی خصوصیت جو ان کے کلام میں ملتی ہے وہ ان کا ذوق فارسی اور ندرت بیان ہے۔ عام اور مبتذل تشبیہیں ان کے کلام میں کہیں نہیں ملتیں۔ جہاں تک ہو سکتا ہے نئی نئی تشبیہوں سے کام لیتے ہیں مثلاً سانس کو موج سے بیخودی کو دریا سے۔ گرداب کو شعلۂ جوالہ سے وغیرہ۔

الفاظ کا انتخاب مرزا کے کلام میں لاجواب ہے۔ زیادہ سے زیادہ مضمون کو کم سے کم الفاظ میں ادا کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں بھرتی کے الفاظ کی گنجائش کہاں۔ ایک ایک مصرع میں یہ خوبی ہے کہ اگر اس میں سے کسی لفظ کو نکال کر اس کے بجائے دوسرا ہم معنی لفظ رکھ دو تو معنی میں فرق پڑ جائیگا۔

طرز ادا میں جدت ہے معمولی سے معمولی مضامین کو لیتے ہیں لیکن ندرت بیان کے جادو سے انہیں کہیں سے کہیں پہنچا دیتے ہیں۔ اگرچہ کلام میں حسن و عشق

کو بہت دخل ہے لیکن گل وبلبل کے پھیکے اور بے مزہ افسانے نہیں ہیں۔ بلکہ انسانی فطرت کے عمیق ترین حقائق کے مرقعے تیار کئے گئے ہیں۔ دنیا کی سطحی چیزوں پر نظر ڈال کر مطمئن نہیں ہوتے بلکہ ان کی شاعرانہ نگاہیں ہر چیز کی حقیقت تک پہنچتی ہیں۔ جذبات انسانی کے رموز کی ترجمانی جیسی غالب نے کی اب تک کسی سے نہ بن پڑی۔ فلسفہ اور تصوف کا جہاں تک شاعری سے تعلق ہو سکتا ہے۔ آپ کے کلام میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ وحدت الوجود کا طرح طرح سے ذکر کیا ہے۔ غالب کو ہر چیز میں اسی ذات باری تعالیٰ کا جلوہ نظر آتا ہے۔ غالب کے آسان سے آسان کلام میں بھی یہ جملہ خصوصیات اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔

ایک خصوصیت مرزا کی یہ ہے کہ ان کے طرز ادا میں ایک خاص چیز ہے جو مومن کے سوا اور شعرا میں نہیں ملتی۔ ان کا کلام ایسا پہلو دار ہوتا ہے کہ بادی النظر میں اس سے کچھ اور معنی مفہوم ہوتے ہیں۔ مگر غور کرنے کے بعد دوسرے معنی نہایت لطیف پیدا ہوتے ہیں جس کی وجہ سے ان کا شعر ہمیشہ نیا لطف دیتا ہے۔

غالب میں ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کے ہاں نہایت لطیف شوخی پائی جاتی ہے اور ایسی شوخی جو دل میں تڑپ اور کیفیت پیدا کر دے سوز و گداز بھی کلام میں ہے۔ وہ بھی دل کی دردمندانہ کیفیت ہے نہ کہ آہ و بکا۔

اب نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

کاو کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیے
سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

بس کہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیر پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

دوست غمخواری میں مری سعی فرمائیں گے کیا
زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا

بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور کب تلک
ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائیں گے کیا

حضرتِ ناصح گر آئیں دیدہ و دل فرشِ راہ
کوئی مجھکو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا

آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں
عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا

گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یوں سہی
یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا

خانہ زادِ زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں
ہیں گرفتارِ وفا زنداں سے گھبرائیں گے کیا

ہے اب اس معمورہ میں قحطِ غمِ الفت اسد
ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں کھائیں گے کیا

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے ۔ یہی انتظار ہوتا

ترے وعدہ پر جیے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

تری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا
کبھی تو نہ توڑ سکتا اگر استوار ہوتا

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیر نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا۔ کوئی غم گسار ہوتا

رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا!
جسے غم سمجھ رہے ہو وہ اگر شرار ہوتا

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غم عشق اگر نہ ہوتا۔ غم روزگار ہوتا

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شب غم بری بلا ہے
مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا!

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا!
جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

درد منت کش دوا نہ ہوا — میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو — اک تماشا ہوا گلا نہ ہوا

ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں — تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب — گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا

ہے خبر گرم ان کے آنے کی — آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی! — بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی — حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

زخم گر دب گیا لہو نہ تھما — کام گر رک گیا روا نہ ہوا

رہزنی ہے کہ دلستانی ہے — لے کے دل دلستاں روانہ ہوا

کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالبؔ غزل سرا نہ ہوا

کوئی امید بر نہیں آتی — کوئی صورت نظر نہیں آتی

موت کا ایک دن معین ہے — نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

آگے آتی تھی حال دل پہ ہنسی — اب کسی بات پر نہیں آتی

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد — پر طبیعت ادھر نہیں آتی

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں — ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

کیوں نہ چیخوں کہ یاد کرتے ہیں — میری آواز گر نہیں آتی

داغ دل گر نظر نہیں آتا — بو بھی اے چارہ گر نہیں آتی

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی — کچھ ہماری خبر نہیں آتی

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی — موت آتی ہے پر نہیں آتی

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالبؔ
شرم تم کو مگر نہیں آتی

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں !

دیر نہیں، حرم نہیں، در نہیں، آستاں نہیں !
بیٹھے ہیں رہگزر پہ ہم غیر ہمیں اٹھائے کیوں

جب وہ جمال دلفروز صورت مہر نیم روز !!
آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے میں منہ چھپائے کیوں

دشنۂ غمزہ جاں ستاں ناوک ناز بے پناہ !
تیرا ہی عکس رخ سہی سامنے تیرے آئے کیوں

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں !
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

حسن اور اس پہ حسن ظن رہ گئی بوالہوس کی شرم
اپنے پہ اعتماد ہے، غیر کو آزمائے کیوں !

واں وہ غرور عز و ناز یاں یہ حجاب پاس وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں - بزم میں وہ بلائے کیوں

ہاں وہ نہیں خدا پرست - جاؤ وہ بے وفا سہی
جس کو ہو جان و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں

غالب خستہ کے بغیر - کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا کیجیے ہائے ہائے کیوں

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے
جوش قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے

کرتا ہوں جمع پھر جگر لخت لخت کو!
مدت ہوئی ہے دعوت مژگاں کئے ہوئے

پھر وضع احتیاط سے رکنے لگا ہے دم
عرصہ ہوا ہے چاک گریباں کئے ہوئے

پھر گرم نالہ ہائے شرربار ہے نفس
مدت ہوئی ہے سیر چراغاں کئے ہوئے

پھر پرسش جراحت دل کو چلا ہے عشق
سامان صد ہزار نمکداں کئے ہوئے

پھر بھر رہا ہے خامۂ مژگاں بخون دل
ساز چمن طرازی داماں کئے ہوئے

باہم دگر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب
نظارہ و خیال کا ساماں کئے ہوئے

دل پھر طواف کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کئے ہوئے

پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب
عرض متاع عقل و دل و جاں کئے ہوئے

دوڑے ہے پھر ہر ایک گل و لالہ پر خیال
صد گلستاں نگاہ کا ساماں کئے ہوئے

پھر چاہتا ہوں نامۂ دلدار کھولنا
جاں نذر دلفریبی عنواں کئے ہوئے

مانگے ہے پھر کسی کو لب بام پر ہوس
زلف سیاہ رخ پہ پریشاں کئے ہوئے

چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو
سرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کئے ہوئے

اک نوبہار ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
چہرہ فروغ مے سے گلستاں کئے ہوئے

پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں
سر زیر بار منت درباں کئے ہوئے

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن
بیٹھے رہیں تصور جاناں کئے ہوئے

غالب ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوش اشک سے
بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کئے ہوئے

ایک قطعہ ملاحظہ ہو:۔

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل | زنہار اگر تمہیں ہوسِ نائے و نوش ہے
دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو | میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے
ساقی بہ جلوہ دشمنِ ایمان و آگہی | مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے
یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط | دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے
لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ | یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے
یا صبحدم جو دیکھیے آکر تو بزم میں | نے وہ سرور و شور نہ جوش و خروش ہے
داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی | اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

حکیم محمد مومن خاں مومن

محمد مومن خاں نام۔ مومن تخلص۔ حکیم غلام نبی خاں کے بیٹے ۱۸۰۰ء میں پیدا ہوئے مولنا شاہ عبدالقادر سے عربی پڑھی۔ اسکے بعد اپنے والد اور چچا سے طب کی کتابیں پڑھیں۔ اور ان کے مطب میں نسخہ نویسی کرنے لگے اسی دوران میں نجوم کا شوق پیدا ہوا۔ چنانچہ اس فن میں بھی کمال حاصل کیا۔ لیکن نہ طب انکی افتادِ طبع کے موافق تھی اور نہ نجوم۔ عاشق مزاجی کے ساتھ شعر و سخن کی طرف میلان ہوا۔ ابتدا میں شاہ نصیر کو اپنا کلام دکھایا۔ پھر بطورِ خود مشقِ سخن کی۔

مزاج میں رنگینی اور طبیعت میں شوخی تھی خوش وضع اور خوش پوشاک عاشق مزاج آدمی تھے۔ لیکن دینداری سے بھی خالی الذہن نہ تھے۔ جوانی میں

سید احمد صاحب شہید سعید کے مرید ہوئے اور آخر وقت تک عقائد میں ان ہی کے پیرو رہے۔

تاریخ گوئی میں بڑا کمال پیدا کیا تھا۔ تعمیہ تخرجہ سے دو دو تاریخیں کہیں ہیں کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ مولانا شاہ عبد العزیز رح کی وفات کی تاریخ ملاحظہ ہو۔

دستِ بیدادِ اجل سے بے سر و پا ہو گئے!
فقر و دیں، فضل و ہنر، لطف و کرم، علم و عمل

قصائد بھی کلیات میں موجود ہیں۔ درجہ میں بھی بلند ہیں۔ لیکن انہوں نے صلہ کی امید پر اربابِ دنیا کی مدح کبھی نہیں کی۔ دیوان میں مخمس، مسدس، ترجیع بند وغیرہ سبھی کچھ موجود ہے۔ کلیات کئی بار چھپ چکا ہے اور ہر جگہ ملتا ہے۔

مومن نے متعدد سفر بھی کئے۔ رامپور بھی گئے۔ اور جہانگیر آباد بھی مگر کہیں قیام نہیں کیا۔ بقول تمیز۔

دلّی کے نہ تھے کوچے اوراقِ مصوّر تھے   جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی!

ان کے ذوقِ نظر سے دلّی کی گلیاں کب چھوٹتی تھیں۔ آخر اسی خاک پاک سے ۱۸۵۱ء میں ملکِ بقا کو سدھارے۔ اور دلّی دروازے کے باہر حضرت شاہ عبد العزیز علیہ الرحمۃ کے مقبرے کے پاس دفن ہوئے۔

مومن بڑے پایہ کے شاعر اور مسلم الثبوت استاد ہوئے ہیں۔ ان کی زبان کی بڑی خصوصیت ان کا ذوقِ فارسی ہے۔ ایسی نئی نئی اور انوکھی فارسی ترکیبیں بے تکلفی سے استعمال کر جاتے ہیں کہ خیال میں وسعت پیدا ہو جاتی ہے اور شعر کا

حُسن دوبالا ہو جاتا ہے۔

ان کے خیالات نہایت نازک اور مضامین عالی ہوتے ہیں عاشقانہ جذبات وخیالات میں ندرت بیان سے وہ لطافتیں اور رنگینیاں پیدا کرتے ہیں کہ فرسودہ سے فرسودہ مضامین میں بھی جان پڑ جاتی ہے تشبیہ و استعارہ کی رنگینی نزاکت خیال میں اور بھی رنگینیاں بھر دیتی ہے۔ جہاں صفائی پر اترتے ہیں وہاں جرأت کا دھوکا ہوتا ہے اور جہاں بلند خیالی پر نکلتے ہیں وہاں اپنی نظیر آپ ہوتے ہیں۔

ان کے ہاں خاص طور پر یہ بات نمایاں ہے کہ اکثر موقعوں پر مضمون کے بعض اجزا چھوڑ جاتے ہیں جس سے ایک خاص لطف پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ وہ موقعے ہوتے ہیں جہاں سننے والے کا ذہن خود بخود اس جزو کی طرف منتقل ہو سکتا ہے یہ بڑا نازک پہلو ہے۔ ذرا سی بے اعتدالی سے کلام پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ لیکن مومن نے اسے اس سلیقے سے برتا ہے کہ کہیں پیچیدگی اور الجھاؤ پیدا نہیں ہوتا۔

ایک اور خاص انداز مومن کے ساتھ مخصوص ہے وہ یہ ہے کہ کہیں کہیں آپ محبوب سے وہ بات کہتے ہیں جس میں بظاہر محبوب کا فائدہ ہوتا ہے لیکن حقیقت میں خود عاشق کا فائدہ مقصود ہوتا ہے۔ مثلاً

غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا　　　میری طرف بھی غمزۂ غمّاز دیکھنا

مومن اپنے تخلص کو مقطع میں اسطرح کھپاتے ہیں کہ لفظ مومن اپنے معنی دینے لگتا ہے۔ اور شعر کا جزو لاینفک بن جاتا ہے۔

اب کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا　　میری طرف بھی غمزۂ غماز دیکھنا!

اڑتے ہی رنگ رخ مرا نظروں سے تھا نہاں　　اس مرغ پر شکستہ کی پرواز دیکھنا

دشنام یار طبع حزیں پہ گراں نہیں　　اے ہم نفس نزاکت آواز دیکھنا

دیکھ اپنا حال زار منجم ہوا رقیب　　تھا سازگار طالع ناساز دیکھنا

بدکام کا مآل برا ہے جزا کے بعد　　حال سپہر تفرقہ انداز دیکھنا

ترک صنم بھی کم نہیں سوز جحیم سے
مومن غم مآل کا آغاز دیکھنا

ہم سمجھتے ہیں آزمانے کو!　　عذر کچھ چاہیے ستانے کو

صبح عشرت ہے وہ نہ شام وصال　　ہائے کیا ہو گیا زمانے کو

برق کا آسماں پر ہے دماغ　　پھونک کر میرے آشیانے کو

شکوہ ہے غیر کی کدورت کا　　سو مرے خاک میں ملانے کو

کوئی دن ہم جہاں میں بیٹھے ہیں　　آسماں کے ستم اٹھانے کو

چل کے کعبہ میں سجدہ کر مومن
چھوڑ اس بت کے آستانے کو

آنکھوں سے حیا ٹپکے ہے انداز تو دیکھو　　ہے بوالہوسوں پر بھی ستم ناز تو دیکھو

اس بت کے لئے میں ہوس حور سے گزرا　　اس عشق خوش انجام کا آغاز تو دیکھو

چشمک مری وحشت پہ ہے کیا حضرت ناصح　　طرز نگہ چشم فسوں ساز تو دیکھو

مجلس میں مرے ذکر کے آتے ہی اٹھے وہ　　بدنامی عشاق کا اعزاز تو دیکھو!

اس غیرت ناہید کی ہر تان ہے دیپک　　شعلہ سا چمک جائے ہے آواز تو دیکھو

محفل میں تم اغیار کو دزدیدہ نظر سے — منظور ہے پنہاں نہ رہے بات تو دیکھو
دس بار گئی دامن کے گواہی مرے آنسو — اس یوسف بیدرد کا اعجاز تو دیکھو

جنت میں بھی مومن نہ ملا ہائے بتوں سے
جور اجل تفرقہ پرواز تو دیکھو

روز جزا جو قاتل دلجو خطاب تھا — میرا سوال ہی مرے خوں کا جواب تھا
ناصح ہے طعنہ زن مری ناکامیوں پہ کیا — دلجوئیوں سے تیری کبھی کامیاب تھا
پھرتے سے شام وعدہ کھٹکے پہ کہ سو رہے — آرام شکوۂ ستم اضطراب تھا
کیا کیا شکن دیئے ہیں دل زار کو مگر — اس کے خیال میں ورق انتخاب تھا
عاشق ہوئے ہیں آپ کہیں گو اسی ہوں — شب حال غیر مجھ سے زیادہ خراب تھا
وقت وداع بے سبب آزردہ کیوں ہوئے — یوں بھی تو ہجر میں مجھے رنج و عذاب تھا
وہ چشم انتظار کہاں باز بعد مرگ — دیکھا تو میں نے آنکھ نہ لگنا بھی خواب تھا
بے پردہ غیر سے نہ ہوا ہوگا شب کہ صبح — آنکھوں میں شرم تھی نہ نظر میں حجاب تھا
دیکھا ہے رشک و حسد وہ بلا کہ آج — سنبل کو تیری زلف کا سا پیچ و تاب تھا
ہوں کیوں نہ محو حیرت لب گلہائے شوق — جو دل میں شعلہ تھا وہی آنکھوں میں آب تھا
کیا جی لگا ہے تذکرہ یار میں عبث — ناصح سے مجھ کو آج تلک اجتناب تھا

روز جزا خدا بت جلاد کو ملا!
گویا کہ خون ناحق مومن صواب تھا

کیا رشک غیر تھا کہ تحمل نہ ہو سکا — میں جان کر حریف تغافل نہ ہو سکا
ہوتا ہے آہ صبح سے داغ اور شعلہ زن — کیسا چراغ تھا یہ کبھی گل نہ ہو سکا

اس نے جو دل کو منہ نہ لگایا دو نیم ہے — یہ جام جم ہوا قدح مل نہ ہو سکا
عاشق نہ ہو کہیں کہ انہیں قتل غیر میں — مشکل بنی کچھ ایسی کہ سہل نہ ہو سکا
کہتے ہیں گلشن اپنی کلی اسکے دم سے تھی — دشمن جو ہم ترانۂ بلبل نہ ہو سکا
نفرت تھی پاس عدو کہ نہ ٹھہرے گو صبحدم — یاس درازیٔ شب کاکل نہ ہو سکا
پروردۂ وفا سے ہو کب ترک عاشقی — کیا نار کھتے کہ مجھ سے تحمل نہ ہو سکا
وہ عکس لعل چشم عدو میں پڑا نہ ہو — نظارہ مجھ سے جانب سنبل نہ ہو سکا
تنگی وہی رہی دل صد چاک کی ہوا — یہ غنچہ پاش پاش مگر گل نہ ہو سکا

ہجراں میں تجھ کو ہے مومنؔ تلاش زہر
غم پر حرام خوار توکل نہ ہو سکا

شوخ کہتا ہے بے حیا جانا — دیکھو دشمن نے تم کو کیا جانا
شعلۂ دل کو ناز تابش ہے — اپنا جلوہ ذرا دکھا جانا
اس کے اٹھتے ہی ہم جہاں سے اٹھے — کیا قیامت ہے دل کا آ جانا
پوچھنا حال یار ہے منظور — میں نے ناصح کا مدعا جانا

شکوہ کرتا ہے بے نیازی کا
تو نے مومنؔ بتوں کو کیا جانا

تبصرہ

اردو شعر و شاعری کے اس چوتھے دور کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔
ایسا محض سہولت کو مد نظر رکھ کر ہی نہیں کیا گیا بلکہ اس کی ضرورت بھی تھی

شعرائے لکھنؤ اور شعرائے دہلی کے کلام کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ دونوں مقامات کی شاہراہیں مختلف سمتوں میں جاتی ہیں۔ کیا بلحاظ زبان اور کیا بلحاظ رنگ شاعری حضرات لکھنؤ اور دہلی میں پورب پچھم کا فرق ہے۔ لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ نہایت اختصار کے ساتھ ان دونوں اسکولوں کی الگ الگ خصوصیات اور ان کا باہم فرق بتا دیا جائے۔ اسی ضمن میں اس مکمل دور کی خصوصیات اور اہمیت پر بھی روشنی پڑ جائے گی۔

لکھنؤ اور دہلی اسکولوں کی خصوصیات اور ان کا باہمی فرق سمجھنے کیلئے ان دونوں مقامات کے ملکی، سیاسی اور سوشل حالات کو ذہن نشین کرنا ضروری ہے۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ ملکی، سیاسی اور سوشل حالات علم و فن ہی پر نہیں بلکہ مکمل حیات انسانی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ بالفاظ دیگر انسان مع اپنے جملہ علم و ہنر، اعمال و کردار کے ان ہی سوشل حالات کا پرتو ہوتا ہے افراد کا مذاق۔ ان کا میلان طبع۔ ان کی شاعری بلکہ اس شاعری کا ایک ایک لفظ ان ہی حالات، کیفیات اور ماحول کی کارفرمائی کا آئینہ ہے۔

شمالی ہند میں اردو شعر و شاعری کی ابتدا ولی کے دہلی آنے یعنی ۱۷۲۲ء سے ہوئی۔ ہندوستان میں خاندان مغلیہ کا چراغ چراغِ سحری بنا ہوا تھا۔ محمد شاہ کے عہد میں گو درخت ہرا بھرا نظر آتا تھا۔ لیکن جڑ کو دیمک چاٹ گئی تھی رفتہ رفتہ وہ ہرا بھرا درخت بھی سوکھنا شروع ہوا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اکبر اعظم کی اولاد شاہ شطرنج بن کر رہ گئی۔ اور ان کی قلمرو سکڑ کر قلعہ معلّی دہلی میں سما گئی

آخری بادشاہ محض وظیفہ خوار تھے۔ ظاہر ہے کہ جب حکومت کا یہ حال ہو تو رعایا کا حال اس سے بھی ابتر ہوگا۔ دہلی اور گرد و نواح کا علاقہ گویا ایک جہاز تھا۔ آگے خطرناک بھنور اور پیچھے طوفان با دوباراں۔ ایسی حالت میں کہاں کی نیند اور کہاں کا عیش و عشرت۔ مان تشنہ ہی کے للے تھے۔

مشہور ہے کہ انسان رنج و غم کی حالت میں فلسفی اور مذہبی آدمی بن جاتا ہے اس کی نگاہیں سطح سے گذر کر دل کی گہرائیوں میں اترنے لگتی ہیں۔ حیات اور اس کے لوازم پر غور و خوض کرنے کا اس میں مادہ پیدا ہو جاتا ہے۔

شعرائے دہلی کو یہ فضا نصیب ہوئی۔ چنانچہ ان کا کلام ان ہی کیفیات کا حامل ہے۔ صوفیانہ خیالات سے بھرا ہوا ہے۔ کلام میں سوز و گداز دل کی اصلی کیفیت کو ظاہر کرتا ہے۔ جو بات ہے دل سے نکلی ہوئی ہے اور اسی لئے اثر رکھتی ہے۔ مختصر یہ کہ وہ حقیقی معنوں میں شاعر ہیں۔ بعض شاعر ایسے بھی نظر آئیں گے جو ہنسنے اور ہنسانے کی کوشش کریں گے۔ مگر ان کا ہنسنا زہر خندہ سے زیادہ نہیں۔

چوتھے دور کے شعراء ذوق۔ غالب۔ مومن اس پر آشوب عہد کے شعراء ہیں جس میں ہنگامۂ غدر کے لئے یا تو مواد پک رہا تھا۔ یا یہ پھوڑا پھوٹ رہا تھا دراں ان شعراء کے کلام کا غور سے مطالعہ کرو۔ لفظ لفظ میں سوز و گداز اور حرف حرف میں درد مندانہ کیفیت موجود ہے۔ دماغ سوچنے کے بجائے دل محسوس کرنے کے اور نگاہیں تہ میں بیٹھ جانے کی عادی ہیں۔ جو بات کہتے ہیں دل سے

نکلی ہوئی اور اثر میں ڈوبی ہوئی۔ ان کا عشق سچا ہے۔ ان کا معشوق حسن ہے۔ کوئی حسین نہیں۔ تعریف حُسن کی ہے۔ کسی حسین کی نہیں۔ غرض یہ کہ عشق و حسن کے ظاہری لوازمات پر ان کی نظر نہیں ٹھہرتی۔

مرزا سودا کے عہد سے دہلی اجڑنی شروع ہوئی جسے دیکھئے لکھنؤ کی طرف کھچا جاتا ہے۔ آخر لکھنؤ میں وہ کیا بات تھی کہ ہر کس و ناکس کا ملجا و ماوا شاہوا تھا۔ وہ بات یہ تھی کہ اودھ میں نسبتاً امن و امان کا دور دورہ تھا والی فیاض اور علم و فضل کے قدرداں تھے۔ دولت کی فراوانی تھی اور اسے بے دریغ خرچ کیا جاتا تھا۔

شاہان اودھ میں نواب سعادت علی خاں خود شاعر اور شاعروں کے قدرداں تھے۔ ان کے بیٹے غازی الدین حیدر بھی شاعری کا ذوق رکھتے تھے۔ ان کے بیٹے نصیر الدین حیدر بھی شاعر تھے۔ مزاج میں لاابالی پن اور لہو و لعب حد سے زیادہ تھا۔ مے نوشی حد اعتدال سے متجاوز ہو گئی تھی۔ دس برس اور تاریخ روز سلطنت کی اور اس قلیل مدت میں محاصل ملک کے علاوہ بیس کروڑ روپیہ منجملہ اندوختہ نواب سعادت علی خاں صرف میں آیا۔ نصیر الدین حیدر کے بعد محمد علی شاہ اور ان کے بعد امجد علی شاہ اور سب سے آخر میں واجد علی شاہ ہوئے۔ انہوں نے تو سرپرات کی حد کر دی۔ پچیس سال کی عمر میں تخت نشین ہوئے۔ مصاحبوں نے کمسن اور ناتجربہ کار سمجھ کر ڈورے ڈالنے شروع کئے۔ اور آخر واجد علی شاہ کو جان عالم پیا کہہ کے چھوڑا۔ دو کروڑ

روپیہ لگا کر قیصر باغ بنوایا۔ جو حقیقت میں عیش منزل اور عشرت کدہ تھا ہزاروں مہ لقا رشک حور ارباب نشاط سے رشک ارم بنا ہوا تھا۔ اور واجد علی شاہ ان کے حسن و شباب کے تنہا مالک تھے۔ ان بے اعتدالیوں کا جو نتیجہ خود بادشاہ کے حق میں ہوا وہ اس کتاب کے موضوع سے خارج ہے البتہ جو نتیجہ اردو ادب کے لئے مترتب ہوا اس کا تذکرہ کرنا ضروری ہے۔

بادشاہوں کی حالت کا دھندلا سا نقشہ دیکھ چکے۔ خود سمجھ لو کہ رعایا کی کیفیت کیا ہوگی۔ بچہ بچہ اسی رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ عام عیش و عشرت بےفکری، فراوانی دولت، اس عہد کی خصوصیات ہیں۔

جہاں رنج و غم کی حالت میں انسان مذہبی اور فلسفی بنجاتا ہے۔ وہاں خوشی، مسرت اور بے فکری کی حالت میں سبک خیال اور چھچھورا بنجاتا ہے یاس عظیم آبادی کیا خوب فرماتے ہیں ؎

بجز ارادہ پرستی خدا کو کیا جانے ۔۔۔ وہ بد نصیب جسے بخت نارسا نہ ملا

خیالات میں گہرائی نہ ہو اور ہزاروں مہ جبین روبرو عشوہ فروش ہوں تو نگاہیں سو بار اٹھیں اور دوپٹے میں الجھ کر نہ رہ جائیں تو کیا کریں۔ آرزوئیں ہجر و فراق کی خوگر نہ ہوں اور جام وصال کا دور چل رہا ہو تو عشق بوالہوسی کا مرادف کیوں نہ بنے۔ شربت وصال نے آتش دل کو سرد کر دیا ہو تو جذبات کہاں سے پیدا ہوں۔ اور جب جذبات پیدا نہ ہوں تو انداز بیان میں صفائی، سادگی اور صداقت کیونکر پیدا ہو۔ ناچار تکلف

آورد اور تصنع سے کام لینا پڑتا ہے۔ مضمون کے مارے آسمان سے اتارے جاتے ہیں۔ موشگافیاں کی جاتی ہیں۔ کوہ کنی کرنی پڑتی ہے اور جوئے شیر کے عوض گھاس کا تنکا نکال کر لایا جاتا ہے اور جب ان تکلفات لایعنی سے بھی کام نہیں چلتا اور اثر پیدا نہیں ہوتا تو پھبتی کے زور سے اور ضلع جگت کی مدد سے لوگوں کے دلوں پر کاوش جستجو اور دقت نظر کا سکہ بٹھایا جاتا ہے۔ آخر تسلیمؔ گھبرا کر چلا اٹھتے ہیں ؎

میں ہوں اے تسلیمؔ شاگرد نسیمؔ دہلوی　　مجھ کو طرز شاعران لکھنؤ سے کیا غرض

لیکن ان تکلفات باردہ سے زبان اردو نے خوب فائدہ اٹھایا۔ خوب منجھ کر صاف ہوئی اور اس کی وسعت بڑھ گئی۔ اور انصاف تو یہ ہے کہ دہلی کی نسبت لکھنؤ کی زبان میں زیادہ فصاحت۔ زیادہ بلاغت زیادہ لطافت اور زیادہ وسعت پیدا ہو گئی۔ چنانچہ حسرتؔ موہانی نے ازرہ انصاف ایک شعر میں دہلی کی شاعری اور لکھنؤ کی زبان کی تعریف کی ہے ؎

ہے زبان لکھنؤ میں رنگ دہلی کی نمود　　تجھ سے حسرتؔ نام روشن شاعری کا ہو گیا

واضح ہو کہ لکھنؤ اور دہلی اسکولوں کا جو یہ فرق دکھایا گیا ہے وہ اب موجود نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ کاغذ کی ناؤ ہمیشہ نہیں چل سکتی جب وہ بے اعتدالیاں حد سے بڑھ گئیں تو بقول حفیظؔ جالندھری ؎

تنزل کی بس انتہا چاہتا ہوں　　کہ شائد یہی ہو ترقی کا زینہ

شعرائے لکھنؤ ہی میں سے چند برگزیدہ شعرا نے علم بغاوت بلند کیا۔ اور ان سب بدعنوانیوں کا قلع قمع کر کے رکھ دیا۔ ان

برگزیدہ شعراء کا تذکرہ آئندہ ادوار میں آتا ہے۔ آج لکھنؤ اور دہلی کی شاعری ایک ہے۔ البتہ زبان میں کچھ فرق ہے۔ اور وہ بھی فروعی۔ یعنے چند الفاظ کی تذکیر و تانیث اور چند الفاظ کے تلفظ کے متعلق۔

آخر میں اگر اردو کی مایۂ ناز صنف مرثیہ نگاری کی طرف اشارہ نہ کیا گیا تو بحث نامکمل رہ جائے گی۔

واضح ہو کہ شاہان اودھ اعتقاداً و عملاً امامیہ مذہب سے تعلق رکھتے تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ لکھنؤ اور مضافات میں مذہب امامیہ کا زیادہ رواج تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لکھنؤ میں صنف مرثیہ نگاری کو بڑا فروغ ہوا۔ فروغ ہی نہیں ہوا۔ بلکہ یہ صنف ترقی کرکے باقی تمام اصناف پر فوقیت لے گئی۔ برخلاف اس کے دہلی میں مرثیہ کا سراغ نہیں ملتا۔ غالب نے کوشش کرکے ایک مرثیہ لکھا۔ مگر انصاف کہتا ہے کہ شعرائے دہلی خواہ امامیہ مذہب ہی سے تعلق رکھتے ہوں اس میدان کے مرد نہیں۔

مرثیہ کی عالمگیری اور ہر دلعزیزی نے لکھنؤ کی غزل پر ایک خاص اثر ڈالا جو اسی زمانے تک محدود نہیں رہا۔ بلکہ آجکل بھی پایا جاتا ہے وہ یہ کہ سوز و گداز کو جو غزل کی جان تھی آہ و بکا اور نالہ و فریاد میں تبدیل کر دیا۔ بعض شعراء کے کلام پر مرثیت چھا گئی۔ علالت، موت۔ آہ و زاری اور ماتم کے مضامین اس کثرت سے بندھے کہ خاص خاص الفاظ اور اصطلاحیں

زبان زدِ خاص و عام ہوگئیں۔ مثلاً عشق کو مرض کہا گیا ہے۔ اور اضطراب، شوق کو نزع۔ نزع کے بعد موت کا آنا لازمی ہے اور موت پر ماتم کرنا ضروری۔ نتیجہ یہ نکلا کہ غزل کی صاف اور شیریں زبان میں وہ وہ الفاظ آگئے جو غالباً مرثیہ ہی کے لئے موزوں تھے۔ مثلاً نوحہ۔ ماتم۔ میّت۔ جنازہ۔ تربت گورِ غریباں۔ لوحِ مزار وغیرہ۔

اگلے صفحہ پر بطور خلاصہ دہلی و لکھنؤ اسکولوں کی خصوصیات کا نقشہ پیش کیا جاتا ہے۔

بہ لحاظ	دہلی اسکول	لکھنؤ اسکول
زبان	صاف، سادہ، رواں، بے تکلف	پُر تکلف، تصنع، آورد، صنائع و بدائع، اظہار علم و فضل
شاعری	جذبات و احساسات	مضمون آفرینی، خیال بندی
	اثر	بے اثری
	تصوف و فلسفہ	×
	اخلاق پر اثر	اخلاق شاعرانہ استدلال اور تمثیل میں ڈوبا ہوا
	عشق	ہوس
	حسن کی تعریف	لوازمات حسن کی تعریف
صنف شاعری	×	مرثیہ (جذبات نگاری، کردار نویسی۔ اخلاق۔ منظر نگاری۔ مذہبی بیانات مسلسل روایات)
خدمت زبان	زبان کی نزاکت، خوشنما فارسی تراکیب۔ محاورات، ضرب الامثال	زبان کی صحت۔ اصول کی پابندی۔ متروکات قواعد تذکیر و تانیث۔

باب ۹

اردو شعر و شاعری کا پانچواں دور

تمہید گذشتہ ابواب میں متعدد بار اشارۃً عرض کیا جا چکا ہے کہ غدر ۱۸۵۷ء سے بہت قبل دہلی کی حالت خراب ہو چکی تھی۔ تاہم خاندان مغلیہ کے آخری چشم و چراغ اپنی ہمت سے زیادہ ارباب ہنر کی قدر و منزلت کرتے تھے۔ بہادر شاہ اگرچہ پنشن خوار تھے لیکن شعرا کی پرورش کرتے رہتے تھے۔ ہنگامہ غدر نے ان رہے سہے قدر دانوں کو بھی نیست و نابود کر دیا۔

دہلی سے اجڑنے والوں کا ملجا و ماوا لکھنؤ تھا۔ لیکن ۱۸۵۶ء میں انتزاع سلطنت اودھ کے بعد لکھنؤ کی بھی وہ حالت نہ رہی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ دہلی اور لکھنؤ کے شعرا خانماں برباد ادھر سے ادھر پھرنے لگے۔ انگریزی حکومت کے ارباب حل و عقد زبان اردو اور اس کے ادب کی قدر و قیمت کیا سمجھ سکتے تھے لے دے کے چند دیسی ریاستیں تھیں جہاں شعر و سخن کی اس گئی گذری حالت میں بھی قدر کی جاتی تھی۔ چنانچہ دہلی اور لکھنؤ کے شعرا نے رامپور حیدرآباد۔ جے پور۔ ٹونک اور دیگر ریاستوں کا رخ کیا۔ اور کسی نہ کسی طرح تنگی ترشی سے زندگی کے بقیہ ایام گزار دئے۔

شعرائے دہلی شعرائے دہلی جو غدر کے بعد تلاش معاش میں سرگرداں ادھر سے ادھر پھیرے تین ہیں۔ (۱) ظہیر (۲) انور (۳) داغ۔

شعرائے لکھنؤ لکھنؤ کے شعراء کی ایک بڑی تعداد تو مٹیا برج کلکتہ میں واجد علی شاہ کے ہمراہ تھی۔ باقی چند ادھر ادھر منتشر ہو گئے جن میں سے بحر، منیر، قلق، اسیر اور امیر نواب صاحب رامپور کی ادب نوازی کے سہارے میں رامپور پہنچے۔

قبل اس کے کہ اس دور کے دو خاص نمائندوں یعنی داغ دہلوی اور امیر لکھنوی کا تذکرہ کیا جائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ظہیر اور انور کا مختصر تذکرہ اس تمہید میں کر دیا جائے کیونکہ یہ دو ہستیاں وہ ہیں جنھوں نے ٹونک اور جے پور میں مذاق شاعری کو عام کر کے وہاں شعرائے کی ایک جماعت پیدا کر دی۔

ظہیر سید ظہیر الدین نام۔ ظہیر تخلص خلف سید جلال الدین مہدر خوشنویس دہلی کے رہنے والے ذوق کے شاگرد تھے۔ غدر کے بعد مختلف مقامات میں قسمت آزمائی کرنے کے بعد رامپور پہنچے اور چار سال وہاں قیام کیا۔ اس کے بعد دہلی واپس آئے۔ یہاں کمیٹی میں ایک معمولی اسامی پر آپ کا تقرر ہو گیا۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد جلوہ طور بلند شہر کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ اسی دوران میں مہاراجہ شیو دیان سنگھ والیٔ الور نے آپ کو طلب کیا چار سال آپ وہاں رہے لیکن کسی وجہ سے وہ مقام بھی راس نہ آیا۔ غلام مصطفےٰ خاں شیفتہ کی سفارش سے جے پور پولیس میں آپ کسی اسامی پر مامور ہو گئے۔ جہاں انتیس سال

ٹنک رہے۔ مہاراجہ رام سنگھ والیٔ جے پور کے مرنے کے بعد آپ ٹونک گئے۔ اور چودہ سال وہاں مقیم رہے۔ آخر میں آپ حیدرآباد پہنچے۔ مگر قسمت نے یاوری نہ کی، اور امیدواری کے دوران ہی میں راہی ملک بقا ہوئے، تاریخ وفات ۱۹۱۱ء ہے۔

ظہیر بڑے پائے کے شاعر تھے، اگرچہ ذوق کے شاگرد تھے لیکن ان کے کلام میں مومن کا رنگ زیادہ ہے۔ ان کے تین دیوان شایع ہو چکے ہیں، چوتھا دیوان ان کے خاندان میں مخطوط ہے۔

انور سید شجاع الدین نام، امراؤ مرزا عرف، انور تخلص ظہیر کے چھوٹے بھائی اور ذوق کے شاگرد تھے، ذوق کی وفات کے بعد غالب کو بھی کلام دکھایا۔ طبیعت نہایت دقت پسند اور مضمون خیز پائی تھی طرز مومن کے پورے پورے مقلد اور غالب کے استعارہ بالکنایہ کی خوش اسلوب ترکیب کے پیرو تھے، الغرض ذوق، غالب اور مومن کے جداگانہ طرزوں کو سمو کر ایک خاص رنگ ایجاد کیا تھا۔

دستبرد غدر سے پریشان ہو کر جے پور جا رہے تھے، آخر وہیں ۴۳ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ یوں تو انور کی استادی کا سکہ جے پور میں اب تک رائج ہے، اور رہے گا، لیکن ان کے فخر استاد شاگرد مولانا اشفاق رسول جوہر جو ۱۹۳۵ء میں فوت ہوئے، خاکسار راقم الحروف نے حضرت جوہر کا کلام خود ان ہی کی زبانی سنا تھا۔ ایک شعر ہدیہ ناظرین ہے۔

جدھر جھک گئی وہ ہی کعبہ ہوا   جبیں اپنی قبلہ نما ہو گئی

انوؔر بہت بڑے شاعر تھے لیکن ان کا کلام بہت کچھ ضائع ہو گیا لالہ سری رام دہلوی مؤلف "خمخانۂ جاوید" نے ایک دیوان مرتب کرکے شائع کیا تھا جس کے متعلق مؤلف فرماتے ہیں، کہ ان کے کلام کا آٹھواں حصہ بھی نہیں ہے۔ اسی طرح مولانا جوہرؔ مرحوم نے بھی ایک مجموعۂ کلام انورؔ کا شائع کیا تھا۔ تبرک کے طور پر ایک شعر انورؔ کا ملاحظہ ہو۔۔

نہ ہم سمجھے نہ آپ آئے کہیں سے   پسینہ پونچھئے اپنی جبیں سے

داغؔ دہلوی نواب مرزا خاں داغؔ دہلوی ۱۲۴۱ھ میں پیدا ہوئے۔ ابھی عمر کے چھ سات سال ہی گذرے تھے کہ سایۂ پدری سے محروم ہو گئے۔ انکی والدہ نے بہادر شاہ کے بیٹے مرزا فخرو سے نکاح کر لیا۔ اس طرح قلعۂ معلی دہلی سے آپ کا مستقل تعلق ہو گیا۔ اور اس تعلق کی بدولت جو خصوصیت اور آسانیاں تعلیم میں آپ کو نصیب ہوئیں وہ عام طور سے اور لوگوں کو میسر نہیں آسکتیں، سپاہگری کے کمالات فنوں کے علاوہ شعر و سخن کا شوق طبیعت میں پیدا ہوا، قلعۂ معلی میں شاعری کی گرم بازاری تھی، آپ کی خداداد ذہانت اور ہونہار طبیعت کا رجحان اس طرف زیادہ رہا، ذوقؔ بادشاہ اور ولیعہد کے استاد تھے، داغؔ بھی ان ہی کے شاگرد ہوئے۔ اس وقت آپ کا سن گیارہ بارہ برس کا تھا۔

ہنگامۂ غدر سے دس ماہ پیشتر ولیعہد مرزا فخرو کا انتقال ہو گیا، اور پھر غدر نے عیش و عشرت کی بساط کو الٹ دیا۔ اس انقلاب کے بعد مع اپنے قبائل کے رامپور چلے گئے، اور نواب یوسف علیخاں کے سایۂ عاطفت

میں پناہ گزیں ہوئے نواب صاحب اپنی حیات تک بطور مہمان نوازی سلوک کرتے رہے، ان کے بعد نواب کلب علی خاں نے بھی وہی قدردانی کی، اور مرزا صاحب کو اپنی مصاحبت میں رکھا اور بطور معتمد خاص کارخانہ جات، اصطبل و گاڑی خانہ وغیرہ سپرد کیا، ۴۳ سال تک مصاحبت کے ساتھ ان خدمات کو نہایت خوبی سے انجام دیتے رہے،

رامپور میں نواب یوسف علیخاں ناظم کے زمانے سے شعر و سخن کی گرم بازاری تھی غالب، نیر، بحر، قلق، عروج، انیس، منیر، تسلیم، جلال، امیر مینائی وغیرہم سب نامی شعرا ریاست کے دعاگو تھے، اور بحر، غالب مرحوم سب میں قیام رکھتے تھے، مشاہیر وارد ہوتے تھے اور خاص نواب صاحب کی طرف سے مشاعرے ہوا کرتے تھے، سرکاری مشاعروں کا اہتمام و انتظام مرزا داغ صاحب ہی کے سپرد ہوتا تھا، اور مشاعرے میں ان کی غزل پر لوگوں کی نگاہیں رہا کرتی تھیں

چالیس سال کے قیام کے بعد آپ نے رامپور کو خیرباد کہا، مختلف شہروں کی سیر و سیاحت کے بعد حیدرآباد پہنچے، تین سال کی امیدواری کے بعد میر محبوب علی خاں نظام دکن کے استاد مقرر ہوئے، ایک ہزار روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر ہوا، اور ورود حیدرآباد کے وقت سے اس تاریخ تک ایک ہزار روپے ماہوار کے حساب سے مرحمت فرمایا گیا، گویا نقصان کی تلافی بھی شاہانہ الطاف کی بدولت کما حقہ ہوگئی، علاوہ اس مقررہ وظیفہ کے وقتاً فوقتاً جو عطیات شاہی ہوئے ان کی تفصیل بے شمار ہے، آخر اٹھارہ برس حیدرآباد میں بعزت

آپ نے بسر کر کے ۱۷ فروری ۱۹۰۵ء کو آٹھ روز مرض فالج میں مبتلا رہ کر دار فانی سے
انتقال فرمایا ۔

مرزا صاحب کے تین دیوان اور ایک مثنوی مطبوعہ موجود ہیں، اور چوتھا
دیوان "یادگار داغ" بھی تیار تھا چاروں دیوانوں میں "گلزار داغ" اور "آفتاب داغ"
زمانہ قیام رامپور کے چھپے ہوئے ہیں، ان دیوانوں میں اکثر وہی غزلیں ہیں جو
کے مشاعروں میں کہی گئی تھیں۔ "مہتاب داغ" یہ حیدرآباد کے قیام کا نتیجہ ہے
مثنوی "فریاد داغ" زمانہ قیام رامپور میں لکھی گئی تھی۔ "یادگار داغ" نامی چوتھا دیوان
مرزا داغ کی وفات کے بعد [illegible] چھپ کر شائع ہوا۔

مرزا داغ غزل گوئی کے مسلم الثبوت استاد اور اپنے عہد میں بے نظیر
شاعر تھے جو اصناف سخن پر قادر تھے ان کے کلام کا خاص رنگ سہل ممتنع
فصاحت، روزمرہ کی صفائی، شوخی مضمون اور بیان کی ندرت ہے، زبان کی
شستگی اور بندش کی چستی ... ان میں شوخی اور تیکھا پن اس طرح
کر شعر بے مثل ہو جاتا ہے، اور ... لطف بغیر نہیں رہتا، ... ادا کے
ولفریب نظارے، اشارات کی نوک جھونک کے مضمون جس صفائی اور نفاست
سے ان کے دیوانوں میں پائے جاتے ہیں وہ ان ہی کا حصہ ہے، چونکہ کلام
میں معاملہ بندی، شباب اور رنگینی کی تصویریں جا بجا ہیں، لہذا کہیں کہیں تصویریں
عریاں بھی ہو گئی ہیں، اور کہیں کہیں شوخی حد سے تجاوز کر کے ابتذال کی حد تک
پہنچ گئی ہے۔

مرزا صاحب کی شہرت خاص و عام اور قبول عام کا ثبوت اس امر سے

ملتا ہے کہ ہندوستان کے گوشے گوشے میں شعراء کی کثیر تعداد آپ کے تلمذ سے مستفید ہوئی اور بہت قدر اچھے شاعر آپ نے ملک میں پیدا کئے۔ اس کی نظیر دیکھنے میں نہیں آئی کل شاگردوں کی تعداد ڈیڑھ ہزار کے قریب ہے جن میں سے بعض ارشد تلامذہ کے نام ذیل درج کئے جاتے ہیں، بیخود بدایونی، احسن مارہروی، نوح ناروی، نسیم بھرتپوری، بیخود دہلوی، آغا شاعر دہلوی، آزاد، حیرت، باغ سنبھلی، جگر مرادآبادی، ڈاکٹر اقبال، سائل دہلوی وغیرہم۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

عجب اپنا حال ہوتا جو وصال یار ہوتا ۔۔۔ کبھی جان صدقے ہوتی کبھی دل نثار ہوتا
کوئی فتنہ تا قیامت نہ پھر آشکار ہوتا ۔۔۔ ترے دل پہ کاش ظالم مجھے اختیار ہوتا
جو تمہاری طرح تم سے کوئی جھوٹے وعدے کرتا ۔۔۔ تمہیں منصفی سے کہہ دو تمہیں اعتبار ہوتا
غم عشق میں مزا تھا جو اسے سمجھ کے کھاتے ۔۔۔ یہ وہ زہر ہے کہ آخر مے خوشگوار ہوتا
نہ مزا ہے دشمنی میں نہ ہے لطف دوستی میں ۔۔۔ کوئی غیر غیر ہوتا کوئی یار یار ہوتا
یہ مزا تھا دل لگی کا کہ برابر آگ لگتی ۔۔۔ نہ تجھے قرار ہوتا نہ مجھے قرار ہوتا
ترے وعدے پر ستمگر ابھی اور صبر کرتے ۔۔۔ اگر اپنی زندگی کا ہمیں اعتبار ہوتا
یہ وہ درد دل نہیں ہے کہ ہو چارہ ساز کوئی ۔۔۔ اگر ایک بار مٹتا تو ہزار بار ہوتا
گئے ہوش تیرے زاہد جو وہ چشم مست دیکھی ۔۔۔ مجھے کیا الٹ نہ دیتی جو نہ بادہ خوار ہوتا
مجھے مانتے سب ایسا کہ عدو بھی سجدے کرتے ۔۔۔ در یار کعبہ بنتا جو مرا مزار ہوتا

تمہیں ناز ہو نہ کیونکر کہ لیا ہے داغ کا دل
یہ رقم نہ ہاتھ لگتی نہ یہ افتخار ہوتا

یہ داغ نہ کب آلودۂ شراب نہ تھا | خراب آج ہوا آج تک خراب نہ تھا
وہ رات کونسی گذری جو اضطراب نہ تھا | جب آنکھ دی تھی نصیبے نے مجھے خواب نہ تھا
جواں ہوئے تو قیامت بنے خدا کی پناہ | وہ جب بھی فتنہ تھے جب عالم شباب نہ تھا
وہ پہنچے غیر کے گھر جان کر شب وعدہ | ہمارے روز سیہ میں جو آفتاب نہ تھا
کل اس نگاہ میں شوخی تھی کس قیامت کی | ڈرا ہوا تو مرے دل کا اضطراب نہ تھا
اگرچہ بادہ کشی تھی گناہ اے زاہد | جو تجھ سے کمین کے پیتا تو کچھ عذاب نہ تھا
میرے سوال کے معنی وہ مجھ سے کہہ دیتے | مگر سوال کا میرے کوئی جواب نہ تھا
ہزار پردوں میں مشتاق دیکھ لیتے ہیں | اسے حجاب خموشی کو تو حجاب نہ تھا
وہ جب چلے تو قیامت بپا تھی چار طرف | ٹھہر گئے تو زمانے کو انقلاب نہ تھا
ہمارا دل یہ داغ کا نشاں اتنا | جلے کباب کی بو تھی مگر کباب نہ تھا
نہ پوچھ مجھ سے میرے جرم داور محشر | میرے گناہ تو نکلا دیا میں بھی حساب نہ تھا
میرے سوا تری محفل میں رات کو ظالم | وہ کون تھا کہ جو ناکامیاب نہ تھا

بغیر داغ کے جنت تمہاری بزم رہی
ہزار شکر کہ وہ خانماں خراب نہ تھا

جلوے مری نگاہ میں کون و مکاں کے ہیں | مجھ سے کہاں چھپیں گے وہ ایسے کہاں کے ہیں
کھلتے نہیں ہیں راز جو سوز نہاں کے ہیں | کیا پھوٹنے کے واسطے چھالے زباں کے ہیں
کیا اضطراب شوق نے مجھ کو خجل کیا | وہ پوچھتے ہیں کہیے ارادے کہاں کے ہیں
کیسا جواب حضرت دل دیکھیے ذرا | پیغامبر کے ہاتھ میں ٹکڑے زباں کے ہیں
بار دو کھلنے تم نے لگا کر ہزار ہا تھ | پیسے پڑیں تو دیکھ بہت امتحان کے ہیں

جس دن سے کچھ شریک ہوئی میری مشت خاک — اس روز سے زمیں پہ تحمل آسماں کے ہیں
قاصد یہاں سے برق تقاضا بصف باد سے — بیمار کی ہے چال قدم ناتواں کے ہیں
کرتے ہیں قتل وہ طلب مغفرت کے بعد — جو تھے دعا کے ہاتھ وہی امتحاں کے ہیں

عاشق ترے عدم کو گئے کس قدر تباہ
پوچھا ہر ایک نے یہ مسافر کہاں کے ہیں!

عرصۂ حشر میں اللہ کرے گم مجھ کو — اور پھر ڈھونڈتے گھبرائے پھریں تم مجھ کو
غیرت ماہ کہے سرو انجم مجھ کو — نام کو داغ ہوں کیا جانتے ہو تم مجھ کو
نہ کہے مستیٔ دل جو سر گرم تکلم مجھ کو — کہے واعظ بھی کہ اللہ کوئی گم مجھ کو
جب گئی کہہ کے گئی میری دعا سے تاثیر — گم کرے مجھ کو صدا تو نے کیا گم مجھ کو
ضعف نے نام کو تھوڑا سا نشاں رکھا تھا — تو نے اے بیخودیٔ شوق کیا گم مجھ کو
دیکھ اے وادیٔ ایمن مجھے وہ خاک ہوں میں — کہ فرشتوں نے لیا بہر تیمم مجھ کو
کیا کرے دیکھیے کوثر پہ مری تشنہ لبی — سوکھا جاتا ہے یہاں دیکھ کے قلزم مجھ کو
جب سے آنکھوں میں سمائی ہیں وہ کافر پتلیاں — رات دن اپنی نظر سے ہے توہم مجھ کو
ضبط وہ شے ہے کہ اے حضرت موسیٰ کچھ — آپ وہ دیتے ہیں تکلیف تکلم مجھ کو
معجزہ حضرت عیسیٰ کا غلط بھی تو نہیں — درد اٹھتا ہے وہ کہتے ہیں اگر قم مجھ کو

میں بھی حیران ہوں اے داغ کہ ہے کیا بات
وعدہ وہ کرتے ہیں آتا ہے تبسم مجھ کو!

رخ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں!
ادھر جاتا ہے دیکھیں یا ادھر پروانہ آتا ہے

خاطر سے یا لحاظ سے میں مان تو گیا — جھوٹی قسم سے آپ کا ایمان تو گیا

بچھ سے ہے بتکدے میں لے شیخ کچھ نہ پوچھ — ایمان کی تو یہ ہے کہ ایمان تو گیا

جان ماہ وش اجڑی ہوئی منزل میں رہتے ہیں

کہ جس کی جان جاتی ہے اسی کے دل میں رہتے ہیں

عکس بھی آئینے میں چار گھڑی بعد آیا — بڑھ گئی حد سے سوا ان کی نزاکت کیسی

نہیں کھیل اے داغ یاروں سے کہدو — کہ آتی ہے اردو زباں آتے آتے

شاگردانِ داغ

بیخود دہلوی سید وحید الدین نام، بیخود تخلص، خاص دہلی کے رہنے والے داغ کے شاگرد بلکہ جانشین اور اس رنگ کے استاد تھے، داغ ان کی زباندانی اور مہارت فن کا اعتراف کیا کرتے تھے، داغ کی زبان ان کی زبان ہے، فصاحت روزمرہ کے ساتھ خیال بندی کی طرف زیادہ میلان ہے، بڑے خلیق، ملنسار، زندہ دل اور پابند وضع شخص تھے، پیرانہ سالی کے ساتھ مٹیا محل دہلی میں گوشہ نشین تھے دیوان شائع ہو چکا ہے چند ماہ ہوئے اسی سال ۱۹۵۵ء میں رحلت فرمائی نمونہ کلام یہ ہے

نگاہ غیر کی جانب خطاب مجھ سے — تری قسم کا یقیں اب ضرور میں نے کیا

تماسی شاطر ندیکھی نہ دیکھیں — تصور میں نقشے جماتی ہے کیا کیا

نہ دیکھا تھا جو بزم دشمن میں دیکھا — محبت تماشے دکھاتی ہے کیا کیا

ٹوٹنے سے اور پیدا دل میں جوہر ہو گیا — قیمتی شیشہ ہمارا بال پڑ کر ہو گیا

کیا اسی کا نام الفت ہے کہ جب دیکھا اسے — خود بخود اک جوش پیدا دل کے اندر ہو گیا

ناپ لیجئے اپنے گیسو کی درازی قد سے آپ — اب تو یہ فتنہ قیامت کے برابر ہو گیا

آنکھ کہتی ہے کہ اب ربط کرتے ہیں تجھے　　منہ سے یہ ارشاد ہے دل میں ترا گھر ہو گیا

سائل دہلوی ابوالمعظم نواب سراج الدین احمد خاں المتخلص بہ سائل دہلوی خاندانی وقار کے ساتھ ذاتی قابلیت کے مالک ہیں نواب مرزا خاں داغ دہلوی کے داماد اور ان ہی کے شاگرد رشید ہیں، ۶۷-۶۸ سال کی عمر ہے، اور لال کنواں واقع دہلی میں اقامت گزین ہیں -

سائل حسن صورت اور وجاہت شخصی کے ساتھ وضعداری، اخلاق اور خلوص کی صفت سے متصف ہیں، راقم الحروف آپ کی خدمت میں اکثر حاضر ہوتا رہتا ہے، نہایت شگفتہ طبیعت پائی ہے، اور زباندانی تو خاص آپ کا حصہ ہے اردوئے معلی کے انے گنے نام لیوا بزرگوں میں آپ کا دم غنیمت ہے، ان چند بزرگوں کے بعد دلی کا نام ہی نام رہ جائے گا

سائل صاحب کو جملہ اصناف سخن پر قدرت حاصل ہے، مگر غزل میں مسلم الثبوت استاد ہیں، محاورہ کی خوبی روزمرہ کی صفائی، سلاست اور روانی آپ کی زبان کی خصوصیات ہیں، آپ کی غزل حدود غزل سے باہر نہیں نکلتی حسن و عشق کے علاوہ فلسفیانہ اور صوفیانہ مضامین کو اس میں دخل نہیں، کلام میں شوخی کی نمکینی اور شگفتگی کی شیرینی عجب لطافت پیدا کر دیتی ہے، مبتذل اور عامیانہ مضامین سے آپ کا کلام پاک ہوتا ہے، البتہ کہیں کہیں ایسے الفاظ لے آتے ہیں، جو اکثر عوام ہی کی زبان سے سنے جاتے ہیں،

سائل مومن کی طرح مقطع میں اپنے تخلص کو خوب کھپاتے ہیں ۱؎ اس

۱؎ قیام پاکستان سے کچھ عرصہ قبل سائل نے انتقال فرمایا، تاریخ وفات معلوم نہ ہو سکی،

طرح کہ مقطع اور تخلص دونوں میں جان پڑ جاتی ہے، کلام ہنوز شائع نہیں ہوا، اگر کبھی ہوا، تو کئی جلدوں میں ہوگا، نمونہ کلام یہ ہے،

عارض بھی سرخ سرخ ہیں لب لال لال بھی	شانِ جمال بھی ہے نمایاں جلال بھی
توبہ بھی کرنی پڑتی ہے پی کر اسے مدام	نام اس کا مے بھی ہے عرقِ انفعال بھی
فصلِ گل اب آگئی وحشت کا ساماں دیکھیے	سنگِ طفلاں دیکھیے خارِ بیاباں دیکھیے
دعویٰ یاراں گنہگاری گر میرا باور نہیں	تیر کچھ دل میں چبھو کر انکے پیکاں دیکھیے
کیوں کسی سے پوچھیے خستہ سری کا ماجرا	نقش لکھوا کر در و دیوارِ زنداں دیکھیے
ہمیں کبھی ہنسنے نہ دو زخمِ جگر والے	ذرا تم بھی تو دیکھو تم بھی ہو آخر نظر والے
اب بھی سو دیکھوں یوں قاتل کو تو پہچان لوں	بھولی بھالی شکل تھی اور کچھ بھلا سا نام تھا

احسن مارہروی

حافظ سید شاہ علی احسن قصبہ مارہرہ کے ایک مقدس خاندان کے چشم و چراغ تھے، سن ولادت ۱۸۷۶ء ہے، قرآن پاک حفظ کرنے کے بعد اردو، فارسی اور عربی کی تعلیم پائی، طالب علمی کے زمانہ میں اپنے والدین کے ہمراہ حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے، سترہ سال کی عمر میں والدین کا سایہ سر سے اٹھ گیا، جس سے آپ کی مذہبی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہوگیا اٹھارہ سال کی عمر میں یعنی ۱۸۹۳ء میں فصیح الملک مرزا داغ دہلوی سے بذریعہ خط و کتابت تلمذ حاصل کیا اور تین سال بعد حیدرآباد پہنچے اور مسلسل چند سال استاد کی خدمت میں حاضر رہ کر فن شعرگوئی کی تکمیل کی،

حضرت احسن کی پہلی تصنیف "جلوہ داغ" ہے، جو مرزا داغ کی سوانح عمری ہے، آپ نے اپنے استاد کی یادگار میں "فصیح الملک" نامی رسالہ بھی نکالا، جو

۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۰ء تک جاری رہا، اس کے علاوہ مرزا داغؔ کا چوتھا دیوان "یادگارِ داغ" کے نام سے بڑے اہتمام سے شائع کیا، آپ "خم خانۂ جاوید" مولفہ لالہ سری رام دہلوی کی پہلی جلد کی تدوین میں بھی شامل تھے، اور اس سلسلہ میں ایک سال کے قریب لاہور مقیم رہے، پھر حیدرآباد میں آپ کو امیرؔ مینائی کی ہم نشینی کا موقع ملا۔

"انجمن ترقی اردو" کی فرمائش پر آپ نے دلّی اورنگ آبادی کا دیوان مرتب کر کے اس پر مبسوط مقدمہ تحریر کیا، اس کے علاوہ آپ کی سب سے زیادہ قابلِ قدر تصنیف "تاریخ نثرِ اردو" ہے۔

آپ ۱۹۲۱ء سے ۱۹۳۸ء تک مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں شعبۂ اردو کے لکچرار رہے، اس ملازمت سے سبکدوش ہو کر وطن مالوف مارہرہ میں قیام پذیر ہوئے، لیکن افسوس ۳۰ر اگست ۱۹۴۰ء کو مختصر علالت کے بعد داعیٔ اجل کو لبیک کہا انا للہ!

سیمابؔ اکبرآبادی مرحوم اپنے مضمون "رحلتِ احسن الشعراء" مطبوعہ "شاعر" بابت ماہ نومبر ۱۹۴۰ء میں احسنؔ کی شاعری کے بارے میں فرماتے ہیں

"مرحوم ایک کہنہ مشق شاعر اور دیدہ ور ادیب تھے، ان کے کلام میں جہاں فصیح الملک حضرت داغؔ دہلوی مرحوم کی یاد کی پرکاری تھی، وہاں تخیل میں بلندی اور فکر میں ہمہ گیری بھی تھی، اس میں شک نہیں، کہ وہ تغزلِ قدیم کی حدود سے دانستہ کبھی باہر نہ نکلے، مگر ان کے کلام میں دورِ جدید کے تمام ذہنی انقلابات بھی موجود تھے، علم و فن کے اعتبار سے ان کے کلام پر حرف گیری کا موقع آج

تک کسی کو نہ مل سکا اس لئے کہ وہ عروض و قافیہ ہو یا علم کلام سے کما حقہ واقف تھے، ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا، اور بساط علم وسیع تر"

احسن کی زبان صاف اور دھلی ہوئی ٹکسالی زبان ہے، آپ کے اشعار تصنع سے پاک ہوتے ہیں، محاورہ، روزہ، عروض و قوافی کی قیود اور صرف و نحو کی پابندیوں کا پورا پورا خیال رکھتے ہیں، تاہم آپ کے کلام میں خشکی اور بے کیفی کہیں نہیں ملتی ۔۔

حضرت احسن کی استادی مسلم ہے، آپ فن شعر کے بھی استاد تھے اور مسلم یونیورسٹی میں لکچرار کی حیثیت سے بھی استاد تھے، غرض یہ کہ آپ کی ذات بابرکات سے ہزاروں طالبان فن اور تشنگان زبان و ادب اردو فیضیاب ہوئے

نمونہ کلام یہ ہے :۔

یہ بات ہے دیکھو مری وحشت کے اثر میں
تم چین سے اب بیٹھ نہیں سکتے ہو گھر میں

مجھ خانہ برانداز کا پوچھو نہ ٹھکانا !
گھر ہے مرا جنگل میں تو جنگل مرے گھر میں

تھمتا ہی نہیں آنسوؤں کا جوش کسی دم
کیا بند سمندر ہے مرے دیدۂ تر میں

پھرتا ہوں زمانے میں تصور کے سہارے
کرتا ہوں سفر میں یونہی بیٹھا ہوا گھر میں

ہو سکتی تھی کیا اور کوئی شکل تباہی
دریا میں جو مدہے مری کشتی ہے بھنور میں

کیوں میری دعا وصل کی مقبول نہ ہوتی
تندی کوئی گئی ہی نہ تھی کچھ پائے اثر میں

کیا جانئے کیا بعد فنا حال ہو احسن
گھلتی ہے مری جان اسی خوف و خطر میں

دل ہے واقف ترے ہر اک راز سے
کام چلتا ہے اسی دمساز سے

مجھ کو اک پردہ نشین سے عشق ہے — آہ بھی کرتا نہیں آواز سے
حشر کا ہم کو ذرا کھٹکا نہیں — مٹ چکے تیرے خرام ناز سے
پھر یہ ہونا عشق میں کوئی تباہ — دیکھتا انجام گر آغاز سے
گیت گاتے ہیں تمہارے عشق کے — سوز سے مطلب نہ ہم کو ساز سے
پیاس ہیں ساقی کہاں کی ناپ تول — ڈال بھی دے جام ہیں انداز سے

آج احسنؔ بلبل ہندوستاں
کم نہیں ہیں بلبل شیراز سے

یہ دونوں غزلیں ۱۹۰۲ء کی تصنیف ہیں

اور کیا محبت میں حال زار ہستی ہے — سو بال گردن ہے جان بار ہستی ہے
آسماں اسے پہلے آپ اس کو ٹھکرائیں — پائمال صد آفت خاکسار ہستی ہے
دل جو ہرے تو مردہ جان جو ہرے افسردہ — کس کو ان حوادث پر اعتبار ہستی ہے
زندہ رکھ کے عاشق کو چاہتا ہے کہ دیا — جان کا جو دشمن ہے وہ دستار ہستی ہے
سینکڑوں تمنائیں دم بدم کھٹکتی ہیں — دل نہیں ہے پہلو میں خار زار ہستی ہے
کچھ سکون حاصل ہو زندگی میں ناممکن — ہر نفس سے وابستہ انتشار ہستی ہے
غنچہ مسکراتے ہی پھول بن کے مرجھایا — یہ فضائے گلشن ہے یہ بہار ہستی ہے
سب نمائش وقتی ہے حقیقت تری — جس قدر زمانے میں کاروبار ہستی ہے

کوئی کیا منے احسنؔ جبکہ دہر فانی میں
سرخوشِ مسرت بھی سوگوار ہستی ہے

یہ غزل رسالہ ہمایوں بابت جنوری ۱۹۵۲ء سے نقل کی گئی ہے۔ اس بھ

رسالہ میں یہ نوٹ بھی درج ہے، کہ یہ غزل مرحوم کی آخری غزل ہے، جو اگست سنہ ۱۹۳۹ء میں کہی گئی تھی،

آغا شاعر قزلباش دہلوی

محلہ گندہ نالہ واقع دہلی میں اقامت گزین ہیں[1] داغ کے رنگ کو چمکانے والے شاعر اور شاعر گر استاد ہیں، کلام میں شوخی کی انتہا نہیں، لیکن اس کے ساتھ ہی کہیں کہیں عامیانہ پن بھی پایا جاتا ہے، محاوروں کے نظم کرنے کا بہت شوق ہے اور یہی شوق بعض اوقات عامیانہ محاوروں کے استعمال پر بھی مجبور کر دیتا ہے

کلام شائع ہو چکا ہے، نمونہ یہ ہے:۔

پی پلا کر اسے رحمت کی قسم دیتے ہیں — کیسے بندے ہیں یہ اللہ کو دم دیتے ہیں

انکے جھگڑوں میں نہ آجائیگا بندہ تیرا — مفت کا آپ کو اغیار بھرم دیتے ہیں

داغ دیتے ہو جو دل پر تو ذرا ٹھنڈک سے — مہر کے واسطے کاغذ کو بھی نم دیتے ہیں

جب میرے دانتوں سے لعل شکریں چھوٹے ہوئے
لفظ جو دشنام کے نکلے وہ سب ٹوٹے ہوئے

بزم دشمن سے اب آئے ہو مزے لوٹے ہوئے
ہوش میں آکے کہیں جڑتے ہیں دل ٹوٹے ہوئے

وائے ناکامی کہ گلشن میں خزاں آنے لگی!
دو ہی دن گذرے تھے ہم کو قید سے چھوٹے ہوئے

---

[1] عرصہ ہوا انتقال ہو چکا ہے، تاریخ وفات ۱۱ مارچ سنہ ۱۹۴۰ء ہے،

نوح ناروی محمد نوح نام، نوح تخلص، موضع نارہ ضلع الہ آباد کے رئیس اور حضرت داغ دہلوی کے جانشین ہیں۔ الہ آباد او راطراف میں ایک بڑی جماعت شعراء کی آپ کے دامن فیض میں پرورش پا رہی ہے، چنانچہ منشی سکھدیو پرشاد صاحب بسمل الہ آبادی آپ کی استادی کو تسلیم کرتے ہیں

حضرت نوح کے کلام میں فصاحت، صفائی اور سلاست تو وہی ہے، جو حضرت داغ کے کلام میں ہے لیکن شوخی اور تیکھاپن نہیں، غزلیات میں فلسفیانہ اور صوفیانہ پیچیدگیاں تو ہیں لیکن خیالات میں کچھ عمق ضرور ہے بعض اوقات الفاظ اور جملوں کو دہرا کر شعر میں لطف پیدا کر دیتے ہیں مجموعہ کلام چھپ چکا ہے

نمونہ کلام یہ ہے۔

شوق کہتا ہے کہ برق حسن جاناں دیکھیے ۔۔۔ دیکھنا مشکل ہو لیکن تا بامکاں دیکھیے

عالم جوش جنوں کٹنے دونوں منظر ایک ہیں ۔۔۔ ہاتھ میں دامن کہ دامن میں گریباں دیکھیے

ہو اگر ذوق نظر تو کیا ہے جلووں کی کمی ۔۔۔ لاکھ پردوں میں ہے شمع عریاں دیکھیے

دل الجھ کر رہ گیا کھل کر یہ میں کہتا نہیں ۔۔۔ احتیاطاً آپ اپنی زلف پیچاں دیکھیے

ہر برس معمول اپنا یہ جنوں میں ہو گیا ۔۔۔ اس طرف آئے بہار اس سمت نے ندان دیکھیے

مری شامت جو آئی بڑھ کے قدموں پر جبیں رکھ دی

جہاں سے تیغ قاتل نے اٹھائی تھی وہیں رکھ دی

امیر مینائی مفتی منشی امیر احمد نام، امیر تخلص، خلف مولوی کرم محمد نصیر الدین حیدر کے عہد حکومت میں ۱۸۲۸ء میں بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے، آپ کا نسبی سلسلہ بہت ہی قریب حضرت مخدوم شاہ مینا صاحب قدس اللہ

مرقدہ سے ملتا ہے جن کا مزار مقدس لکھنؤ میں زیارت گاہ خاص و عام ہے، یہی وجہ ہے، کہ امیر کے نام نامی کے ساتھ مینائی لکھا جاتا ہے، آپ کو صرف خاندانی فضیلت ہی حاصل نہ تھی، بلکہ اپنی ذات سے خود بھی صاحب زہد و تقویٰ صوفی مشرب، خدا پرست، درویش صفت، منکسر المزاج آدمی تھے خاندان چشتیہ صابریہ کے سجادہ نشین حضرت امیر شاہ صاحب سے بیعت رکھتے تھے، اور بعد میں خرقہ خلافت سے بھی سرفراز ہوگئے تھے،

آپ کی تعلیم دار العلوم فرنگی محل لکھنؤ میں ہوئی، فہم سلیم و ذہانت فطری کی امداد سے عربی و فارسی میں کامل دستگاہ حاصل تھی، اس کے علاوہ طب جفر، نجوم وغیرہ میں بھی معلومات بہم پہنچائی تھی -

جس عہد میں امیر نے ہوش سنبھالا، وہ عہد شاعری کا نہایت سرگرم تھا، چنانچہ آپ کی طبیعت بھی شعر و سخن کی طرف مائل ہوئی، سید مظفر علی خاں اسیر سے شرف تلمذ حاصل کیا، استاد کے فیض، ناسخ کی بلند پروازی اور آتش کی آتش بیانی نے ان کی نوخیز طبیعت میں عاشقانہ رنگ پیدا کیا، صبا، وزیر، رند، خلیل کی نغمہ سرائیوں اور انیس و دبیر کی معرکہ آرائیوں نے آپ کی سخندانی کی شہرت روز افزوں ترقی کرتی گئی، حتی کہ واجد علی شاہ اختر کے دربار میں باریابی ہوئی، اور حسب الحکم دو کتابیں "ارشاد السلطان" اور "ہدایت السلطان" تصنیف کر کے خلعت فاخرہ اور انعام و اکرام حاصل کیا،

الحاق اودھ کے بعد نواب یوسف علی خاں والی رامپور نے آپ کو طلب فرمایا، اور عدالت دیوانی میں معزز آسامی پر مامور کیا، اس وقت سے

آپ کی مستقل سکونت بجائے لکھنؤ کے رامپور میں منتقل ہو گئی۔

یوسف علی خاں کے بعد نواب کلب علی خاں نے شعر و سخن کی جو قدردانی فرمائی، اس کا تذکرہ کیا جا چکا ہے، رامپور میں شعرائے باکمال کا جمگھٹا تھا، اور تغزل کا گلشن لہلہا رہا تھا، امیر اس فضا میں چالیس بیالیس سال تک اپنی شاعری کا ڈنکا بجاتے رہے، مرزا خاں داغ مدت سے حیدرآباد میں فارغ البالی سے بسر اوقات کر رہے تھے، چنانچہ انہوں نے اپنے قدردان، اور دوست حضرت امیر مینائی کو بھی وہیں طلب کیا، امیر کو بھی شوق تھا چنانچہ گئے لیکن وہاں پہنچتے ہی علالت نے آگھیرا، ایک ماہ اور نو روز بیمار رہ کر راہی ملک بقا ہوئے، سال وفات ۱۹۰۰ء ہے، حضرت جلال لکھنوی نے تاریخ وفات کہی

کہا امیر کہا سرزمین ملک دکن — کہاں قیام تھا مدفن کہاں ہوا نصیب
جلال لکھ دو یہ تاریخ انکی رحلت کی — امیر ہو گئے صد حیف ایک مرد غریب

حضرت امیر کے ایک ممتاز شاگرد منشی شاہ محمد ممتاز علی آہ مرحوم نے امیر کی سوانح حیات "امیر مینائی" کے نام سے ۱۹۳۸ء میں شائع کئے، اس کتاب سے اقتباس ذیل ہدیہ ناظرین کیا جاتا ہے، جس سے حضرت امیر کے علم و فضل اور سیرت پر روشنی پڑتی ہے،

حضرت عربی میں فاضل اجل فارسی میں ماہر کامل، اردو کے اہل زبان، علم دین کے محقق اور علوم حکمت و نجوم و عروض وغیرہ پر پوری طرح قادر تھے، اخلاق حسنہ کا مجسمہ تھے، اور شعر فہمی اور سخن سنجی کے متعلق تو اتنا کہہ دینا غالباً کافی ہے کہ آپ خاتم الشعراء تھے، مذہباً حنفی تھے، مگر مقلد جامد نہیں، بلکہ محقق، خاندان چشتیہ

صابریہ میں میاں امیر شاہ صاحب رامپوری قدس سرہ سے بیعت تھی، ریاضات
کئے، اور خلافت پائی تھی"

"واجد علی شاہ طاب ثراہ کا عہد عیش و عشرت پایا۔۔۔۔ ہمیشہ مشغلہ
شعر و سخن رہا، مگر اس سے پرہیزگاری! دامن مطلقاً کبھی ہاتھ سے نہ چھوٹا، تمام عمر
نماز روزے کا التزام رہا، اور صرف فرض ہی نہیں، بلکہ تہجد، اشراق اور چاشت کی
نمازیں اور ایام بیض، ذی الحجہ اور عاشورہ وغیرہ کے روزے بھی نہ چھوٹے، وہ ظاہر
میں امیر شاعر کامل فن تھے مگر دل سے فقیر اور چھپے ہوئے درویش، صاحب
باطن، البتہ آخر میں تصوف کا رنگ نمایاں ہو چلا تھا، فقر کی خوشبو کچھ پھیل چلی تھی"

امیر نے متعدد تصانیف یادگار چھوڑیں، ان میں سے دو کتابوں کا نام درج
ہو چکا ہے، باقی مشہور تصانیف یہ ہیں۔ دو مثنویاں "نور تجلی" اور "ابر کرم" اور
چار مسدس "صبح ازل" "شام ابد" "لیلۃ القدر" "ذکر شاہ انبیا" ایک واسوخت
دو دیوان "مراۃ الغیب" اور "صنم خانہ عشق" ان کے علاوہ امیر نے ایک لغت بھی
لکھنی شروع کی تھی، اور اس کا نام "امیر اللغات" رکھا تھا، صرف دو جلدیں جن
میں صرف الف اور بے کی تقطیع شامل ہے لکھی جا سکی تھیں، کہ دست قضا و قدر
نے ان کے ہاتھ سے قلم چھین لیا، یہ دونوں جلدیں جس قابلیت، تحقیق و جستجو سے
لکھی گئی ہیں اور جس قدر مفید ہیں، اس سے پتہ چلتا ہے، کہ اگر یہ عظیم الشان کام
پایۂ تکمیل کو پہنچ جاتا، تو زبان اردو کی کیسی مہتم بالشان خدمت ہوتی"

امیر کی شاعرانہ عظمت کا سکہ لوگوں کے دلوں میں بیٹھا ہوا ہے، ان کا
ابتدائی کلام لکھنؤ اسکول کی شاعری کا اچھا نمونہ ہے، وہی خشک اور پھیکی

تشبیہات، وہی بے کیف استعارات وہی ظاہری حسن کی تعریف و توصیف وہی تصنع اور وہی آورد، غرض ان کا پہلا دیوان "مرآۃ الغیب" اسی قسم کی شاعری سے پر ہے لیکن اتنا ضرور ہے کہ کہیں کہیں نزاکت اور رنگینی سے کلام میں دلکشی پیدا ہو جاتی ہے، اس دور کے کلام کا نمونہ یہ ہے:۔

ہوا جو پیوند میں زمیں کا تو دل ہوا شاد مجھ حزیں کا
بس اب ارادہ نہیں کہیں کا کہ مٹنے والا ہوں میں یہیں کا

کیا تھا کیوں ادعائے باطل ہوا تھا اس تل سے کیوں مقابل
سزا ملی ہو گیا سیہ دل جو مشک نافہ غزال چیں کا

غم محبت ہے جس کا مطلب کدورت اس دل کی ہو عیاں کب
کرے ہے جب بات غم لبالب پتا کہاں درد تہ نشیں کا

بڑھے سلیماں کے جتنے رتبے تمہاری الفت کے تھے کرشمے
بہ نقش حب دل میں جم کے بیٹھے بلند ہو نام اس نگیں کا

کہاں کا نالہ کہاں کا شیون تلے ہے قاتل کے وقت مردن
قلم ہوئی ہے بدن سے گردن زباں پہ نعرہ ہے آفریں کا

قریب ہے یار روز محشر چھپے گا کشتوں کا خوں کیونکر
جو چپ رہے گی زبان خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

لکھا جو وصف ایک گلبدن کا تو رنگ پیدا ہوا چمن کا
جو صفحہ ہے برگ یاسمن کا تو خامہ ہے شاخ یاسمیں کا

خدا سے جب تک نہ ہو شناسا حریم دل کا ہے شوق بیجا

مکاں کا تب پتا ملے گا کہ کچھ پتا یاد ہو مکیں کا!

ملا ہے جن کو دل مصفّا برے کو بھی دیکھتے ہیں اچھا
پڑے گا عکس آئینہ میں سیدھا ہزار الٹا ہو خط نگیں کا

کس آستانے پہ جا پڑا ہوں کہاں الٰہی میں جبہ سا ہوں
کہ سر نہ اٹھے ہزار چاہوں یہ ربط ہے سجدہ و جبیں کا

کہاں کا کعبہ ہے دیر کیسا بتاؤ کوچے کا اس کے رستہ
میں پوچھتا ہوں پتا کہیں کا نشان دیتے ہو تم کہیں کا

سفر مبارک ہو آخرت کا بخیر انجام ہو خدایا
جو گھر سے نکلے سرا جارہ تو سامنا ہو کسی حسیں کا

عجب ہے آئینہ کا مقدر کہ عکس افگن ہے چشم دلبر
قدم نکالا نہ گھر سے باہر شکار کھیلا غزال چیں کا

حسین جو میٹھی زباں سے مانگیں تو جان شیریں بھی نذر دیں
ہنسی خوشی سے جو زہر بھی دیں مزا ملے مجھ کو انگبیں کا

امیر دیکھا جو اس کا نقشہ تو نقش یوسف کا دل سے اترا
کہ نقش ثانی کے آگے ہوتا فروغ کیا نقش اولیں کا

کبھی تو بھولے سے رکھ دے قدم مرے سر پر — پڑا ہوں صورت نقش قدم ترے در پر
جو ذبح بھی ہو تو احساں نہ رکھ ستمگر پر — یہ ذکر خیر رہے گا زبان خنجر پر
وہ مست جب کبھی گذرا ہے میکدے کی طرف — بہک کے دست سبو جا پڑا ہے ساغر پر
دل شکستہ نے اس بت کے دل کو نرم کیا — کھلا ہے ٹوٹ کے شیشے نے زور پتھر پر

بہ رنگِ سایہ رہا پائمال ساری عمر
میں جس کے پاؤں پڑا پاؤں رکھ دیا سر پر

ہوئے بوسۂ لب ہی تو مرگ کے بعد
حباب بن کے رہوں گا میں آبِ کوثر پر

ازل سے طبع ملاحت پسند رکھتا ہوں
چھڑک لیا تھا نمک میں نے شیرِ مادر پر

پھڑک رہا ہے مرا مرغِ روح اے قاتل
کہ جوہروں نے بچھایا ہے جال خنجر پر

نگہ کو دیتے ہیں گردش جو آئینے میں ترک
چھری کو کرتے ہیں وہ پردہ تیز پتھر پر

جو آبرو کا ہے خواہاں تو خاکساری کر
یہ قول گردِ یتیمی ہے روئے گوہر پر

صفِ مژہ کو بھی ہے ناک چشمِ ساقی کی
گرے ہیں سینکڑوں میخوار ایک ساغر پر

چلا ہے نامہ مرا لے کے نامہ بر یا رب
ترے حبیب کا سایہ میسر ہے کبوتر پر

سوال سے ہے یہ نفرت کہ ہاتھ اٹھاؤں امیر
پڑھوں جو فاتحہ میں تربتِ تونگر پر

نہ ہوگا بند جب تک نقدِ جاں باقی ہے قالب میں
سخی کے گھر کا دروازہ ہے چاک اپنے گریباں کا

جگر کو دوں کہ دل کو دوں جتا اے ناوکِ قاتل
کہ دو پیاسوں میں ہے یہ ایک قطرہ آبِ پیکاں کا

وہ زخمی ہیں تڑپ کیسی پھڑکنا گر کہے قاتل
دہانِ زخم سے ہم چوم لیتے منہ نمکداں کا

کہیں ضبطِ فغاں سے عشق کے آثار چھپتے ہیں!
لبِ خاموش سے پیدا ہے صدمہ دردِ پنہاں کا

مگر اٹھی ہوئی پریاں پھنسانے کا ارادہ ہے

ہوا پر جال پھیلایا ہے کیوں زلف پریشاں کا

لیکن اسی دور کے کلام میں کہیں کہیں ایسے اشعار بھی ملتے ہیں:-

انساں کی مرگ و زیست نہیں ہے کسی کے ہاتھ
آئے تو کیا جو آپ نہ آئے تو کیا ہوا

کہا جو میں نے کہ میں خاک راہ ہوں تیرا — تو بولے ہے ابھی پندار خود نمائی کا
بات لے کھلی میری قاتل نے گنہگار ہوں میں — اس گنہ پر مجھے مارا کہ گنہگار نہ تھا
پہلے تم اپنی چتون اپنی نظر کو دیکھو — پھر جس نے دل دیا ہے اسکے جگر کو دیکھو

ان ہی سے ناز کرتی ہے جو تجھ پر جان دیتے ہیں
اجل تجھ کو بھی کتنا ناز معشوقانہ آتا ہے

دوران قیام رامپور میں حضرت امیر مرزا داغ دہلوی کے رنگ میں کہنے لگے تھے، دوسرا دیوان "صنم خانۂ عشق" اسی دور کی یادگار ہے۔ اس دیوان کا خاص رنگ فصاحت اور ترنم ہے، شوخی بھی ایک حد تک پائی جاتی ہے، اور تیور بھی شوخی کہیں کہیں متانت سے دور بھی جا پڑتی ہے، تصوف کی ہلکی سی چاشنی بھی موجود ہے، لیکن غالب رنگ ان کے کلام کا حسن و عشق ہی ہے، خیالات میں کسی قدر عمق، جذبات میں شدت، اور احساسات میں رنگینی پائی جاتی ہے،

امیر کی زبان عام طور پر صاف اور سلیس اور بول چال اور محاورات کے لحاظ سے لکھنؤ کی ٹکسالی زبان کا اعلیٰ نمونہ ہے،

امیر کو دیگر اصناف سخن خصوصاً قصیدہ پر بھی قدرت کامل حاصل تھی نعتیہ غزلیات و قصائد بھی خوب لکھتے تھے۔ آپ کے بعض خطوط بھی شائع

ہوتے ہیں جن میں لطف زبان کے ساتھ ساتھ طرز بیان نہایت دلکش اور بیساختہ ہے، قیام رامپور کے دور شاعری کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

مرے بس میں یا تو یا رب وہ ستم شعار ہوتا
یہ نہ تھا تو کاش دل پر مجھے اختیار ہوتا

پس مرگ کاش یوں ہی مجھے وصل یار ہوتا
وہ سر مزار ہوتا میں تہ مزار ہوتا

ترا میکدہ سلامت ترے خم کی خیر ساقی
مرا نشہ کیوں اترتا مجھے کیوں خمار ہوتا

مرے اتقا کا باعث تو ہے میری ناتوانی
جو میں توبہ توڑ سکتا تو شراب خوار ہوتا

میں ہوں نامراد ایسا کہ بلک کے یاس روتی
کہیں پا کے آسرا کچھ جو امیدوار ہوتا

نہیں پوچھتا ہے مجھکو کوئی پھول اس چمن میں
دل داغدار ہوتا، تو گلے کا ہار ہوتا

وہ مزا دیا تڑپ نے کہ یہ آرزو ہے یا رب
مرے دونوں پہلوؤں میں دل بیقرار ہوتا

دم نزع بھی جو وہ بت مجھے آ کے منہ دکھاتا
تو خدا کے منہ سے اتنا نہ میں شرمسار ہوتا

نہ ملک سوال کرتے نہ لحد فشار دیتی
سر راہ کوئے قاتل جو مرا مزار ہوتا

جو نگاہ کی تھی ظالم تو پھر آنکھ کیوں چرائی
وہی تیر کیوں نہ مارا جو جگر کے پار ہوتا

میں زباں سے تم کو سچا کہو لاکھ بار کہہ دوں
اسے کیا کروں کہ دل کو نہیں اعتبار ہوتا

میری خاک بھی لحد میں نہ رہی امیر باقی
انہیں مرنے کا ہی ابتک نہیں اعتبار ہوتا

کہا جو میں نے کہ یوسف کو یہ حجاب نہ تھا
تو ہنس کے بولے وہ منہ قابل نقاب نہ تھا

وہ کون تھا جو خرابات میں خراب نہ تھا
ہم آج پیر ہوئے کیا کبھی شباب نہ تھا

شب فراق میں کیوں یا رب انقلاب نہ تھا
یہ آسمان نہ تھا یا یہ آفتاب نہ تھا

لحاظ ہم سے قاتل کا ہو سکا دم قتل،
سنبھل سنبھل کے تڑپنے میں اضطراب نہ تھا

اسے جو شوق سزا ہے مجھے ضرور ہے جرم
کہ کوئی یہ نہ کہے قابل عذاب نہ تھا

دماغ بحث تھا کس کو وگرنہ اے ناصح
دہن نہ تھا کہ دہن میں مرے جواب نہ تھا

وہ کہتے ہیں شب وعدہ میں کس کے پاس آتا
تجھے تو ہوش ہی اے خانماں خراب نہ تھا

غضب کیا کہ اسے تونے محتسب توڑا
ارے یہ دل تھا مرا شیشۂ شراب نہ تھا

ہم جھجکنے پہ اب کے تیرے شرم آتی ہے
حلال کرنے کو بیٹھے تھے جب حجاب نہ تھا

ہزار بار گلا رکھ دیا تہ شمشیر
میں کیا کروں تری قسمت ہی میں ثواب نہ تھا

کلیم شکر کرو حشر تک نہ ہوش آتا
ہوئی یہ خیر کہ وہ شوخ بے نقاب نہ تھا

شکایت ان سے کوئی گالیوں کی کیا کرتا
کسی کا نام کسی کی طرف خطاب نہ تھا

ثبات بحر جہاں میں نہیں کسی کو امیر
ادھر نمود ہوا اور ادھر حباب نہ تھا

وہ اور وعدہ وصل کا، قاصد نہیں نہیں
سچ سچ بتا یہ لفظ انہی کی زباں کے ہیں

ہاتھ رکھ کر میرے سینے پہ جگر تھام لیا
تم نے تو اس وقت گرتا ہوا گھر تھام لیا

ایک دل ہمدم مرے پہلو سے کیا جاتا رہا
سب تڑپنے تلملانے کا مزا جاتا رہا

کھو گیا دل کھو گیا رہتا تو کیا ہوتا امیر
جانے دو اک بے وفا جاتا رہا جاتا رہا

شاگردان امیر مینائی لکھنوی

ریاض خیر آبادی منشی سید ریاض احمد نام، ریاض تخلص، خلف منشی طفیل احمد خیر آباد کے رہنے والے تھے، ابتدائی تعلیم خیر آباد کے مدرسہ عربیہ میں ہوئی، مگر ابھی فارغ التحصیل نہیں ہوئے تھے، کہ شاعری کا

چسکا پڑ گیا، پہلے اسیرؔ سے تلمذ اختیار کیا تھا، بعد میں امیرؔ سے اصلاح لی خیرآباد سے اردو شعر و سخن کا ایک رسالہ گل کدہ ریاض نامی جاری کیا، کچھ مدت بعد "ریاض الاخبار" نکالا لیکن لکھنؤ کی فضا پسند تھی چنانچہ ریاض الاخبار کے دفتر کو وہیں اٹھا لائے، یہ اخبار پندرہ سولہ برس تک نہایت کامیابی کے ساتھ چلتا رہا، اس کے بعد آپ نے سرکاری ملازمت اختیار کر لی، سپرنٹنڈنٹ پولیس گورکھپور کے سررشتہ دار ہو گئے۔

ان ہی ایام میں نواب کلب علی خاں مرحوم نے ان کی تیزی طبع، اور خوش فکری کی شہرت سن کر رامپور طلب کیا، مگر آپ وہاں کچھ زیادہ قیام نہیں کر سکے، اخبار کے ساتھ ساتھ ایک چھوٹا سا ضمیمہ فتنہ و عطر فتنہ" کے نام سے ان ہی ایام میں نکالنے لگے، اس میں چلبلے مضامین اور منتخب اشعار درج ہوتے تھے، گورکھپور میں پندرہ برس فارغ البالی سے گذارنے کے بعد آپ پھر لکھنؤ چلے آئے، راجہ محمود آباد ان کی بہت قدردانی کرتے تھے،

ریاضؔ نے ۱۹۳۵ء میں اس دنیائے فانی سے عالم جاودانی کی طرف کوچ فرمایا،

ریاضؔ کی زباندانی مسلم ہے، اغلاط سے کلام پاک ہوتا ہے، اور وہ ایک طرز خاص کے موجد سمجھے جاتے ہیں، قبول عام کا یہ عالم ہے کہ ان کے جیتے جی انکے اشعار ضرب الامثال کے طور پر لوگوں کی زبانوں پر چڑھے ہوئے تھے،

مزاج میں لاابالی پن اور وارفتگی جو رندانہ مزاجی کا لازمہ ہے زیادہ تھی، اور یہی وجہ ہے، کہ کلام میں شوخی اور چلبلا پن حد سے زیادہ ہے، مگر لطف یہ کہیں

ابتذال اور عامیانہ پن نہیں پایا جاتا۔ زبان میں صفائی اور فصاحت بدرجہ کمال موجود ہے سچے عشق کی تصویریں ان کے کلام میں کم ہیں۔ معاملہ بندی، ہنسی اور ٹھٹول، چلی کٹی، واعظوں پھبتی، رندانہ بے تکلفی کے مضامین ان کے کلام میں بہت دلکش پیرایہ میں ملتے ہیں خمریات یعنی شراب و کباب کے مضامین جس کثرت سے ریاض کے ہاں ملتے ہیں اور کسی شاعر کے کلام میں نہیں ملتے۔ اس کے ساتھ ہی یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ تصوف اور اخلاق کے رنگ کی بھی کہیں کہیں جھلک نظر آتی ہے۔ نازک خیالی کی بھی کمی نہیں اگرچہ تخیل کا میلان قدرتی طور پر رندانہ حسن پرستی معاملہ اور مذاق کا پہلو لئے ہوئے ہے مگر اور شعبوں میں بھی طبیعت بند نہیں۔ اب کلام سے لطف اٹھایئے:۔

پڑی اُلٹے میں زلف عنبریں معلوم ہوتی ہے
یہ کالی شکل بھی کتنی حسین معلوم ہوتی ہے

چلی بھی تیغ تو کس نازسے رک رک کے تھم تھم کر
یہ کچھلن سے نئے یا دنازنین معلوم ہوتی ہے

ارے ساقی ذرا میری شراب تلخ تو لانا
مے کوثر تو بالکل انگبیں معلوم ہوتی ہے

مے چرانے میں ہمیں ہے ید طولیٰ کیسا
ہم اڑا لائے سبو آج اچھوتا کیسا

جائیے جائیے ہم شرمیں سننے کے نہیں
آئیے آئیے اب وعدہ فردا کیسا

قرض لایا ہے کوئی بھیس بدل کر شاید
مے فروش نکلے ہے واعظ سے تقاضا کیسا

جب یہ مل جائیں کلیجے سے لگا لے انکو
واں حسینوں سے کسی بات کا شکوا کیسا

کوئی منہ چوم لے گا اس نہیں پر
شکن رہ جائیگی یوں ہی جبیں پر

پاک صاف ایسی ہے جس نے پی فرشتہ بن گیا
ناصحو یہ حور کے دامن میں ہے چھانی ہوئی

حضرت جلیل مانکپوری حافظ جلیل حسن نام جلیل تخلص خلف مولوی حافظ عبدالکریم، مانکپور کے رہنے والے، اور امیر مینائی مرحوم کے شاگرد رشید اور جانشین ہیں بیس سال کی عمر میں حضرت امیر مرحوم کے شاگرد ہوئے، اور عرصہ دراز تک دفتر امیر اللغات کے سیکرٹری رہے امیر مینائی کے ہمراہ حیدرآباد دکن گئے، اور ان کے بعد وہیں قیام کیا، امیر مرحوم کی وفات کے بعد مرحوم کے بعض تلامذہ مثلاً حضرت ریاض، مضطر، وسیم وغیرہ نے آپ کو مرحوم کا جانشین قرار دیا، چنانچہ اب وہ اسی لقب سے مشہور ہیں، اکثر تلامذہ امیر مرحوم آپ سے مشورہ کیا کرتے تھے، فارسی کی استعداد فاضلانہ ہے اور عروض و قوافی میں خاص دخل رکھتے ہیں، سلطنت آصفیہ نے بجا طور پر آپ کی قدردانی کی ہے، اور آپ کو "فصاحت جنگ" کا خطاب دیا ہے ۔

جلیل مسلم الثبوت استاد ہیں، کلام کا پایہ بہت بلند ہے، سلاست بیان و صفائی زبان کے ساتھ ساتھ بلند پروازی اور نازک خیالی دو متضاد صفتیں آپ کے کلام میں جمع ہوئی ہیں، اگرچہ اکثر اشعار رعایت لفظی اور محاورہ بندی سے باہر نہیں ہوتے، تاہم بندش کی چستی اور بیان کی سلاست اس رنگ کو دلچسپ بنا دیتی ہے، اخلاقی اور صوفیانہ مضامین بھی ان کے کلام میں ملتے ہیں، لیکن یہ ان کا خاص رنگ نہیں، خاص رنگ حسن و عشق کا اظہار اور جذبات نگاری ہے لیکن اس رنگ میں بلاغت، متانت، خوش مذاقی اور بلند خیالی کو نہیں چھوڑتے، زبان کی سلاست اور روزمرہ کی صفائی کا یہ عالم ہے، کہ ہر خاص و عام آپ کے کلام سے لطف اندوز ہوتا ہے، نمونہ کلام ملاحظہ ہو ۔

جب ترے عشق کا پھندہ مری گردن میں رہا — پھر پڑا ہے قفس میں کہ نشیمن میں رہا
لوگ آرام کی خاطر رہے دنیا میں خراب — اور آرام چھپا گوشۂ مدفن میں رہا
چاک دامانِ یوسف تو کوئی بات نہ تھی — ہائے وہ چاک زلیخا کے جو دامن میں رہا

رات دل سے مرے اس درد کے نالے نکلے — گھر سے [illegible] تھامے کلیجے کو سنبھالے نکلے
پھر بڑھ چرخ دھواں دھار گھٹائیں آئیں! — پھر ہوا کھانے حسین گیسوؤں والے نکلے
نازو انداز نے تنہا انہیں چلنے نہ دیا — ساتھ سب گوشۂ دامن کو سنبھالے نکلے

جلال لکھنوی | حکیم سید ضامن نام، جلال تخلص، خلف حکیم اصغر علی، لکھنؤ کے رہنے والے، سادات عظام سے تھے، خاندان میں کئی پشت سے طبابت کا سلسلہ جاری تھا، جلال کے والد اپنے وقت کے مشہور طبیب تھے،

جلال ۱۸۳۲ء میں بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے، نواب آصف الدولہ کے مدرسہ میں تعلیم پائی لیکن کتب درسیہ کی تکمیل نہ ہونے پائی تھی کہ شعر و سخن کا شوق دامنگیر ہوا، ابتدا میں امیر علی خاں ہلال شاگرد رشک کو اپنا کلام دکھایا، کچھ عرصے کے بعد ہلال نے خود انہیں اپنے استاد رشک کا شاگرد کرا دیا، جب رشک سفر عراق کے لئے روانہ ہوئے تو جلال برق سے مشورہ کرنے لگے۔

جلال ہمیشہ فن فی الشعر رہے، اور قلیل مدت میں کامل شہرت حاصل کر لی جب ان کا شہرہ رامپور پہنچا، تو نواب یوسف علی خاں نے انہیں طلب کیا یہاں پہنچے، مگر نواب صاحب کی عمر نے وفا نہ کی، اور دو ماہ بعد ان کا انتقال ہو گیا۔

نواب کلب علی خاں کی قدردانی و سخن فہمی کے سایہ میں جلال فارغ البالی سے رامپور میں قیام پذیر رہے، امیر مینائی، داغ اور جلال میں اکثر صحبتیں گرم رہتی

تھیں، مشاعروں میں شریک ہوتے تھے اور ہم طرح غزلیں پڑھ کر اپنے اپنے رنگ کی داد لیتے تھے۔ ان تینوں اساتذہ میں کمال اتحاد اور یگانگت تھی، داغ کو رامپور چھوڑنے کے بعد ان کی جدائی کا کمال افسوس تھا، چنانچہ فرماتے ہیں۔

اے داغ ہے وطن سے بہت دور لکھنؤ ملتے امیر احمد و سید جلال سے

نواب کلب علی خاںؒ کے انتقال کے بعد ریاست مانگرول کاٹھیاواڑ کے قدردان رئیس کے اصرار پر جلال کئی برس وہاں بھی قیام پذیر رہے، آخر عمر میں لکھنؤ آ رہے تھے، اور وہیں بتاریخ ۲۰ر اکتوبر ۱۹۰۹ء آپ نے انتقال فرمایا۔

جلال نے چار دیوان یادگار چھوڑے (۱) شہید شوخ طبع (۲) کرشمہ جات سخن (۳) مضمون ہائے دلخوش (۴) نظم نگاریں۔ اس کے علاوہ کئی رسالے، لغت و عروض وغیرہ پر آپ نے تصنیف فرمائے تھے۔

جلال کے مسلم الثبوت استاد ہونے میں کسی کو کلام نہیں۔ علمی قابلیت کے علاوہ آپ کو فن سخن میں محققانہ اور مجتہدانہ رتبہ حاصل تھا، اور تمام اصناف سخن پر قدرت کامل رکھتے تھے، ناسخ مرحوم کے خاندان شاعری کے آخری یادگار لو لکھنؤ کی ٹکسالی زبان اور لکھنؤ اسکول کی شاعری کے آخری نمائندے تھے۔

جلال کا کلام گلہائے رنگا رنگ کا گلدستہ ہے، کہیں تشبیہ ہے کہیں خیال گوئی، کسی جگہ عاشقانہ رنگ ہے، کہیں محض معاملہ بندی، لیکن ہر جگہ زبان کی صحت اور قواعد کی پابندی کا اس حد تک خیال رکھا گیا ہے، کہ ان کا کلام عام طور پر پھیکا اور بے نمک ہو گیا ہے، اگرچہ لوازمات حسن کی تعریف و توصیف سے ان کا کلام اکثر پاک ہے تاہم علوئے خیال اور صداقت جذبات کی نمایاں کمی

محسوس ہوتی ہے۔ کلام کا بڑا حصہ پست اور عامیانہ ہے، شاعرانہ حیثیت سے جلالؔ کو امیرؔ مینائی اور داغؔ کے مقابلہ میں پیش نہیں کیا جا سکتا لیکن زبان و محاورات کے صحیح استعمال اور قواعد کی پابندی سے جو خدمات زبان کی آپ نے کی ہیں انکا تقاضا ہے، کہ آپ کو اس دور میں نمایاں جگہ دی جائے۔ بطور نمونہ چند غزلیات و متفرق اشعار ملاحظہ ہوں :-

زندگی بھر مزۂ ضبط فغاں یاد رہے — کوئی چٹکی بھی تو لے دل میں جو فریاد رہے

دل کو پوچھا تم دلدار بہت شاد رہے — رہنے والا مرے ویرانے کا آباد رہے

طوق گردن میں ہماری بھی ہو قمری کی طرح — اک گلا گھونٹنے والا دم فریاد رہے

آتی ہے بو کھنچے ہوئے حلق سے کشتوں کی صدا — آبروئے برسر تیغ خنجر جلاد رہے

رند اللہ نے دیوانہ بنایا بت نے — حسن کے بندے رہے بگڑے ہوئے ہم آزاد رہے

دل کھنچے آتے تھے کیا کھینچتا اس کی تصویر — سینوں پر ہاتھ دھرے مانی و بہزاد رہے

کعبہ ہو بتکدہ ہو عرش بریں ہو دل ہو — جو مکاں جلوہ گہ یار رہے آباد رہے

روح جنت میں تو دل ہم میں ہم مدفن میں — تیرے آوارہ پس مرگ بھی برباد رہے

تپش دل سے نہ ٹھہرے کبھی تربت میں پاؤں — شہر آہن کی عقیدہ سے جدا ہو رہے

ہر جگہ بھیس نیا عشق میں بدلا ہم نے — کہیں مجنوں کہیں وامق کہیں فرہاد رہے

ننگ ابھی خانہ خرابی تیری لائے گی جلالؔ!
دل سلامت ہے الفت کا گھر آباد رہے!

اپنے کوچے سے اٹھاتے ہیں کہ تم مجھ کو — آئے عیسیٰ بھی تو فرماتے ہوئے تم مجھ کو!

خضر اس راہ میں لے چلتے ہیں تم مجھ کو — گم کروں ہوش کو میں ہوش کرو تم مجھ کو

شوق کی بیخودیوں نے یہ کیا گم مجھ کو — ڈھونڈتا ہوں میں تمہیں ڈھونڈتے ہو تم مجھ کو

اکثر اس بات پہ آتا ہے تبسم مجھ کو — دہن ان کو نہ ملا تاب تکلم مجھ کو!

کیا ہنسی ہے دہن یار کا اب گم رہنا — کچھ نشاں دے کے گئے آثار تبسم مجھ کو

چھپتے ہیں صبح شب وصل کے آثار کہیں — پہلے دیتا ہے خبر تیرا تبسم مجھ کو

کون آیا تھا دم نزع کہ میں جی اٹھا — ہو گئی موت کی ہچکی کی صدا قم مجھ کو

اب میں جاتا ہوں کہاں داغ جگر کہتا ہے — دل نہیں ہوں کہ جو کر دو گے کہیں گم مجھ کو

یا رب آباد رہیں زیر فلک دہ پرست — لا کے میخانے میں گاڑا ہے تہ خم مجھ کو

سب کی آنکھوں کی میں پتلی ہوں وہ بت کہتا ہے — دیکھ سکتے نہیں اس وجہ سے مردم مجھ کو

بیخودی سی جو شب وصل ہے کچھ دو نو طرف — بدگمانی انہیں ہوتی ہے توہم مجھ کو

جوش گریہ میں الہی رہے بیتابی دل — ے نہ ڈوبے کہیں کشتی کا تلاطم مجھ کو

خواہش دل ہے کہ کھو آؤں کہیں جا کے جلال

عقل کہتی ہے وہاں پہلے کرو گم مجھ کو

خانہ ویراں دل آوارۂ و سودائی کا — کیا سمجھتے تھے کہ گھر ہے یہی رسوائی کا

کون ان سے کہے قصہ شب تنہائی کا — شمع خاموش کو یارا نہیں گویائی کا

داغ تقدیر کے لکھے کو مٹایا نہ مٹا — داغ ہم لے کے چلے اپنی جبیں سائی کا

آنکھ خورشید قیامت سے نہیں جھپکاتا — دیکھنا ڈھیٹ پنا اپنے تماشائی کا

ہوں وہ کاہیدہ جو دیتا ہے سہارا تنکا — جانتا ہوں میں عصا اس کو توانائی کا

آپ اپنے کو تو پہچان نہیں سکتا ہوں — کیا میں اقرار کروں تیری شناسائی کا

داغ پنہاں ہو مگر حسن دکھاتا ہے جھلک — سات پردوں سے عیاں نقص ہے بینائی کا

مار ڈالے گی ہو دو رنگی تری اے دو رنگ | ڈھنگ ہے یہ کسی معشوق کی رعنائی کا

بیڑیاں دیکھ کے ڈھارس مجھے دیتا ہے جنوں | دل نہ بھاری ہو کہ زیور ہے یہ سودائی کا

نخل طوبیٰ ہے ترے سرو قد سہی کی تصویر | باب فردوس ہے نقشہ تری انگڑائی کا

مر مٹے کیسے لب جاں بخش سے اس بت کے جلال

نام زندہ ہے مسیحا کی مسیحائی کا

آرزو ہے کہ بلا کر اسے دل میں رکھیئے | صاحب خانہ جو بن جائے مہمان ہو کر

نزع میں اس لئے کھولے ہوئے بال آئے ہیں وہ | روح عاشق کی جو نکلے تو پریشاں ہو کر

قتل عالم کو کیا پھر وہ نہ ٹھہرے قاتل | بھولے بن کر کہیں چھوٹے کہیں ناداں ہو کر

کلیجہ کوئی تھام کر رہ گیا ہے | ادھر جانے والے ادھر دیکھ لینا

فلک ترتے ہوں گے حبابوں کی صورت | دکھائے گی جو چشم تر دیکھ لینا

تماشا میری بے قراری کا آکر | شب وعدہ تم رات بھر دیکھ لینا

آرزو لکھنوی سید انور حسین نام، آرزو تخلص، خلف میر ذاکر حسین ۱۲۸۹ھ (۱۸۷۲ء) میں بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے، پانچ سال کی عمر سے سلسلہ تعلیم شروع ہوا عربی و فارسی مشہور علماء سے پڑھی، بارہ برس کی عمر سے شعر و سخن کا شوق ہوا، حکیم ضامن علی جلال لکھنوی سے علم عروض حاصل کیا، اور ان ہی سے اصلاح سخن لینے لگے پہلے امید تخلص اختیار کیا تھا، بعد میں آرزو ہو گئے استاد کی توجہ، ذاتی قابلیت اور کثرت مشق سے تھوڑے عرصہ میں استادی کا مرتبہ حاصل کر لیا، فی الحال آپ اپنے وطن لکھنؤ میں اقامت گزیں ہیں، مقامی اور بیرونجات مثلاً الہ آباد، کانپور وغیرہ مقامات کے مشاعروں

میں رونق افروز ہوتے ہیں۔

آرزو، جلال لکھنوی کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں، اور لکھنؤ اسکول کی اس شاعری کی یادگار ہیں جس پر رامپور کے زمانے میں دہلی اسکول کی شاعری کا اثر پڑ چکا تھا۔ آپ کو جملہ اصنافِ سخن پر قدرت کامل حاصل ہے۔ لیکن آپ کی شاعرانہ جد و جہد کا خاص میدان غزل ہے، زبان صاف و شیریں ہے، ہندی الفاظ اور فقرے نہایت لطف سے استعمال ہوئے ہیں، محاورات اور ضرب الامثال کو بھی التزاماً نظم کرتے ہیں، لیکن کمال یہ ہے کہ برجستگی قائم رہتی ہے، رعایت لفظی جو لکھنؤ اسکول کی امتیازی خصوصیت ہے، آپ کے کلام میں موجود ہے، کہیں کہیں تصنع اور آورد کا شائبہ بھی پایا جاتا ہے، غزلیات میں عام طور پر ایک درد انگیز یاس پائی جاتی ہے، جو غالباً میر کی تقلید کا اثر ہے، شوخی او ابندی اور نوک جھوک کا عنصر بھی موجود ہے لیکن متانت اور سنجیدگی کے قوانین کی خلاف ورزی کہیں نہیں پائی جاتی۔

آرزو صاحب نے حال ہی میں غزل کے لئے ایک خاص زبان ایجاد کی ہے اور اس کا نام خالص اردو رکھا ہے، اس میں عربی و فارسی الفاظ و تراکیب کا دخل نہیں تاہم فصاحت سے گرنے نہیں پاتی، ظاہر ہے، کہ اس خالص اردو کا میدان کسی قدر تنگ ہوگا، اگرچہ یہ زبان عام فہم ہے، ہندی دان حضرات بھی اس سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں، لیکن سوال یہ ہے، کہ یہ زبان کچھ مفید بھی ثابت ہو سکتی ہے اور سوائے غزل کے چند اشعار کے کچھ اور کام بھی اس

ملہ آرزو قیام پاکستان کے بعد ہجرت کر کے کراچی چلے آئے تھے جہاں ۱۶ اپریل ۱۹۵۱ء کو آپ نے رحلت فرمائی

سے لیا جا سکتا ہے، نمونہ کلام ملاحظہ ہو:۔

جا بیچ کر تاب نظر کو روئے جاناں دیکھیے ۔۔۔ دیکھ سکنے کو ستی تجلی تو ہاں ہاں دیکھیے

چوٹ دل پر کھا کے حالِ کاہشِ جاں دیکھیے ۔۔۔ دیکھیے پیدا نظر پھر درد و پنہاں دیکھیے

جان کی راحت سے بڑھ کر دو گرہ کپڑا نہیں ۔۔۔ دیکھیے اب مل کی الجھن یا گریباں دیکھیے

آپ مٹ جائیں ہم مگر دل سے ۔۔۔ داغِ الفت نہیں مٹانے کے

جیسے ہم صورت آشنا ہی نہیں ۔۔۔ صدقے اس منہ چھپا کے جانے کے

آج بے آپ ہو گئے ہم بھی ۔۔۔ آپ کو پا کے کھو گئے ہم بھی

دانے کم جے دکھوں کی سمرن میں ۔۔۔ ٹوٹے موتی پرو گئے ہم بھی

دیرسے تھے وہ جس کے پھیرے میں ۔۔۔ اسی جھرمٹ میں کھو گئے ہم بھی

رو ئیں بھی گر تو جگ ہنسائی ہے ۔۔۔ کرتے کیا چپ سے ہو لیے ہم بھی

نام جینے کا جاگتا رکھ کر! ۔۔۔ آج بے نیند سو گئے ہم بھی

جا کے ڈھونڈا کہاں کہاں انہیں ۔۔۔ رملے جب تو کھو گئے ہم بھی

ہائے رے آرزو کی بے آسی

آپ بے بس تھے رو گئے ہم بھی!

محبت میں چھپکی ہے یوں زندگانی ۔۔۔ کہ انگڑائیاں لے رہی ہے جوانی

امنگوں نے آنکھوں میں کیا جو دیا ہے ۔۔۔ کہ ہر شے نظر آ رہی ہے سہانی

پپیہے کی پیو پیو ہے ایسی کہ جیسے ۔۔۔ کسی کو سنا دیں اسی کی کہانی

رچی بسی ہنسنے ہی سے نکلتا ہے مطلب ۔۔۔ نہ کہتے ہی بنتی ہے بھول کی کہانی

پسینا بنیں گی یہی ٹھنڈی سانسیں ۔۔۔ ڈبو دے گی بہتی ہوا بن کے پانی

کلی پھول بننے میں اس طرح چٹکی — کہ جس طرح بچپن پہ ہنس دے جوانی
چھپے راز کیونکر کہ چپ رہنے پر بھی — نظر کہنے لگتی ہے دل کی کہانی
نگاہوں میں پھرنے لگے سب بلائے — بڑی مہربانی بڑی مہربانی
امنگ اور ابھری جہاں تم نے پایا — یہ ہے آرزو کون دیتی کہانی

خالص اردو

رس ان آنکھوں کا ہے کہنے کو ذرا سا پانی — سیکڑوں ڈوب گئے پھر بھی ہے اتنا پانی
چاہ میں ہم پاؤں کہاں آس کا میٹھا پانی — پیاس بھڑکی ہوئی بیٹھے ہیں نہیں ملتا پانی
کس نے بھیگے ہوئے بالوں سے یہ جھٹکا پانی — جھوم کر آئی گھٹا ٹوٹ کے برسا پانی
ہاتھ جل جائیگا چھالا نہ کلیجے کا چھوؤ — آگ مٹھی میں دبی ہے نہ سمجھنا پانی
رس ہی رس جسمیں ہے پھولوں سی فدا سی پتلیاں — مانگتا ہے کہیں ان آنکھوں کا مارا پانی

تسلیم منشی احمد حسین نام، عرف امیر اللہ، تسلیم تخلص خلف مولوی عبد الصمد فیض آباد کے رہنے والے تھے، مگر مدتوں لکھنؤ رہے اس وجہ سے لکھنوی مشہور ہیں، تسلیم سنہ ۱۸۲۰ء میں موضع منگلسی نواح فیض آباد میں پیدا ہوئے آپ کے والد مع اہل و عیال لکھنو آ رہے تھے اور وہیں نواب محمد علی شاہ کے فوجی دفتر میں ملازم ہو گئے تھے، والد کے انتقال کے بعد تسلیم ان کی جگہ ۳۰ روپیہ مشاہرہ پر ملازم ہوئے،

تسلیم کو عربی و فارسی میں کامل دستگاہ تھی، خوشنویسی میں بھی کمال حاصل تھا چنانچہ شاہی ملازمت کے بعد آپ نولکشور پریس میں بحیثیت کاتب ۲۰ روپیہ مشاعرہ پر ملازم ہوگئے تھے، شاعری میں آپ نسیم دہلوی کے شاگرد تھے اور ان

سے اس قدر عقیدت و ارادت تھی کہ ان کے رنگ شاعری اور اپنی شاگردی
کو فخر کی نگاہوں سے دیکھتے تھے، چنانچہ فرمایا ہے،

میں ہوں اے تسلیم شاگرد نسیم دہلوی ... مجھ کو طرز شاعران لکھنؤ سے کیا غرض

غدر کے بعد آپ رامپور پہنچے، اور ۳۰ روپیہ ماہوار تنخواہ پر ملازم ہو گئے، نواب
کلب علی خاں کے انتقال کے بعد آپ ٹونک پہنچے، اور وہاں سے منگرول
مگر کہیں قسمت نے یاوری نہ کی، آخر نواب حامد علی خاں نے پھر انہیں رامپور
طلب کیا، اور ۳۰ روپیہ وظیفہ مقرر کر دیا، آخر اسی طرح عسرت اور تنگی کی زندگی
بسر کر کے اور ضعیفی کے شدائد برداشت کر کے ۱۹۱۱ء میں راہی ملک عدم ہوئے
تسلیم کے تین دیوان شائع ہو چکے ہیں:- (۱) نظم ارجمند (۲) نظم دل افروز
(۳) دفتر خیال -

دیوانوں کے علاوہ آپ نے آٹھ مثنویاں بھی لکھی ہیں:- نالۂ تسلیم، شام
غریباں، صبح خنداں، دل و جان، نغمۂ بلبل، شوکت شاہجہانی، گوہر انتخاب
تاریخ رامپور۔

تسلیم کی غزلیات کا خاص جوہر فصاحت، صفائی، سادگی اور شوخی
ہے، جذبات میں صداقت اور جوش پایا جاتا ہے، مثنوی میں تسلیم کا مرتبہ
بہت بلند ہے، روانی اور صفائی کے ساتھ جذبات کی رنگینی عجب بہار دکھاتی
ہے، بطور نمونہ چند اشعار غزلیات کے ملاحظہ ہوں۔

خاک ہونے سے فلک ہاتھ آیا ... جبیں تیرا ہی نقش پا نہ ہوا
ہم نے کعبہ میں بھی نہ سجدہ کیا ... جس جگہ تیرا نقش پا نہ ہوا

برسوں لبیک خواں رہا تسلیم (ق) حج کعبہ کبھی قضا نہ ہوا
پر خدا جانے بت پرستی میں کیا مزا تھا کہ پارسا نہ ہوا

قیامت کی ہے بیتابی سرشک چشم گریاں میں
کبھی پہلوئے مژگاں میں کبھی آغوش داماں میں
ہوا میں زندہ جاوید ہو کر قتل اے قاتل
بجھی تھی کیا تیری شمشیر موج آب حیواں میں
تہ مدفن کھلی آنکھیں تو اس دنیا کو یہ سمجھے
نظر آتی تھیں کچھ شکلیں ہمیں خواب پریشاں میں
ڈراتا کیوں ہے اے تسلیم واعظ مجھ کو دوزخ سے
مرا حصہ نہیں ہے کیا خدا کے فضل و احساں میں

حسرت موہانی

عام طور پر حسرت موہانی کو موجودہ دور کا شاعر کہا جاتا ہے اور غالباً یہ محض اس لئے کہ آپ بفضلہ تعالیٰ اب تک حیات ہیں، خدا آپ کی عمر میں برکت دے۔ یہ مانا کہ حسرت اپنی عمر بھر سیاسی خیالات کے لحاظ سے موجودہ عہد کے نامور اور معزز شخص ہیں لیکن ہمیں محض ان کی شاعری سے سروکار ہے، اور ان کی شاعری زبان حال سے کہتی ہے کہ مجھے موجودہ دور سے کوئی تعلق نہیں، مجھے دیکھو، تو دور قدیم کی عینک سے دیکھو۔ ہم نے حسرت کے کلام کا بغور مطالعہ کیا، چند اشعار جن میں سیاسی جذبات کی

۱؎ افسوس کہ ۱۳ مئی ۱۹۵۱ء کو حسرت اس دنیا سے کوچ کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

ترجمانی کی گئی ہے، انہیں چھوڑ کر باقی تمام کلام کا تقاضا ہے کہ حسرت موہانی کو اس دور میں جگہ دی جائے جس دور میں ان کے استاد حضرت تسلیم رونق افروز ہیں بہر حال زمانہ کچھ بھی کہے ناچیز کی یہی رائے ہے،

حسرت تخلص ہے، مولانا سید فضل الحسن صاحب کا، آپ ۱۸۷۵ء میں بمقام موہان (ضلع اناؤ) پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی، پھر علی گڑھ پہنچ کر بی اے کا امتحان پاس کیا، اسی فضا میں آپ کی ذہنی نشوونما ہوئی، شاعری کا شوق ابتدا سے ہے حضرت تسلیم سے تلمذ حاصل تھا، مدتوں تک آپ کا رجحان علمی و ادبی خدمات کی طرف رہا، مگر جب سے سیاسی معاملات میں دلچسپی لینے لگے ہیں، اس طرف پوری توجہ نہیں رہی، فی الحال کانپور میں مستقل قیام ہے، اور سیاسی خدمات کے ساتھ ساتھ ادبی مصروفیت بھی جاری ہے،

حسرت کا سلسلۂ شاعری مومن دہلوی سے ملتا ہے، اس لئے حسرت میں وہ تمام خوبیاں ملتی ہیں جو دہلی اسکول کی شاعری سے مخصوص ہیں خود فرماتے ہیں ؎

ہے زبان لکھنؤ میں رنگ دہلی کی نمود — تجھ سے حسرت نام روشن شاعری کا ہو گیا

آپ کا شمار اساتذہ میں ہے، آپ قدما کی تقلید کا دم بھرتے ہیں اور ان ہی راستوں پر چل کر فخر کرتے ہیں،

حسرت کی زبان وہی ہے جو ان کے استاد اور دادا استاد کی جس کی خصوصیات روانی، بے تکلفی، شستگی اور بانکپن ہیں، مومن کی طرح آپ کو نازک اور معنی خیز فارسی تراکیب کا خاص شوق ہے، اور ان کو اس برجستگی سے استعمال

کرتے ہیں، کہ شعر میں لطف پیدا ہو جاتا ہے

عام طور پر جیتا جاگتا حسن اور مجازی عشق آپ کی شاعری کی روح رواں ہے
حسن میں دلکشی، ناز و انداز، غنج و دلال، نخوت و بے نیازی، شوخی اور لگاوٹ ہے
عشق میں والہانہ شیفتگی، دیوانگی جوش اور شدت جذبات ہے، اور یہی وجہ ہے
کہ ہر شعر سر تا پا اثر میں ڈوبا ہوتا ہے، اشعار میں سادگی، جوش، اصلیت، نزاکت
اور بانکپن کے امتزاج سے وہ چیز پیدا ہوتی ہے، جسے تڑپ کہئے یا تاثیر یا نشاط غم
انبساط کہہ کر اس کے مفہوم کو ادا کیجئے، حسرت کے کلام میں کہیں کہیں روحانیت
کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ اس کے علاوہ سیاسی جذبات کی ترجمانی بھی کی ہے
مسلسل غزلیات بھی دو ایک ہیں موجود ہیں عام طور پر زمین کا انتخاب لاجواب
ہے، نئی نئی زمینیں اور چھوٹی چھوٹی بحریں اور ان میں روانی اور شگفتگی خاص
حسرت کا حصہ ہے، چند غزلیں ملاحظہ ہوں، یہ غزلیات "انتخاب حسرت"
مرتبہ جناب جلیل احمد قدوائی صاحب ایم اے سے نقل کی گئی ہیں

لاؤں کہاں سے حوصلہ آرزوئے سپاس کا — جبکہ صفات یار میں دخل نہ ہو قیاس کا
عشق میں تیرے گم ہوا اک جہاں تجھی کا — جان خبر میں رہ گئی حیرت بے قیاس کا
رونق پیرہن ہوئی خوبی جسم نازنیں — اور بھی شوخ ہو گیا رنگ ترے لباس کا
لطف و عطائے یار کی عام ہیں بسکہ شہرتیں — قلب گناہگار میں نام نہیں ہراس کا

طے نہ کسی سے ہو سکا تیرے سوا یہ معاملہ
جان امیدوار کا حسرت و یاس کا

حسن بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا — کیا کیا میں نے کہ اظہار تمنا کر دیا

بڑھ گئیں تم سے تو مل کر اور بھی بیتابیاں
ہم یہ سمجھے تھے کہ اب دل کو شکیبا کر دیا

پڑھ کے تیرا خط مرے دل کی عجب حالت ہوئی
اضطراب شوق نے اک حشر برپا کر دیا

ہم رہے یاں تک تری خدمت میں سرگرم نیاز
تجھ کو آخر آشنائے ناز بےجا کر دیا

اب نہیں دلکو کسی صورت کسی پہلو قرار
اس نگاہ ناز نے کیا سحر ایسا کر دیا

عشق سے تیرے بڑھے کیا کیا دلوں کے مرتبے
مہر ذروں کو کیا قطروں کو دریا کر دیا

کیوں نہ ہوں تیری محبت سے منور جان و دل
شمع جب روشن ہوئی گھر میں اجالا کر دیا

غیر تیری بزم سے مجھ کو اٹھاتا کیا مجال
میں نے یہ دیکھا کہ تو نے بھی اشارا کر دیا

سب غلط کہتے تھے لطف یار کو وجہ سکوں
درد دل اس نے تو حسرتؔ اور دونا کر دیا

قدموں پہ ان کے رکھ کے سر رفع ملال کر دیا
ہمت عذر خواہ نے آج کمال کر دیا

دور ہم ان کی بزم سے جیتے رہے تو کیا رہے
آہ وہ زندگی جسے غم نے وبال کر دیا

وصل کی بنتی ہیں ان باتوں سے تدبیریں کہیں
آرزوؤں سے پھرا کرتی ہیں تقدیریں کہیں

بے زبانی ترجمان شوق بے حد ہو تو ہو
ورنہ پیش یار کام آتی ہیں تقریریں کہیں

مٹ رہی ہیں دل سے یادیں روزگار عیش کی
اب نظر کاہے کو آئیں گی یہ تصویریں کہیں!

التفات یار تھا اک خواب آغاز وفا
سچ ہوا کرتی ہیں ان خوابوں کی تعبیریں کہیں

تیری بے صبری ہے حسرتؔ خامکاری کی دلیل
گریۂ عشاق میں ہوتی ہیں تاثیریں کہیں

روشن جمال یار سے ہے انجمن تمام
دہکا ہوا ہے آتش گل سے چمن تمام

مدد سے جسم یار کی خوبی کہ خود بخود! — رنگینیوں میں ڈوب گیا پیرہن تمام

دیکھو تو چشم یار کی جادو نگاہیاں — بیہوش اک نظر میں ہوئی انجمن تمام

نشو و نمائے سبزہ و گل ہے بہار میں — شادابیوں نے گھیر لیا ہے چمن تمام

اس نازنیں نے جب سے کیا ہے وہاں قیام — گلزار بن گئی ہے زمینِ دکن تمام

شیرینیِ نسیم ہے سوز و گداز میر

حسرت ترے سخن پہ ہے لطفِ سخن تمام

ہوا اس کی خطا پوشی پہ کیوں ناز گنہگاری — نشانِ شانِ رحمت بن گیا داغ سیہ کاری

نہ تم چھوڑو دیں شکوہ سنجی ہائے ناچاری — کہ فرض عین ہے کیش محبت میں روا داری

وہ دن اب یاد آتے ہیں کہ آغاز محبت میں — نہ چالاکی تجھے اے شوخ آتی تھی نہ عیاری

غضب رنگینیاں تھیں گریہ ہائے ابتدائی کی — ہوئی ہے جن سے داماں محبت پر یہ گلکاری

مگر اتنا ستم ہو ہم دو منعموں پر کہ دنیا سے — مبادا ہو کہ قلم اٹھ جائے تہذیب وفاداری

یہی عالم رہا گر اس کے حسن سحر پرور کا — تو باقی رہ چکی دنیا میں راہ و رسم ہشیاری

بلا برسات کا موسم نہ چھوٹے قید غم سے ہم — مٹی بے لطفیوں میں ہائے گئی لذت میخواری

نسیم دہلوی کو وجد ہے فردوس میں حسرت!

جزاک اللہ تیری شاعری ہے یا فسوں کاری

منزل وصل یار سے پہلا — درمیاں ہے حدود بیم و رجا

دل انساں میں تاب شعلۂ عشق! — حسن مطلق کی لو ہے حق میں ضیا

پردۂ عشق و حسن میں ہے وہی — الغرض نور ارض و نور سما

پھر نہ کیوں وصل حسن و عشق سے ہو — نور بالائے نور جلوہ نما

جان دیدی پہنچ کے اسکے حضور — ہم نے اوروں سے کچھ کہا نہ سنا

اے تری یاد ستم جاں کا علاج — اے ترا ذکر درد دل کی دوا

بے خطا بھی گناہ گار ہیں ہم — آپ جو کچھ کہیں وہی ہے بجا

کچھ بھی شہر وصال دور نہیں — جذبۂ شوق ہو جو راہ نما

ہم رضا کار ہیں خدا کی قسم — ہم نہ ہوں گے مگر شہید وفا

ہو گئے محو عشق سب حسرت

اب غم ہجر ہے نہ شوق بقا

روح کو محو جمال رخ جاناں کر لیں — ہم اگر چاہیں تو زنداں کو گلستاں کر لیں

ان کو لکھیں جو خط شوق تو ارباب وفا — نقش اخلاص کو زیبائش عنواں کر لیں

رنج و راحت ہے اگر سب بہ تقاضائے مراد — اہل تسلیم تیرے درد کو درماں کر لیں

اہل ظاہر سے بچانا ہو تو لازم ہے کہ ہم — پردۂ جاں میں تیرے شوق کو پنہاں کر لیں

کیا کریں اس کے سوا تیرے تغافل کا علاج — کہ دل زار کو گرویدۂ حرماں کر لیں

جان دینا ہے تو کر دیں تیرے قدموں پہ نثار — کام مشکل ہے تو مشکل کو ہم آساں کر لیں

طالبان کرم یار بہ رنگینئ عشق! — دامن زہد پہ گلکاری عصیاں کر لیں

آپ انہیں شوق سے مہمان بلائیں حسرت

کچھ مگر نذر دل و دیں کا تو ساماں کر لیں

زمان فصل گل آیا نسیم مشکبار آئی — دلوں کو مژدہ ہو پھر جوش مستی کی بہار آئی

پھلا پھولا رہے گلزار یارب حسن خوباں کا — مجھے اس باغ کے ہر پھول سے خوشبوئے یار آئی

تری محفل سے ہم آئے مگر یا حال زار آئے — تماشا کامیاب آیا تمنا بیقرار آئی

جو ان کے حسن سے بھی بڑھ گئی ہے بیقراری میں — تڑپ ایسی کہاں سے عشق میں پروردگار آئی

یہ کیا اندھیر ہے اے دشمن اہل وفا تجھ سے — ہوس نے کام جاں پایا محبت شرمسار آئی

بہت کیں کوششیں ترک محبت کی مگر حسرت

جو پھر بھی دل نوازی پردہ چشم سحر کار آئی

ارباب اشتیاق سے پردا نہ چاہیے — اے حسن خود نما تجھے ایسا نہ چاہیے

ان کا ستم بھی عین کرم ہے خواص کو — اس کا مگر عوام میں چرچا نہ چاہیے

کچھ حد سے بڑھ چلی ہیں تمہاری کج ادائیاں — اس درجہ اعتبار تمنا نہ چاہیے

اتنی سی شے کا تم سے تقاضا کریگا کون — دل لے کے ہم سے آنکھ چرانا نہ چاہیے

حسرت کی طرح اور بھی مشتاق ہیں بہت

اس حسن بے مثال کو چھپنا نہ چاہیے

محروم طرب ہے دل دلگیر ابھی تک — باقی ہے تیرے عشق کی تاثیر ابھی تک

اک بار سنی تھی سو مکرر دل میں ہے موجود — اے جان تمنا تیری تقریر ابھی تک

سیکھی تھی جو آغاز محبت میں قلم نے — باقی ہے وہ رنگینی تحریر ابھی تک

بھولی نہیں دل کو تیری دزدیدہ نگاہی — پہلو میں ہے کچھ کچھ خلش تیر ابھی تک

گذرے ہیں بہت استاد مگر رنگ اثر میں

بے مثل ہے حسرت سخن میر ابھی تک

تبصرہ

زبان | اصلاح زبان کے لئے دور چہارم خاص طور پر ممتاز نظر آتا ہے لیکن دو ضخیم

بھی کچھ کم اہمیت نہیں رکھتا، دورِ چہارم کی بچی کچی ناہمواریاں دورِ پنجم میں ہموار ہو گئیں "آئے ہے" "جائے ہے" وغیرہ ذوقؔ و غالبؔ کے ہاں بلکہ داغؔ کے ابتدائی کلام میں بھی موجود ہے، لیکن دورِ پنجم کا آخری زمانہ اس قسم کے قدیم روزمرہ و محاورات سے قطعی پاک نظر آتا ہے۔

اس دور کی سب سے زیادہ اور نمایاں خصوصیت صفائی، سلوگی اور بے تکلفی ہے امیرؔ مینائی، جلالؔ، تسلیمؔ اگرچہ لکھنؤ کے شاعر ہیں لیکن ان کی زبان میں بھی روانی، سلاست، اور بے تکلفی کا دریا بہتا ہوا نظر آتا ہے۔

اصنافِ سخن

اس دور کا بڑا کارنامہ غزل ہے، یوں تو اس دور میں قصیدہ بھی ہوا اور مثنوی بھی لیکن غزل سب پر بھاری ہے

موضوعِ سخن

بازاری حسن و حسن فروش اور عشق و بوالہوسی اس دور کا موضوعِ سخن ہے، بلند قسم کے عشق کی تصویریں اس دور میں کم ملتی ہیں، بلکہ برخلاف اس کے اکثر اشعار ایسے ملتے ہیں، جن کو بداخلاقی کا محرک کہنا نازیبا نہیں، اس دور کی شاعری روحانی جذبات کو ترقی نہیں دیتی، معاملہ بندی، حسن و عشق کی عریاں تصویریں، ہنسی ٹھٹھول، نوک جھوک، رندانہ بے تکلفی، واعظوں پر پھبتی، رقیبوں کی کمبختی، غرض اس محدود دائرے سے شعراء نے کسی مقام پر باہر قدم نہیں رکھا،

اسلوبِ بیان

بے تکلفی اس دور کا خاص اسلوب ہے، اگرچہ امیرؔ اور جلالؔ کے ابتدائی کلام میں تکلف اور آورد کی جھلک پائی جاتی ہے لیکن آخر زمانے کے تقاضے سے مجبور ہو کر وہ بھی صفائی اور بے تکلفی کی

طرف جھک گئے تھے، خوشنما اور پرمعنی فارسی تراکیب بھی اس دور میں نظر آتی ہیں، اور یہ خاص حسرت موہانی کا حصہ ہے۔

باب ۱۰

دور جدید

تمہید گذشتہ ادوار کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے، کہ چند مثنویوں مرثیوں اور نظیر اکبر آبادی کے کلام کو چھوڑکر اب تک اردو ادب کا کارنامہ غزل ہی تھا، ہر دور میں اسی صنف کا پلہ بھاری رہا ہے، اس صنف کو میر، مومن، غالب جیسے شاعروں نے آسمان تک پہنچا دیا، اور دیگر اساتذہ اور خوش فکر شعراء نے غزل کو اس انداز سے کہا کہ متاخرین کے لئے بجز اس کے کہ انہی راستوں پر چلیں، اور کوئی چارہ کار نہیں رہا، ہر بات کی ایک حد ہوتی ہے، اول تو غزل کا میدان ویسے ہی تنگ، اتنے گنے شعراء ان میں بھی ردیف وقافیہ کی قید، اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ حسن وعشق کا محدود دائرہ، آخر کہاں سے اتنی گنجائش آئے، کہ شعراء اپنے جذبات، احساسات اور خیالات کی ترجمانی خاطر خواہ کر سکیں،

تیسرے دور میں نظیر اکبر آبادی مجتہدانہ انداز سے اٹھتے ہیں، اور غزل کو چھوڑ کر اپنا راستہ الگ نکالتے ہیں، ان کے کلام میں تنوع ہے، گوناگون مضامین سے شاعری کے میدان کو وسعت دیتے ہیں، مگر ان کا رنگ مقبول

نہیں ہوتا، اول تو وہ استاد بن کر اپنے شاگردوں کے ذریعہ پروپگنڈا نہیں
کرتے، دوسرے نئی چیز کے لئے زبان و قواعد کی قیود کو توڑ دیتے ہیں، نتیجہ یہ
ہوتا ہے، کہ لوگ باگ ان کے رنگ سے متنفر ہو جاتے ہیں،

چوتھے دور میں مرثیہ نگاری کو فروغ ہوتا ہے، جذبات و فطرت اور منظر
نگاری، کردار نویسی، موسمی اور مقامی کیفیات، رزمیہ نمونے، غرض کیا ہے، جو
ان مرثیوں میں نہیں، انہیں اگر اردو ادب کا شاہکار کہا جائے، تو بیجا نہیں،
لیکن افسوس کہ یہ صنف شاعری محض مذہبی بن کر رہ گئی، بجز ایک خاص طبقہ
شعراء کے اور کسی نے اس طرف توجہ نہیں کی، اس کے علاوہ چونکہ مراثی کی بنیاد
خاص معتقدات پر ہے، اس لئے یہ عام طور پر مفید ثابت نہ ہو سکے،

غدر ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان کی فضا ہر حیثیت سے بدل جاتی ہے
حکومت ایسی قوم کے ہاتھ میں جاتی ہے جس کو ہندوستانیوں اور ہندوستان
کے علم و ادب سے قطعی دلچسپی نہیں، اردو شاعری کا مایہ ناز جوہر روحانیت اس
قوم کی روح رواں مادہ پرستی، ایسی حالت میں انہیں اردو غزل کی کیا خاک قدر
ہو سکتی تھی، بلکہ یوں کہئیے، کہ وہ اردو سے سمجھنے کی اہلیت ہی نہیں رکھتے تھے اور
سچ بات تو یہ ہے، کہ محکوم قوم کی شاعری حاکموں کو کیا پسند آتی،

انگریز اپنے ہمراہ اپنا لٹریچر لے کر آئے تھے، ان کی نثر، نظم، ڈراما، اصل یا
ترجمہ ہو کر ملک میں پھیلا، اس نئی چیز نے لوگوں کے دلوں میں امنگ پیدا کی،
اپنا ادب ان چیزوں سے خالی پایا، شوق پیدا ہوا، کہ اپنے ادب کو بھی ان گلہائے
رنگا رنگ سے باغ و بہار کیجئیے، چنانچہ ایک جماعت ایسے شعراء کی پیدا ہوگئی

جنھوں نے انگریزی لٹریچر سے متاثر ہو کر اردو میں طرح طرح کی راہیں نکالیں اگرچہ
یہ شعرا اس سے قبل خود پایہ کے غزل گو تھے لیکن انگریزی اثر سے انہیں
غزل بے مزہ معلوم ہونے لگی، چنانچہ انہوں نے غزل کو چھوڑ کر خیالات کے
تسلسل کے لئے مثنوی کو لیا، اور حقیقت یہ ہے، کہ نہ صرف ایک گراں قدر ذخیرہ
اردو ادب میں مہیا کر دیا، بلکہ اردو شعر و سخن کی فضا میں انقلاب عظیم برپا کر دیا۔

جو شعرا انگریزی لٹریچر سے متاثر ہوئے، اور جنہوں نے اردو ادب میں
انقلاب پیدا کیا، ان میں آزاد اور حالی سب کے پیش رو ہیں، ان کے بعد
اسمٰعیل، اقبال، چکبست کا نمبر آتا ہے، اکبر الہ آبادی کا شمار بھی ان ہی مصلحین
ادب میں ہو سکتا ہے، چنانچہ اس باب میں ان ہی حضرات کا تذکرہ کیا جائیگا

آزاد دہلوی

محمد حسین نام، آزاد تخلص، خلف مولوی محمد باقر خاص دہلی کے
رہنے والے تھے ۱۸۳۲ء یا ۱۸۳۳ء میں پیدا ہوئے، آپ کے
والد ذوق کے دلی دوست تھے، چنانچہ انہوں نے آزاد کو ان کے حوالہ کیا، آزاد
نے ان ہی کے سایہ عاطفت میں ابتدائی تعلیم پائی، اور نکات عروض و فن سخن
حاصل کیا، ابتدائی تعلیم کے بعد دہلی کالج میں داخل ہو گئے، اور اس مدرسگاہ
سے علوم مروجہ تحصیل کئے۔

شاعری کا چسکا ابتدا سے تھا، اس پر ذوق سا استاد نصیب ہوا، ان کے
ہمراہ آپ کو اکثر معرکے کے مشاعروں میں شرکت کا موقع ملا، نتیجہ یہ ہوا، کہ
بہت جلد شعر و سخن سے کامل مناسبت پیدا ہو گئی

ہنگامہ غدر میں مولوی محمد باقر صاحب شہید ہوئے، گھر بار لٹ گیا

استاد ذوق کا انتقال پہلے ہی ہو چکا تھا۔ ان کے کلام کو آزاد چھاتی سے لگائے بیٹھے تھے۔ افسوس کہ اسی ہنگامہ میں وہ بھی غارت ہو گیا۔ جب دہلی میں کوئی یار و مددگار نہ رہا تو بہ تلاش روزگار لاہور پہنچے۔ اور وہاں سررشتہ تعلیم میں ۱۵ روپے ماہوار پر ملازم ہو گئے۔ لیکن اپنی ذاتی قابلیت کی بدولت روز بروز ترقی کرتے رہے اور "اتالیق پنجاب" کے سب اڈیٹر مقرر ہوئے۔ سررشتہ تعلیم نے آپ سے "قصص الہند" اور "نصیحت رسالے" لکھوائیں جو بہت مقبول ہوئیں۔ گورنمنٹ ہی کے ایما سے آپ نے کابل اور بخارا کا بھی سفر کیا۔ آخر میں گورنمنٹ کالج لاہور میں عربی کے پروفیسر مقرر ہو گئے تھے۔

آزاد فارسی کے عالم متبحر اور عربی کے اچھے عالم تھے۔ بھاشا اور ہندی کے نکات اور خوبیوں سے پوری طرح آگاہ اور انگریزی لٹریچر کی خصوصیات سے واقف تھے۔ فارسی ایسی سلیس اور بامحاورہ بولتے تھے اور لب و لہجہ ایسا تھا کہ ان میں اور اہل ایران میں تمیز کرنا غیر ممکن تھا۔

آزاد جب لاہور پہنچے تو اس وقت دہلی اور لکھنؤ کی ٹکسالی شاعری کی کساد بازاری ہو چکی تھی۔ علوم مغربی لوگوں کے پیش نظر تھے۔ انہیں اپنی شاعری حسن و عشق کے جھوٹے افسانوں اور مبالغہ آمیز کیفیتوں سے بھری ہوئی نظر آتی تھی۔ چنانچہ ان حالات سے متاثر ہو کر آزاد نے اردو میں ایک نئے طرز یا نیچرل شاعری کی بنیاد ڈالی۔ اور لاہور میں کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم پنجاب کی ایما سے ۱۸۷۴ء میں ایک مشاعرہ قائم کیا جو ہندوستان میں اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل نیا تھا۔ اور جس میں بجائے مصرعہ طرح کے

کسی مضمون کا عنوان شاعروں کو دیا جاتا تھا۔ یہ مشاعرہ ہر مہینے میں ایک بار [illegible]
کے مکان میں منعقد ہوتا تھا۔ آپ نے پہلے کئی نظمیں خود لکھیں۔ اور کئی مضا[illegible]
اس ایجاد کی حمایت میں لکھے۔

اردو نثر و نظم پر جو احسانات حضرت آزاد نے کئے وہ تاریخ ادب میں
ہمیشہ سنہرے حرفوں میں لکھے جائیں گے ان احسانات اور ادبی خدمات کے
صلے میں گورنمنٹ نے آپ کو ۱۸۸۷ء میں شمس العلماء کا خطاب مرحمت فرمایا۔

آخری عمر میں حضرت آزاد کی صحت جواب دے چکی تھی۔ کچھ تو دماغی
مصروفیت کچھ صاحبزادی کے انتقال کا صدمہ بغرض ۱۸۸۹ء میں جنون کے
آثار پیدا ہوئے۔ رفتہ رفتہ یہ مرض پختہ ہو گیا۔ اور آخر دم تک انکا ساتھ نہ چھوڑا
آخر اسی حالت میں ۲۲ جنوری ۱۹۱۰ء کو قید ہستی سے آزاد ہو گئے۔

نثر میں جو کارنامے آپ کی یادگار ہیں انکا تذکرہ آئندہ آتا ہے۔ یہاں آپ
کی شاعری سے سروکار ہے۔ سطور بالا میں عرض کیا جا چکا ہے کہ آزاد نے ذوق
کے سایۂ عاطفت میں پرورش پائی۔ ان ہی کی فیض صحبت سے آپ نے غزل سرائی
میں شہرت حاصل کی ہے۔ لیکن افسوس کہ انکا قدیم کلام دستبرد زمانہ اور کچھ آپ
کی بے نیازی کی بدولت ضائع ہو گیا۔ "نظم آزاد" میں کچھ غزلیں آپ کی موجود
ہیں جن میں سے زیادہ تر علالت کی حالت میں لکھی گئی تھیں۔ عالم جنون میں
آپ کا شغل آلہیات تھا۔ اسی کا ذکر اذکار آپ کی زبان پر رہتا تھا چنانچہ ان
غزلوں میں بھی تصوف و حقیقت کی چاشنی پائی جاتی ہے۔ لیکن شاعری میں
آزاد کی اہمیت ان غزلوں کی بنا پر نہیں بلکہ ان کی جدید نظموں کی بنا پر ہے۔

آپ اردو میں نیچرل شاعری کے بانی ہیں۔ چونکہ حضرت آزاد سے پیشتر اس قسم
کی شاعری کے نمونے موجود نہیں تھے۔ اس لئے ان نظموں میں شاعری کی تمام
خوبیاں پیدا نہ ہوسکیں۔ اکثر مقامات پر بندش چست نہیں ہے۔ اور بعض مقامات
پر تعقید کا عیب بھی موجود ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ آپ کے منظوم کلام
میں جوش، صداقت اور سادگی بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ لطیف و نازک تشبیہات
و استعارات آپ کی زبان کے جوہر ہیں۔ شگفتگی، لطافت اور ترنم آپ کے طرز
بیان کی خوبیاں ہیں۔

آپ نے متعدد مثنویاں تصنیف فرمائی ہیں جن میں شب قدر، "صبح امید"،
"گنج قناعت"، "داد انصاف" اور "جواب امن" بہت بلند پایہ ہیں۔

حالی

شمس العلماء خطاب، خواجہ الطاف حسین نام۔ حالی تخلص۔ ۱۸۳۷ء
میں بمقام پانی پت پیدا ہوئے۔ وہاں سات سو برس سے قوم انصار
کی ایک شاخ آباد چلی آتی تھی۔ خواجہ صاحب کو اسی قوم سے تعلق تھا۔ جب آپ
نو برس کے ہوئے تو آپ کے والد خواجہ ایزد بخش نے انتقال کیا۔ چنانچہ آپ
اپنے بہن بھائیوں کی سرپرستی میں تعلیم و تربیت پانے لگے۔ اول آپ نے قرآن
حفظ کیا۔ اس کے بعد ایک بزرگ سید جعفر علی سے دو بار فارسی کی ابتدائی کتابیں
پڑھیں۔ اور حاجی ابراہیم حسین انصاری سے عربی پڑھی۔ ابھی تعلیم مکمل نہ
ہونے پائی تھی۔ کہ آپ کی شادی کر دی گئی۔ اس وقت آپ کی عمر سترہ
سال کی تھی۔ گھر کا سب بوجھ آپ کے بھائی پر تھا۔ اس لئے سب
کی یہ خواہش ہوئی کہ آپ کو نوکری تلاش کرنی چاہیئے۔ مگر آپ کو

تعلیم کا شوق تھا۔ اس لئے آپ گھر والوں سے روپوش ہو کر دہلی چلے آئے۔ اور یہاں آپ نے عربی پڑھنی شروع کی۔ ابھی کتب متداولہ پر پوری طرح عبور نہیں ہوا تھا کہ ۱۸۵۵ء میں بانی پت جانا پڑا۔ وہاں بطور خود بڑی کتابوں کا مطالعہ کرتے رہے۔

۱۸۵۶ء میں آپ کو ضلع حصار میں ایک قلیل تنخواہ کی آسامی صاحب کلکٹر کے دفتر میں مل گئی لیکن ہنگامہ غدر میں ملازمت چھوڑ کر آپ وطن چلے آئے اور چار برس بیکاری کی حالت میں گزارے لیکن اس بیکاری کے زمانے میں اکتساب علم کا سلسلہ جاری رہا۔

قیام دہلی کے دوران میں آپ کی رسائی مرزا غالب تک ہو گئی تھی چنانچہ ان کی صحبت میں شعر و سخن کا شوق پیدا ہوا اور ان کی ہمت افزائی سے آپ شعر کہنے لگے تھے۔ ۱۸۶۱ء میں نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ سے شناسائی ہوئی چنانچہ آپ آٹھ برس تک بطور مصاحب ان کے ہمراہ رہے۔ شیفتہ فارسی اور اردو کے اچھے شاعر تھے مگر شاعرانہ جوش خروش کچھ سرد ہو چلا تھا۔ خواجہ صاحب کی موجودگی سے ان کا افسردہ شوق تازہ ہو گیا۔ ادھر خواجہ صاحب کا میلان طبعی بھی چمک اٹھا۔ اگرچہ آپ غالب سے مشورہ کیا کرتے تھے لیکن درحقیقت مرزا کے مشورہ و اصلاح سے آپ کو چنداں فائدہ نہیں ہوا جو کچھ فائدہ ہوا وہ شیفتہ کی صحبت سے ہوا۔

نواب شیفتہ کی وفات کے بعد پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو میں ایک آسامی آپ کو مل گئی جس میں آپ کو یہ کام کرنا پڑتا تھا کہ جو ترجمے انگریزی سے

اردو میں ہوتے تھے۔ ان کی عبارت آپ درست کر دیتے تھے۔ تقریباً چار برس
آپ نے یہ کام لاہور میں رہ کر کیا۔ اس سے انگریزی لٹریچر کے ساتھ فی الجملہ
مناسبت پیدا ہو گئی۔ اور نامعلوم طور پر آہستہ آہستہ مشرقی لٹریچر اور خاص کر
عام فارسی لٹریچر کی وقعت دل سے کم ہوتی گئی جس زمانے میں آزاد نے لاہور
میں ایک نئے طرز کے مشاعرہ کی بنا ڈالی تھی۔ اسی زمانہ میں حالی نے چار نظمیں
ایک "برسات" پر دوسری "امید" پر تیسری "رحم و انصاف" پر اور چوتھی "حب
وطن" پر لکھیں۔

چار برس لاہور میں رہ کر آپ واپس دہلی آئے۔ اور "اینگلو عربک اسکول"
میں مدرس مقرر ہوئے۔ قیام دہلی کے دوران میں سر سید سے ملاقات ہوئی
اور ان ہی کے ایما سے آپ نے مشہور و معروف "مسدس مد و جزر اسلام"
تصنیف کی۔ ۱۸۸۶ء میں آسمان جاہ مدار المہام حیدرآباد علیگڑھ آئے۔ سر سید
نے آپ کا تعارف ان سے کرایا۔ نواب صاحب نے از راہ قدر دانی ۷۵ روپیہ ماہوار
آپ کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ آپ ایک مرتبہ علی گڑھ کالج کے لئے فنڈ لے کر حیدرآباد
تشریف لے گئے۔ وہاں آپ کا وظیفہ ۷۵ روپیہ سے ایک سو روپیہ کر دیا گیا۔
۱۹۰۴ء میں ادبی خدمات اور علم و فضل کے صلے میں آپ کو شمس العلماء کا
خطاب سرکار انگریزی سے ملا۔ حیدرآباد سے وظیفہ مقرر ہونے کے بعد آپ
نے ملازمت ترک کر دی تھی۔ چنانچہ عمر کے آخری سال پانی پت میں بسر ہوئے
جہاں آپ ادبی خدمات انجام دیتے رہے۔ آخر ۱۹۱۴ء میں داعی اجل کو
لبیک کہا۔

مولنا حالی نے نظم و نثر میں متعدد بلند پایہ تصانیف یادگار چھوڑی ہیں تصانیف نثر کا ذکر آیندہ ہوگا۔ یہاں صرف آپ کی منظوم تصانیف سے سروکار ہے جہانتک غزل کا تعلق ہے آپ بلند پایہ غزل گو ہیں اور ایک دیوان مطبوعہ آپ کی یادگار ہے۔ غزل میں غالب کی اصلاح اور شیفتہ کی ہمنشینی نے بڑی بڑی خوبیاں پیدا کر دی ہیں آپ کے جذبات میں شدت ہے۔ انہیں سادگی اور لطیف کنایہ کے ساتھ اس طرح کہتے ہیں کہ اثر کی انتہا نہیں رہتی۔ مثلاً ؎

جو جان سے درگذرے وہ چاہے سو گذرے گر آج نہ تم آئے۔ کیا جانئے کیا ہوتا

رموز عشق و محبت کو اس صفائی اور سادگی سے بیان کرتے ہیں کہ دل پر ایک کیف اثر چھا جاتا ہے۔ بے تکلفی اور سہل ممتنع اور پرکیف ترنم آپ کی غزلیات کی امتیازی خصوصیات ہیں۔

جدید رنگ کی نظموں میں چار مثنویاں "برسات" "برکھا رت" "مناجات بیوہ" "حب وطن" "نشاط امید" "انصاف" اور "مسدس حالی" (مدوجزر اسلام)، "شکوہ ہند" وغیرہ زیادہ مشہور رہیں۔ ان کے علاوہ چھوٹی چھوٹی متعدد نظمیں "مجموعہ نظم حالی" میں شامل ہیں۔

ان جدید نظموں کا خاص جوہر سادگی، روانی، تسلسل، ہمواری اور یک رنگی ہے۔ منظر نگاری، واقعہ نگاری، سیرت نگاری، فلسفہ قومیت، جذبہ ہمدردی، اخلاق وغیرہ کے نہایت دلکش نمونے ان نظموں میں پائے جاتے ہیں۔ کہیں کہیں یہ نظمیں خشک اور بے کیف بھی ہو گئی ہیں۔ لیکن عام طور یہاں بھی اعلیٰ شاعری کی وجدانی کیفیات موجود ہیں۔

انگریزی لٹریچر سے متاثر ہو کر مولانا نے جو غزلیات لکھیں ان کا مرتبہ کچھ زیادہ بلند نہیں ہے۔ سب سے زیادہ خامی جو ان غزلوں میں محسوس ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ان میں غزل کا فطری لب و لہجہ قائم نہیں رہ سکا ہے۔ اس کے علاوہ سلاست و شگفتگی بھی قائم نہیں رہ سکی ہے۔ بہرحال جدید رنگ کا ابتدائی نمونہ ہونے کی حیثیت سے یہ غزلیں اہمیت رکھتی ہیں۔ نمونہ کے طور پر ایک غزل ملاحظہ ہو۔

نہ عیش کے عنصر ہی رہے گی نہ معولت یہی رہے گی
رہے گی اے منعمو تو باقی دیے کی کچھ روشنی رہے گی

رہے گی کس طرح راہ ایمن کہ رہنما بن گئے ہیں رہزن
خدا نگہباں ہے قافلوں کا اگر یہی رہبری رہے گی!

قبولیت کی کرو نہ پروا جو چاہو مقبول عام ہونا
جو ڈول ڈالو گے حسن ظن کا تو تم سے یاں بدظنی رہے گی

بگاڑ مذہب نے جو ہیں ڈالے نہیں وہ تا حشر مٹنے والے
یہ جنگ وہ ہے جو صلح میں بھی یونہی ٹھنی کی ٹھنی رہے گی

صفائیاں ہو رہی ہیں جتنی دل اتنے ہی ہو رہے ہیں میلے
اندھیرا چھا جائے گا جہاں میں اگر یہی روشنی رہے گی

جو چھوڑ سے میراث کچھ نہ حالی تو اس سے دلتنگ ہوں نہ وارث
رہیں گی ہر حال میں غنی وہ جو نیت ان کی غنی رہے گی

مدوجزر اسلام (یعنی مسدس حالی) کے چند بند بھی ملاحظہ ہوں۔

ولادت رحمۃ للعالمین

یکایک ہوئی غیرت حق کو حرکت　　بڑھا جانب بوقبیس ابر رحمت
ادا خاک بطحا نے کی وہ ودیعت　　چلے آتے تھے جس کی دیتے شہادت
ہوئی پہلوئے آمنہ سے ہویدا
دعائے خلیل اور نوید مسیحا

ہوئے محو عالم سے آثار ظلمت　　کہ طالع ہوا ماہ برج سعادت
نہ چٹکی مگر چاندنی ایک مدت　　کہ تھا ابر میں ماہتاب رسالت
یہ چالیسویں سال لطف خدا سے
کیا چاند نے کھیت غار حرا سے

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا　　مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا　　وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا ضعیفوں کا ماوا
یتیموں کا والی غلاموں کا مولا

خطا کار سے درگزر کرنے والا　　بد اندیش کے دل میں گھر کرنے والا
مفاسد کا زیر و زبر کرنے والا　　قبائل کو شیر و شکر کرنے والا
اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

مس خام کو جس نے کندن بنایا　　کھرا اور کھوٹا الگ کر دکھایا

عرب جس پہ قرنوں سے تھا جہل چھایا پلٹ دی بس اک آن میں اس کی کایا
رہا ڈر نہ بیڑے کو موج بلا کا
ادھر سے ادھر پھر گیا رخ ہوا کا

توحید کی تعلیم

کہ ہے ذات واحد عبادت کے لائق زباں اور دل کی شہادت کے لائق
اسی کے ہیں فرماں اطاعت کے لائق اسی کی ہے سرکار خدمت کے لائق
لگاؤ تو لو اس سے اپنی لگاؤ
جھکاؤ تو سر اس کے آگے جھکاؤ

اسی پر ہمیشہ بھروسا کرو تم اسی کے سدا عشق کا دم بھرو تم
اسی کے غضب سے ڈرو گر ڈرو تم اسی کی طلب میں مرو گر مرو تم
مبرا ہے شرکت سے اس کی خدائی
نہیں اس کے آگے کسی کو بڑائی

خرد اور ادراک رنجور ہیں واں مہ و مہر ادنیٰ سے مزدور ہیں واں
جہاندار مغلوب و مقہور ہیں واں نبی اور صدیق مجبور ہیں واں
نہ پرسش ہے رہبان و احبار کی واں
نہ پروا ہے ابرار و احرار کی واں

تم اوروں کی مانند دھوکا نہ کھانا کسی کو خدا کا نہ بیٹا بنانا
مری حد سے رتبہ نہ میرا بڑھانا بڑھا کر بہت تم نہ مجھ کو گھٹانا
سب انساں ہیں واں جس طرح سرفگندہ

اسی طرح ہوں میں بھی اک اس کا بندہ

بنا نا نہ تربت کو میری صنم تم — نہ کرنا مری قبر پہ سر کو خم تم
نہیں بندہ ہونے میں کچھ مجھ سے کم تم — کہ بیچارگی میں برابر ہیں ہم تم

مجھے دی ہے حق نے بس اتنی بزرگی
کہ بندہ بھی ہوں اس کا اور ایلچی بھی

اسمٰعیل مولوی محمد اسمٰعیل ۱۲ نومبر ۱۸۴۴ء کو میرٹھ میں پیدا ہوئے سولہ سال کی عمر میں محکمہ تعلیم میں ملازم ہوئے۔ کچھ مدت بعد فارسی کے ہیڈ مولوی مقرر ہو گئے۔ اور سہارنپور اور میرٹھ اسکولوں میں اسی خدمت کو انجام دیتے رہے ۱۸۸۸ء میں سنٹرل نارمل اسکول آگرہ میں منتقل ہوئے جہاں بارہ سال رہنے کے بعد ۱۸۹۹ء میں بحسن و خوبی پنشن لی۔ اور میرٹھ واپس چلے آئے حسن خدمات کے صلے میں گورنمنٹ نے خان صاحب کا خطاب عطا فرمایا آپ پنشن لینے کے بعد اپنے وطن میں ادبی خدمات انجام دیتے رہے تا آنکہ یکم نومبر ۱۹۱۷ء کو پیک اجل پہنچا اور آپ اس کے ہمراہ راہی ملک بقا ہوئے۔

آزاد کی طرح مولانا اسمٰعیل نے بھی بچوں کے لئے چھوٹی چھوٹی ریڈریں تصنیف کیں جنہیں گورنمنٹ نے منظور کیا یہ ریڈریں مدت تک مدرسوں میں جاری رہیں۔ اور اب بھی کہیں کہیں پڑھائی جاتی ہیں۔ یہ ریڈریں نہایت سلیس اور بامحاورہ اردو میں بچوں کے ذہنی رجحانات اور دلچسپی کو مدنظر رکھ کر لکھی گئی تھیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ بہت مقبول ہوئیں۔ ان میں جو نظمیں تھیں وہ بھی مولانا ہی کی تصنیف کردہ تھیں۔ جو اپنی سادگی

اور صفائی کے ساتھ اخلاقی حیثیت سے بہت مفید ہیں۔ اگرچہ یہ نظمیں بچوں کے لئے لکھی گئی تھیں لیکن اب زمانے نے ثابت کر دیا ہے کہ یہ بچوں جوانوں، بوڑھوں سب کے لئے یکساں طور پر سامان دلچسپی مہیا کرتی ہیں مولانا کو دیہاتی منظر نگاری کا خاص ملکہ حاصل ہے۔ انگریزی نظموں کا ترجمہ نہایت حسن و خوبی کے ساتھ کیا ہے۔ ہندی الفاظ کو نہایت بے تکلفی سے استعمال کرتے ہیں۔ آپ کا کلام قومی اصلاح سے خالی نہیں۔ کلیات میں غزل، رباعی، قصیدہ وغیرہ اصناف بھی ملتی ہیں اور ان میں بھی آپ کا رتبہ کسی طرح کم نہیں۔ لیکن آپ کی شہرت زیادہ تر آپ کی چھوٹی چھوٹی نظموں کی بنا پر ہے۔

اکبر الہ آبادی

سید اکبر حسین رضوی نام۔ اکبر تخلص۔ الہ آباد کے رہنے والے ۱۶ نومبر ۱۸۴۶ء کو بمقام بارہ ضلع الہ آباد پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم سرکاری اسکولوں میں پائی۔ ۱۸۶۶ء میں مختار کاری کا امتحان پاس کیا اور نائب تحصیلدار مقرر ہو گئے ۱۸۷۰ء میں ہائی کورٹ کے مثل خواں اور ۱۸۸۰ء میں وکالت کا امتحان پاس کر کے منصف ہو گئے ۱۸۸۸ء میں سب آرڈینیٹ جج اور ۱۸۹۳ء میں عدالت خفیفہ کے جج مقرر ہوئے۔ گورنمنٹ نے حسن خدمات کے صلے میں خان بہادری کا خطاب عطا فرمایا ۱۹۰۳ء میں پنشن لی اور ادبی اور علمی زندگی بسر کرتے رہے تا آنکہ ۱۹۲۱ء میں انتقال کیا۔

اکبر کو شعر و سخن کا ابتدا ہی سے شوق تھا چنانچہ حضرت وحید الہ آبادی شاگرد خواجہ آتش لکھنوی سے مشورہ سخن کیا کرتے تھے ابتدائی کلام پر قدامت

اور تقلید کا رنگ چھایا ہوا ہے۔ مقررہ مضامین کو سیدھے سادے الفاظ میں ادا کرتے ہیں۔ اسی دور کے کلام میں بجز اس کے صفائی اور سادگی ہے۔ اور کوئی خوبی نہیں۔ البتہ آیندہ ترقی کے آثار پائے جاتے ہیں۔

رفتہ رفتہ آپ کی غزل میں ایک تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ چونکہ مزاج میں شوخی اور طبیعت میں ظرافت ابتدا سے تھی۔ اس لئے غزلوں میں بھی یہی رنگ نمایاں ہونے لگا۔ تقلیدی اثر کم اور اس کی جگہ ایک خاص رنگ پیدا ہوتا گیا۔ اخلاقی، سیاسی، روحانی، مذہبی، اصلاحی عناصر ابھرنے شروع ہوئے لیکن ظرافت اور طنز کے پیرایہ میں۔ آخری دور میں یہی ان کا رنگ ہو گیا۔

تین کلیات آپ کی یادگار ہیں۔ دو آپ کی زندگی ہی میں شائع ہو گئے تھے۔ تیسرا وفات کے بعد شائع ہوا۔

اکبر مشقی کے عہد کی غزلیات بہت بلند پایہ ہیں۔ لطف زبان اور روانی کے ساتھ مضمون آفرینی اور نازک خیالی عجب لطف دیتی ہے۔ عاشقانہ رنگ کے اشعار میں جدت ادا اور ندرت بیان سے جان ڈال دیتے ہیں۔ سوز و گداز کی بھی کمی نہیں۔ زمین غزل میں تو یہ تو سیاسی۔ مذہبی اور سوشل مضامین کا اضافہ کیا ہے۔ اور ان مضامین کو اس لطف سے نظم کرتے ہیں کہ طبیعت پر ذرا گراں نہیں گزرتے۔ مثلاً

دل مرا جس سے بہلتا کوئی ایسا نہ ملا	بت کے بندے ملے اللہ کا بندہ نہ ملا
بزم یاراں سے پھری باد بہاری مایوس	ایک سر بھی اسے آمادۂ سودا نہ ملا
گل کے خواہاں تو نظر آئے بہت عطر فروش	طالب زمزمۂ بلبل شیدا نہ ملا

واہ کیا راہ دکھائی ہے ہمیں مرشد نے ۔۔۔ کر دیا کعبہ کو گم اور کلیسا نہ ملا

رنگ چہرے کا تو کالج نے بھی قائم رکھا ۔۔۔ رنگ باطن میں مگر باپ سے بیٹا نہ ملا

سید اٹھے جو گزٹ لے کے تو لاکھوں لائے ۔۔۔ شیخ قرآن دکھاتا پھرا پیسا نہ ملا

ہوشیاروں میں تو اک اک سے سوا ہے اکبر
مجھ کو دیوانوں میں لیکن کوئی تجھ سا نہ ملا

اکبر کی شہرت عام طور پر ان کی ظرافت کی بنا پر ہے۔ اگرچہ آپ مصلح قوم ہیں، مذہبی واعظ ہیں، صوفی ہیں، فلسفی ہیں، مغرب کی کورانہ تقلید کے دشمن ہیں، قدیم تہذیب کے حامی ہیں۔ لیکن آپ کی اصلاح آپ کا وعظ اور آپ کی نصیحت ظرافت، بذلہ سنجی، اور طنز لطیف کے نہایت نازک پردوں میں چھپی ہوتی ہے۔

اگرچہ لفظوں کی بدلیوں میں چھپا ہے معنی کا چاند اکبر
مگر ہیں مضمون ایسے روشن کہ لو کی طرح چھن رہے ہیں

آپ گمراہوں کے دل و جگر میں چٹکیاں لیتے ہیں۔ ان کی دکھتی ہوئی رگ کو نصیحت کے نشتر سے چھیڑتے ہیں۔ مگر اپنی ظرافت کی رنگینی سے انہیں روٹھنے اور بگڑنے نہیں دیتے۔ بلکہ حضرت آسمر ہنستی ہنسا دیتے ہیں۔

ظرافت ایک کیفیت ہے۔ اس کا تجزیہ نہیں ہو سکتا۔ اور نہ یہ بتایا جا سکتا ہے کہ ظرافت کیونکر پیدا کی جا سکتی ہے۔ تاہم اکبر کے کلام میں چند موٹی موٹی باتوں سے ان کی ظرافت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ نئی اور انوکھی تشبیہات جن پر پھبتی کا اطلاق ہو سکے۔ محاوروں کا عجیب وغریب استعمال

الفاظ کے غیر معمولی اور انکے معنی۔ غیر زبانوں کے الفاظ اور ان کا کوئی خاص استعمال، عامیانہ اور مبتذل الفاظ کو خوبی سے کام میں لانا۔ مثلاً گٹ پٹ فالتو وغیرہ۔ غرض یہ چند امور ہیں جن سے ظرافت پیدا ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں خاص خاص مطالب ادا کرنے کے لئے اکبر نے خاص خاص الفاظ ایجاد کئے ہیں اور ان کو نہایت خوبی اور لطف کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ مثلاً مس، شیخ، سید، اونٹ، گائے، گرجا، مسجد، مندر، بت، کالج، برہمن لالہ، بدھو، جمن، کلو، ٹٹو، ریل وغیرہ ہر لفظ سے آپ وہ کام لیتے ہیں جو متعدد جملوں سے بھی نہیں نکل سکتا۔

اب ان کے کلام سے لطف اٹھایئے:۔

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں
اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو ان سے پردہ تمہارا وہ کیا ہوا
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

ہر چند کہ کوٹ بھی ہے پتلون بھی ہے — بنگلہ بھی ہے پاٹ بھی ہے صابون بھی ہے
لیکن یہ میں تجھ سے پوچھتا ہوں ہندی — یورپ کا تری رگوں میں کچھ خون بھی ہے

اگرچہ شیخ تسکین طبع ملت ہے حب قومی میں آہ کرنا
مفید تر ہے مگر دلوں کو رجوع سوئے الٰہ کرنا
کہے کوئی شیخ سے یہ جا کر کہ دیکھئے آ کے بزم سید
یہ رونق اور یہ چہل پہل ہو تو کیا برا ہے گناہ کرنا

- سدا بس شیخ کعبہ کو ہم انگلستان دیکھیں گے
وہ گھر دیکھیں خدا کا ہم خدا کی شان دیکھیں گے

بیان مغربی سے ہیں تعارف کی تمنائیں
میں دیکھوں گا انہیں اور وہ مرا ایمان دیکھیں گے

باغوں میں تو بہار درختوں کی دیکھ لی کالج میں آ کے کانووکیشن کو دیکھیے
بیموئے کاغذی تو بہت دیکھے آپ نے اب کاغذی ترقی پنشن کو دیکھیے

پنڈت برج نرائن چکبست

۱۸۸۲ء میں بمقام فیض آباد پیدا ہوئے چند سال بعد لکھنؤ چلے آئے اور وہیں آپ کا نشو و نما ہوا۔ ۱۹۰۵ء میں کیننگ کالج سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی اور ۱۹۰۸ء میں وکالت کا امتحان پاس کر کے وکالت شروع کر دی۔ آپ کا شمار لکھنؤ کے ممتاز وکیلوں میں تھا۔ ۱۲ر فروری ۱۹۲۶ء کو ایک مقدمہ کی پیروی میں آپ رائے بریلی گئے تھے سہ پہر کو لکھنؤ لوٹنے کے لئے اسٹیشن پر آئے۔ دماغ پر فالج گرا اور زبان بند ہو گئی۔ حتی الوسع دوڑ دھوپ ہوئی۔ مگر علاج کارگر نہ ہوا۔ آخر اسٹیشن ہی پر سات بجے شام کو انتقال کیا۔ آپ کے بڑے بھائی پنڈت مہاراج نرائن چکبست آپ کی لاش کو لکھنؤ لے گئے۔

شاعری کا شوق آپ کو بچپن سے تھا۔ نو برس کی عمر سے شعر و سخن کا شغل جاری تھا۔ اساتذہ میں آتش، غالب اور انیس کے کلام کے آپ شیدا تھے۔ چنانچہ آپ کی غزل پر آتش اور مسدس پر انیس کی تقلید کا اثر

نمایاں ہے۔

آپ کا مجموعہ کلام "صبحِ وطن" انڈین پریس الہ آباد نے شائع کیا ہے جس میں آپ کی نظمیں، مسدس، غزلیات وغیرہ شامل ہیں۔

چکبست کی زبان لکھنؤ کی ٹکسالی زبان ہے۔ سلاست، چستی، بندش، اور حسنِ ترکیب آپ کی خصوصیاتِ زبان ہیں۔

غزلیات میں حسن وعشق کے افسانے بہت کم ہیں۔ اخلاقی مضامین کی کثرت ہے فلسفہ زندگی و موت کے مضامین اکثر پائے جاتے ہیں اور حبِ وطنی کے جذبات کو بھی غزلوں میں سلیقہ سے جگہ دی ہے سادگی، بے تکلفی اور جوش آپ کی غزلیات کی خصوصیات ہیں۔

نظموں میں زیادہ تر مسدس ہیں ان پر انیس کی تقلید کا رنگ غالب ہے زبان اور طرزِ ادا نہایت صاف اور رواں ہے۔ مسدسوں کو چار حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے (۱) حبِ قومی (۲) حبِ وطنی (۳) سیاسی (۴) احباب اور دیگر لیڈروں کے مراثی۔

مسدسوں میں صداقتِ جذبات کے علاوہ جوش پایا جاتا ہے فلسفیانہ خیالات سے انہیں بھاری بھرکم نہیں کرتے بلکہ سادگی سے جذبات کا اظہار کرتے چلے جاتے ہیں۔ جہاں کہیں پند و نصیحت کا موقع آپڑتا ہے وہاں لطف خشک نہیں ہونے پاتے بلکہ شاعرانہ لطافت ہر جگہ قائم رکھتے ہیں اور سادگی ادا کے جادو سے حرف حرف میں جادو بھر دیتے ہیں۔

نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

پھول مالا

قوم کی لڑکیوں سے خطاب

روشِ خام پہ مردوں کی نہ جانا ہرگز　　داغ تعلیم میں اپنی نہ لگانا ہرگز!
نام رکھا ہے نمائش کا ترقی و رفارم　　تم اس انداز کے دھوکے میں نہ آنا ہرگز
رنگ ہے جن میں مگر بوئے وفا کچھ بھی نہیں　　ایسے پھولوں سے نہ گھر اپنا سجانا ہرگز
خود جو کرتے ہیں زمانہ کی روش کو بدنام　　ساتھ دینا نہیں ایسوں کا زنانا ہرگز
پوجنے کے لئے مندر جو ہے آزادی کا　　اس کو تفریح کا مرکز نہ بنانا ہرگز
اپنے بچوں کی خبر قوم کے مردوں کو نہیں　　یہ ہیں معصوم انہیں بھول نہ جانا ہرگز
ان کی تعلیم کا مرکز ہے تمہارا زانو　　پاس مردوں کے نہیں ان کا ٹھکانا ہرگز
کاغذی پھول ولائیت کے دکھا کر ان کو　　دیس کے باغ سے نفرت نہ دلانا ہرگز
نغمۂ قوم کی لے جس میں سما ہی نہ سکے　　راگ ایسا کوئی ان کو نہ سکھانا ہرگز
گو ہر رگوں میں تمہارے نہ ہو اس وقت کا رنگ　　ان ضعیفوں کو نہ ہنس ہنس کے رلانا ہرگز

ہم تمہیں بھول گئے اس کی سزا پاتے ہیں
تم ذرا اپنے تئیں بھول نہ جانا ہرگز

غزل

فنا کا ہوش آنا زندگی کا درد سر جانا　　اجل کیا ہے خمار بادۂ ہستی اتر جانا
عزیزان وطن کو غنچہ و برگ و ثمر جانا　　خدا کو باغباں اور قوم کو ہم نے شجر جانا
وہ گلشن کی فضا اور چاندنی کا وہ نکھر جانا　　وہ بڑھ کر گیسوئے لیلائے شب کا تا کمر جانا

عروس جاں نیا پیراہن ہستی بدلتی ہے — فقط تمہید آنے کی ہے دنیا سے گذر جانا
مصیبت میں بشر کے جوہر مردانہ کھلتے ہیں — مبارک بزدلوں کو گردش قسمت سے ڈر جانا
وہ طبع پاس پرور نے مجھے چشم عقیدت دی — کہ شام غم کی تاریکی کو بھی نور سحر جانا
سواد خلد سمجھا کنج مرقد کی رہائی کو — سپیدی کو کفن کی ہے جنت کی سحر جانا
گدائے سلطنت کی شکر حق سے اور قناعت سے — زباں کو تیغ اور نان شبینہ کو سپر جانا
وہی قطرہ لہو کا اشک بنکر گر گیا رسوا — جسے ہم نے نمک پروردہ زخم جگر جانا
مقام کوچ کیا ہے منزل مقصود تک کھولے — قیامت تھا سرائے دہر میں دو دن ٹھہر جانا
بہت سودا رہا واعظ تجھے نار جہنم کا ! — مزہ سوز محبت کا کبھی کچھ اے بیخبر جانا
کرشمہ یہ بھی ہے اے بیخبر افلاس قومی کا — ملازمت میں ہیں اہل ہنر کا دربدر جانا
اجل کی نیند میں بھی خواب ہستی گر نظر آیا — تو پھر بیکار ہے تنگ آ کے اس دنیا سے مر جانا
وہ سودا زندگی کا ہے کہ غم انساں سہہ جاتا ہے — نہیں تو ہے بہت آساں اس جینے سے مر جانا
ہمیں نازحسرت میں اسی لئے باغبانی کی — کہ جس نے اپنی محنت ہی کو محنت کا ثمر جانا

سدھاری منزل ہستی سے کس لئے اعتنائی سے
تن خاکی کو شاید روح نے گرد سفر جانا

ڈاکٹر سر شیخ محمد اقبال اقبال کی ولادت ۱۸۷۵ء میں ہوئی۔ وطن مالوف سیالکوٹ ہے۔ لاہور کالج میں تعلیم پا کر ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ ڈگری حاصل کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج میں پروفیسر ہو گئے۔ ۱۹۰۵ء میں تکمیل علم کے لئے انگلستان گئے۔ وہاں فلسفے کے ڈاکٹر اور قانون کے بیرسٹر ہو کر ۱۹۰۸ء میں ہندوستان واپس آئے۔ لاہور ہی کو آپ کے مستقل

قیام کا فخر حاصل رہا۔

ابتدائے سن تمیز سے آپ کی طبیعت شاعری کی طرف مائل تھی حضرت داغ دہلوی کی استادی کا ہندوستان میں ہر طرف ڈنکا بج رہا تھا۔ اقبال نے بھی ان سے رجوع کیا اور بذریعہ خط و کتابت اصلاح لینی شروع کی۔ ابتدا میں غزل کہا کرتے تھے۔ ان میں داغ کی اصلاح کی بدولت صفائی اور سلاست کا جوہر موجود ہے۔ لیکن اقبال کی ذہانت اور جدت پسند طبیعت غزل کے محدود دائرے میں کب رک سکتی تھی چنانچہ اُنہوں نے نظمیں لکھنی شروع کیں۔

۱۸۹۹ء میں دوستوں کے اصرار سے انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسہ میں آپ نے "نالۂ یتیم" کے عنوان سے ایک قابل قدر نظم پڑھی۔ اس نظم نے ان کی شہرت کی بنیاد رکھی جو رفتہ رفتہ اطراف ہند اور بیرونجات میں پھیل گئی۔

انگریزی لٹریچر کے ماہر اور فلسفی ہونے کے علاوہ آپ کو غور و فکر اور تلاش و جستجو کا ذوق ابتدا سے تھا۔ اردو کی تقلیدی شاعری کو چھوڑ کر آپ نے جدید رنگ کی نظمیں لکھیں انگریزی نظموں کے نہایت کامیاب ترجمے کئے نظموں کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں (۱) بانگ درا (۲) بال جبریل (۳) ضرب کلیم۔

اقبال کا کلام ہندوستان ہی میں نہیں۔ بلکہ ایران، افغانستان، انگلستان وغیرہ ممالک میں بھی قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ گورنمنٹ برطانیہ

نے بھی آپ کی خاطر خواہ قدردانی فرمائی اور ۲۳ء کے معزز خطاب سے
سرفراز کیا۔

اقبال نے ہندوستان کی سیاست میں بھی حصہ لیا۔ اور مسلم لیگ کو
بے پناہ ذہنی تقویت پہنچائی۔ بعض حلقوں کا خیال بلکہ اعتقاد ہے کہ پاکستان
کا تصور اول اول اقبال ہی کے دل و دماغ نے ایجاد کیا تھا۔ اس لئے اگر آپ
کو بانیان پاکستان کی صف میں ممتاز جگہ دی جائے تو غیر مناسب نہ ہوگا۔
اقبال کے خواب پاکستان کی عملی تعبیر میں ابھی اندازاً ۹ سال کی مدت باقی
تھی کہ یہ قومی و ملی شاعر ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو دنیا سے رخصت ہوا۔ وفات سے
کچھ عرصہ پیشتر یہ قطعہ لکھا تھا۔

سرود رفتہ باز آید کہ ناید — نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگار ایں فقیرے — دگر دانائے راز آید کہ ناید

انگریزی لٹریچر کے زیر اثر اردو میں اگر نئے خیالات و اسالیب کا اضافہ ہو
سکتا ہے تو کلام اقبال اس کا بہترین نمونہ ہے۔ اگرچہ بعض پرستاران دہلی و
لکھنؤ نے ان کی زبان پر چند اعتراضات کئے ہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان
کے علوئے خیال، قومی ہمدردی، اخلاقی و معاشرتی اصلاح، علمی بیداری، قومی
مذہبی اور سیاسی ہمت افزائی کے سب قائل ہیں۔

اقبال کے کلام کا خلاصہ یا روح رواں ذیل کا شعر ہے۔

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

اسی یقین، عمل، اور محبت کو آپ عجب عجب انداز سے فلسفانہ رنگ میں رنگ کر پرجوش انداز میں پیش کرتے ہیں۔ جگنو کو، ستاروں کو، چاند اور شبنم کو مخاطب کر کے کس کس بلند اور شاندار طریقے سے پیچیدہ مسائل کو حل کرتے ہیں۔ بادۂ حب قوم و مذہب سے ہمیشہ سرشار رہتے ہیں اور نئے نئے انداز سے مسلمانوں کے افسردہ دلوں میں جوش و خروش پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ خود ہی خدا سے شکوہ کرتے ہیں کہ اے خدا تو اپنے مسلمانوں سے بے التفاتی برت رہا ہے اور خود ہی شکوہ کا جواب دیتے ہیں۔ اور سب الزام مسلمانوں کے سر رکھتے ہیں۔ مسدس حالی کے بعد اگر اس پایہ کی کوئی نظم لکھی گئی ہے تو وہ اقبال کا "شکوہ" و "جواب شکوہ" ہے

آخر میں یہ عرض کر دینا مناسب ہے کہ نادر تشبیہات، لطیف استعارات اور فارسی تراکیب اقبال کی زبان کی خصوصیات ہیں۔ بندش چست ہوتی ہے فارسی تراکیب کے باوجود روانی و سلاست قائم رہتی ہے اور اسی روانی کی وجہ سے خوشگوار ترنم پیدا ہو جاتا ہے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو :—

زندگی

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے سرِ آدم ہے، ضمیرِ کن فکاں ہے زندگی

زندگانی کی حقیقت کوہ کن کے دل سے پوچھ جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب — اور آزادی میں بحر بیکراں ہے زندگی

آشکارا ہے یہ اپنی قوت تسخیر سے — گرچہ اک مٹی کے پیکر میں نہاں ہے زندگی

قلزم ہستی سے تو ابھرا ہے مانند حباب — اس زیاں خانہ میں تیرا امتحاں ہے زندگی

دگرگوں ہے جہاں، تاروں کی گردش تیز ہے ساقی
دل ہر ذرہ میں غوغائے رستاخیز ہے ساقی

متاع دین و دانش لٹ گئی اللہ والوں کی
یہ کس کافر ادا کا غمزۂ خوں ریز ہے ساقی

وہی دیرینہ بیماری! وہی نامحکمی دل کی!
علاج اس کا وہی آب نشاط انگیز ہے ساقی

حرم کے دل میں سوز آرزو پیدا نہیں ہوتا
کہ پیدائی تری اب تک حجاب آمیز ہے ساقی

نہ اٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے
وہی آب و گل ایراں، وہی تبریز ہے ساقی

نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشت ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی!

فقیر راہ کو بخشے گئے اسرار سلطانی
بہا میری نوا کی دولت پرویز ہے ساقی

کیا عشق ایک زندگی مستعار کا
کیا عشق پائدار سے ناپائدار کا

وہ عشق جس کی شمع بجھا دے اجل کی پھونک
اس میں مزا نہیں تپش و انتظار کا

میری بساط کیا ہے تب و تاب یک نفس
شعلہ سے بے محل ہے الجھنا شرار کا

کر بیٹھے مجھ کو زندگی جاوداں عطا
پھر ذوق و شوق دیکھ دل بیقرار کا

کانٹا وہ دے کہ جس کی کھٹک لازوال ہو

یارب وہ درد جس کی کسک لازوال ہو

وہی میری کم نصیبی وہی تیری بے نیازی
میرے کام کچھ نہ آیا یہ کمال نے نوازی

میں کہاں ہوں تو کہاں ہے یہ مکاں کہ لامکاں ہے
یہ جہاں مرا جہاں ہے کہ تری کرشمہ سازی

اسی کشمکش میں گذریں مری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و ساز رومی کبھی پیچ و تاب رازی

وہ فریب خوردہ شاہیں کہ پلا ہو کرگسوں میں
اسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسم شاہبازی

نہ زباں کوئی غزل کی نہ زباں سے باخبر میں
کوئی دلکشا صدا ہو عجمی ہو یا کہ تازی

نہیں فقر و سلطنت میں کوئی امتیاز ایسا
یہ سپہ کی تیغ بازی وہ نگہ کی تیغ بازی

کوئی کارواں سے ٹوٹا کوئی بدگماں حرم سے

کہ امیرِ کارواں میں نہیں خوئے دل نوازی

ہر شے مسافر، ہر چیز راہی | کیا چاند تارے، کیا مرغ و ماہی

تو مردِ میداں، تو میرِ لشکر | نوری حضوری تیرے سپاہی

کچھ قدر اپنی تو نے نہ جانی | یہ بے سوادی، یہ کم نگاہی

دنیائے دوں کی کب تک غلامی | یا راہبی کر یا پادشاہی

پیرِ حرم کو دیکھا ہے میں نے
کردار بے سوز، گفتار واہی!

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں | ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں | یہاں سینکڑوں کارواں اور بھی ہیں

قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر! | چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں

اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم | مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں

تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا | ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں

اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا | کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں
یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں

جبریل و ابلیس

جبریل۔ ہمدمِ دیرینہ! کیسا ہے جہانِ رنگ و بو

ابلیس۔ سوز و ساز و درد و داغ و جستجو و آرزو

جبریل:- ہر گھڑی افلاک پر رہتی ہے تیری گفتگو
کیا نہیں ممکن کہ تیرا چاکِ دامن ہو رفو

ابلیس:- آہ اے جبریل تو واقف نہیں اس راز سے
کر گیا سرمست مجھ کو ٹوٹ کر میرا سبو
اب یہاں میری گذر ممکن نہیں ممکن نہیں
کس قدر خاموش ہے یہ عالمِ بے کاخ و کو
جس کی نومیدی سے ہو سوزِ درونِ کائنات
اس کے حق میں تقنطوا اچھا ہے یا لا تقنطوا

جبریل - کھو دیے انکار سے تو نے مقاماتِ بلند
چشمِ یزداں میں فرشتوں کی رہی کیا آبرو

ابلیس:- ہے مری جرأت سے مشتِ خاک میں ذوقِ نمو
میرے فتنے جامۂ عقل و خرد کے تار و پو
دیکھتا ہے تو فقط ساحل سے رزمِ خیر و شر
کون طوفاں کے طمانچے کھا رہا ہے میں کہ تو
خضر بھی بے دست و پا الیاس بھی بے دست و پا
میرے طوفاں یم بہ یم دریا بہ دریا جو بہ جو
گر کبھی خلوت میسر ہو تو پوچھ اللہ سے
قصۂ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو!
میں کھٹکتا ہوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح

تو فقط اللہ ھو اللہ ھو اللہ ھو

محبت

شہید محبت نہ کافر نہ غازی
محبت کی رسمیں نہ ترکی نہ تازی

وہ کچھ اور شے ہے محبت نہیں ہے
سکھاتی ہے جو غزنوی کو ایازی

یہ جوہر اگر کار فرما نہیں ہے
تو ہیں علم و حکمت فقط شیشہ بازی

نہ محتاج سلطاں نہ مرعوب سلطاں
محبت ہے آزادی و بے نیازی

مرا فقر بہتر ہے اسکندری سے
یہ آدم گری ہے وہ آئینہ سازی

یہ پیام دے گئی ہے مجھے باد صبح گاہی
کہ خودی کے عارفوں کا ہے مقام پادشاہی

تری زندگی اسی سے تری آبرو اسی سے
جو رہی خودی تو شاہی نہ رہی تو روسیاہی

نہ دیا نشان منزل مجھے اے حکیم تو نے!
مجھے کیا گلہ ہو تجھ سے تو نہ رہ نشیں نہ راہی

میرے حلقۂ سخن میں ابھی زیر تربیت ہیں
وہ گدا کہ جانتے ہیں رہ و رسم کج کلاہی!

یہ معاملے ہیں نازک جو تری رضا ہو تو کر!
کہ مجھے تو خوش نہ آیا یہ طریق خانقاہی

تو ہما کا ہے شکاری ابھی ابتدا ہے تیری

نہیں مصلحت سے خالی یہ جہان مرغ وماہی

تو عرب ہو یا عجم ہو ترا لَا اِلٰہ اِلَّا

لغت غریب جب تک ترا دل نہ دے گواہی

چیونٹی اور عقاب

چیونٹی:- میں پائمال و خوار و پریشان و دردمند

تیرا مقام کیوں ہے ستاروں سے بھی بلند

عقاب:- تو رزق اپنا ڈھونڈتی ہے خاک راہ میں

میں نہ سپہر کو نہیں لاتا نگاہ میں!

جوش ملیح آبادی

شبیر حسن خاں نام، جوش تخلص۔ ملیح آباد کے رہنے والے۔ قصبہ کنولہار میں ۱۸۹۶ء میں پیدا ہوئے۔

آپ فقیر محمد خاں گویا صاحب "بستان حکمت" (ملاحظہ ہو حصہ نثر۔ فورٹ ولیم کالج) کے پڑپوتے ہیں۔ جوش لڑکپن ہی میں سایۂ پدری سے محروم ہو گئے تھے جس کی وجہ سے تعلیم و تربیت پر خاطر خواہ توجہ نہ ہو سکی۔

شعر و سخن کا ذوق ابتدا سے تھا۔ زمانہ طالب علمی میں مشق سخن جاری تھی۔ خداداد ذہانت اور مذاق سلیم نے رہبری کی اور عہد حاضرہ میں صاحب طرز شعراء میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔

ابتدائً زمینداری کا کام کرتے تھے۔ پھر دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کے شعبۂ تالیف و ترجمہ میں ادبی نقاد کی خدمات انجام دیتے رہے۔ اس کے بعد دہلی سے "کلیم" نامی رسالہ نکالا جو چند سال تک جاری رہا۔ فی الحال

دہلی ہی میں مستقل قیام ہے۔ اور حکومت ہند کے اردو رسالہ "آجکل" کے مدیر اعلیٰ کے عہدہ پر فائز ہیں۔

جوش صاحب کو غزل اور نظم دونوں پر قدرت کامل حاصل ہے لیکن شہرت زیادہ تر آپ کی نظموں کی وجہ سے ہے۔

غزل میں صفائی روانی اور سلاست بہت ہے۔ فارسی تراکیب میں سدش کی جستی اور دلکشی موجود ہے۔ سوز و گداز بھی دلپسند حد تک پایا جاتا ہے صوفیانہ مضامین اور معرفت کے رموز بھی نہایت سادگی سے نظم ہوئے ہیں ابتذال اور عامیانہ پن سے کلام یکسر پاک ہے۔

نظم میں آپ کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ نظموں میں جوش، سادگی اور صداقت بدرجہ احسن موجود ہے۔ تشبیہات میں ایک طرح کی جدت ہے جس سے کلام کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔ اصلاحی پہلو بھی کافی نمایاں ہوتا ہے۔ نظموں میں جذبات اور تخئیل کا تعدد بہت ہے اس لئے عام طور پر مناظر قدرت کی عکاسی میں بیچارل حالت پوری طرح واضح نہیں ہوتی۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ جذبات کی آڑ میں جو دھندلی سی تصویر ہوتی ہے وہ کافی دلکش ہوتی ہے۔ کلام عام طور پر بلند پایہ اور معیاری ہوتا ہے۔ یاس و حرماں نصیبی کا کہیں پتہ نہیں ملتا۔

جوش کی زبان عام طور پر فارسی تراکیب سے گراں بار ہوتی ہے۔ خصوصاً جن نظموں میں جذبات کی کمی اور تخیل کی بلندی زیادہ ہوتی ہے۔ وہ خوشنما الفاظ دلکش تراکیب اور خوبصورت تشبیہوں کا مجموعہ بن کر رہ جاتی ہیں۔ مثلاً ایک نظم بعنوان "آگ" کے آخری دو تین شعر ملاحظہ ہوں۔

زندہ و رقصندہ و جوالہ جو، غلطیدہ گو۔

خندۂ تازہ بتازہ آب و رنگ لو بہ لو

پرچم تنویر وجہ اضطراب تیرگی

ناخن ظلمت کشا۔ تعبیر خواب تیرگی

مشعل رہرو فشاں سرخی درخشاں اضطراب

رات کی امید، ظلمت کی دعائے مستجاب

لیکن جہاں کہیں وہ کہنے کی بات کہا چاہتے ہیں وہاں ان کی زبان کا رنگ کچھ اور ہوتا ہے۔ مثلاً

مرنے پہ تو بہ حال ملے یا نہ ملے
یہ کنج یہ بوستاں ملے یا نہ ملے
پینے میں تو کسر نہ چھوڑ اے جام خراب
معلوم نہیں وہاں ملے یا نہ ملے

کیا شیخ ملے گا لن ترانی کر کے
تفسیر مآل بدمآلی کر کے
تو آتش دوزخ سے ڈراتا ہے انہیں
جو آگ کو پی جاتے ہیں پانی کر کے

دل ہوتا ہے رو براہ گاہے گاہے
رو لیتے ہیں بھر کے آہ گاہے گاہے
اس ڈر سے خودی خدا نہ بن جائے کہیں
کر لیتے ہیں ہم گناہ گاہے گاہے

گردوں سے بلند ہے نشیمن اپنا
فردوس پہ خندہ زن ہے گلشن اپنا
تو کوثر و تسنیم کا چھوڑیگا نہ فکر
اچھا تو نچوڑ دوں میں دامن اپنا

حضرت جوش کے کلام منظوم کے متعدد مجموعے شائع ہو کر قبول خاص و عام کی سند حاصل کر چکے ہیں۔ ان مجموعوں میں خاص خاص یہ ہیں
"شعلہ و شبنم"، "فکر و نشاط"، "آیات و نغمات"، "نقش و نگار"، "سیف و سبو"، "عرش و فرش"۔ اب نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

جشن نو

پھر طرز نو سے زینت صحن چمن ہے آج — گلشن میں کج کلاہ گل و یاسمن ہے آج
پھر جام زر میں جمع ہے صہبا و نور ماہ — پھر اتصال جلوۂ گنگ و جمن ہے آج
پھر اہل دل کی عقدہ کشائی کے شوق میں — سرگرم ناز زلف شکن در شکن ہے آج
تمہید شرح صدر ہے پھر مشتعل مے کسی — پھر برق طور موج شراب کہن ہے آج
پھر عکس نے لٹایا ہے قلب و نگار پر — پھر ابر تیرہ صدر نشین چمن ہے آج
پھر بوستاں میں طرۂ طرف کلاہ دوست — وجہ فروغ افسر سرو و سمن ہے آج
پھر خدمت نیاز پہ مائل ہے روح ناز — پھر زانوئے صنم پہ سر برہمن ہے آج
لرزاں تھی جس کے مژدۂ فردا سے زندگی — پہلو میں پھر وہ شاہد پیماں شکن ہے آج

رحم نگاہ بد سے بچائے اسے خدا
دیکھو تو کوئی جوش پہ کیا بانکپن ہے آج

پروگرام

اے شخص اگر جوش کو تو ڈھونڈنا چاہے — وہ پچھلے پہر حلقۂ عرفاں میں ملے گا
اور صبح کو وہ ناظر نظارۂ قدرت — طرف چمن و صحن بیاباں میں ملے گا
اور دن کو وہ سرگشتۂ اسرار و معانی — شہر ہنر و کوئے ادیباں میں ملے گا

اور شام کو وہ مردِ خدا، رندِ خرابات — رحمت کدۂ بادہ فروشاں میں ملے گا
اور رات کو وہ جلوۂ کاکل و رخسار — بزمِ طرب و کوچۂ خوباں میں ملے گا
اور ہوگا کوئی جبر تو وہ بندۂ مجبور
مردے کی طرح کلبۂ احزاں میں ملیگا!

نگارِ رفتہ

نگارِ رفتہ کو یارب وطن میں پہنچا دے — دوبارہ درِّ عدن کو عدن میں پہنچا دے
حرم کی شمع کو طاقِ حرم میں روشن کر — چمن کی جان کو صحنِ چمن میں پہنچا دے
وطن کی روح کو جسمِ وطن میں روشن کر — غزالِ دشتِ وطن کو ختن میں پہنچا دے
سمن سے پھر سمنستان کو بنا داماں فرما — گہر کو پھر صدفِ پُر محن میں پہنچا دے
صبا کو گلکدۂ آرزو میں رقصاں کر — صنم کو بتکدۂ برہمن میں پہنچا دے
وہ ایسے حسن سے محفل ہیں اپنے عشق سے بام — اس انجمن کو پھر اس انجمن میں پہنچا دے
سکوتِ جوش کو دے رخصتِ ترانہ سنگر
سخن کو حلقۂ شاہِ سخن میں پہنچا دے

تبصرہ

زبان

واضح ہو کہ دورِ جدید دَورِ نجم کا ہمعصر ہے ایک طرف دورِ نجم کی غزل سرائی ہو رہی تھی۔ دوسری طرف دورِ جدید کی نیچرل شاعری کے نغمے بلند ہو رہے تھے۔ علاوہ ازیں دورِ جدید کے نمائندے آزاد اور حالی خود بلند پایہ غزل گو اور اساتذہ کی آنکھیں دیکھے ہوئے تھے۔ اگر ان نمائندوں

کی غزل سے سروکار رکھا جائے اور انہیں تاریخ ادب میں جگہ دی جائے تو یہ
دورِ پنجم کی بزم ہی کے مستحق ثابت ہونگے۔ اس لئے زبان کی اصلاح کے لحاظ
سے دورِ جدید کو دورِ پنجم سے کسی طرح علیحدہ کرکے نہیں دکھایا جا سکتا۔ اور نہ لسانی
اصلاح کے متعلق کوئی رائے پیش کی جا سکتی ہے جو اصلاحیں دورِ پنجم میں ہوئیں
ان ہی اصلاحوں سے دورِ جدید میں کام لیا گیا۔ ہاں اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ
دورِ جدید کے شعراء نے جدید رنگ کی شاعری سے زبان میں نوبہ نو مضامین ادا
کرنے کی صلاحیت پیدا کردی اور آئندہ شعراء کے لئے روشوں کو خار دار انجاز
سے پاک و صاف کر دیا۔ نئی پود ان ہی راستوں پر چل کر کارہائے
نمایاں دکھائے گی۔

جو زبان جدید شاعری کے لئے استعمال میں آئی اس میں اور قدیم غزل
کی زبان میں ایک خاص فرق محسوس ہوتا ہے وہ یہ کہ حالی اور اکبر الہ آبادی
نے خاص خاص انگریزی الفاظ بے تکلفی سے نظم میں استعمال کئے۔ ہندی
الفاظ بھی کافی تعداد میں استعمال ہوئے۔

اصنافِ سخن

غزل دورِ جدید کے لئے تقویمِ پارینہ ہے۔ غزل کو چھوڑ کر
باقی تمام اصنافِ سخن اس دور میں خوب پھلی پھولیں
جن میں سے مسدس، مثنوی اور رباعی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اردو
کی مایۂ ناز نظم "مد و جزر اسلام" مسدس میں لکھی گئی۔ "شکوہ" "جواب شکوہ"
مسدس میں لکھا گیا۔ چکبست کی تمام قابلِ قدر نظمیں مسدس میں
ہیں، حالی اور آزاد کی تمام قومی اور نیچرل نظمیں مثنوی میں

ہیں۔ اقبال کی بہت سی چھوٹی چھوٹی نظمیں مثنوی ہی ہیں ہیں۔ اکبر الہ آبادی نے زیادہ تر رباعی اور قطعہ اور متفرق اشعار لکھے ہیں۔

موضوع سخن موضوع سخن کے لحاظ سے دور جدید بڑا گراں قدر سرمایہ اپنے پہلو میں لئے بیٹھا ہے۔ فلسفہ، اخلاق، نیچر، معاشرت صفات انسانی، تاریخی روایات، حب وطن حب قوم مذہب معاشرت سیاست، محبت، اتحاد، بے تعصبی، رواداری، قدیم تہذیب کی حمایت، مغرب کی کورانہ تقلید کی بیخ کنی، جوش عمل وغیرہ سینکڑوں عنوانات پر عجب عجب انداز سے خیالات وجذبات کا اظہار کیا گیا ہے۔ اور اس دور میں مسلسل اور مستقل نظموں کا بڑا زبردست ذخیرہ جمع ہو گیا ہے۔ تخلیقی شاعری کے علاوہ اس دور میں انگریزی اور دیگر زبانوں سے منظوم تراجم بھی ہوئے۔ جو ہر طرح قابل قدر اور مفید ہیں۔

اسالیب بیان اسالیب کے لحاظ سے بھی یہ دور گذشتہ تمام ادوار پر سبقت لے گیا ہے۔ جوش، صداقت، اصلیت بے تکلفی، ترنم، اور ہمواری تمام شعراء کی مشترک خصوصیات ہیں۔ ان کے علاوہ اکبر کی ظرافت ملیح اور طنز لطیف، اقبال کا فلسفیانہ انداز بیان، حکمت کی صاف سلیس اور ترنم ریز طرز ادا، آزاد کی سادہ رنگینی۔ حالی کی واعظانہ اور مصلحانہ سادگی و روانی۔ غرض گوناگون اسالیب بیان آپ کو اس دور میں دکھائی دیں گے قدم قدم پر تنوع نظر آئے گا۔ اور ہر جگہ گلہائے رنگا رنگ جنت نگاہ بنے ہوں گے۔

خامی اس دور میں کہیں کہیں خامیاں بھی نظر آئیں گی۔ سطور بالا میں عرض کیا جا چکا ہے۔ کہ اس دور میں موضوع سخن کی فراوانی ہے۔ یہ موضوع اردو اور شعرائے اردو دونوں کے لئے بالکل نئے تھے۔ ابتدائی دور تھا۔ ابتدائی کوششیں تھیں۔ اس لئے کہیں کہیں انداز بیان میں خشکی اور بے رنگی آگئی ہے۔ اور محاسن شاعری نمایاں نہیں ہوسکے ہیں۔ زبان و محاورہ کی بھی کہیں کہیں لغزشیں نظر آئیں گی۔ لیکن یہ خامیاں ایسی نہیں ہیں کہ اس دور کی جملہ خوبیوں کے مقابلے میں انہیں کچھ بھی اہمیت دی جائے۔

نتیجہ پرستاران طرز قدیم اس دور کی شاعری کو خواہ کسی نظر سے دیکھیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان لوگوں کے لئے جو قدیم رنگ شاعری سے مطمئن نہیں تھے۔ اس شاعری نے سرمایہ نشاط پیدا کر دیا ہے۔ اب وہ اطمینان کا سانس لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ الحمدللہ اب ہماری شاعری اس قابل ہو چلی ہے کہ ہم اس کو دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کی شاعری کی محفل میں بطور نمایندہ پیش کر سکتے ہیں۔ اور وہ لوگ اس خیال میں حق بجانب بھی ہیں

باب ۱۱

دورِ حاضرہ کے شعرائے غزلگو

(گذشتہ تمام ادوار کی طرح دورِ حاضرہ میں بھی خوش گو شعرا کی کمی نہیں لکھنؤ، دہلی اور ہندوستان و پاکستان کے گوشے گوشے میں اچھا خاصا کہنے والے شعرا موجود ہیں لیکن اگر تمام خوشگو شعرا کا تذکرہ یہاں کیا جائے تو یہ کتاب ادبی تاریخ کی حیثیت سے گر کر محض تذکرہ بنجائے۔ اس لئے خاکسار راقم الحروف تمام شعرا اور ان کے معتقدین سے معافی کا خواستگار ہے۔ ناچیز صرف ان ہی شعرا کا تذکرہ اس دور میں کریگا جنھیں دنیائے ادب اردو صاحب طرز مانتی ہے۔ اور جو خاکسار کے نزدیک صاحب طرز ہی نہیں بلکہ اپنی استادی یا اپنے کلام کے اثر سے ملک میں مقلدین کی ایک جماعت پیدا کر رہے ہیں)

صفی لکھنوی علی نقی نام صفی تخلص خلف رشید مولٰنا سید فضل حسین ۳ جنوری ۱۸۶۲ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ دس بارہ سال کے سن تک فارسی و عربی کی تکمیل کرتے رہے۔ اس کے بعد نارمل اسکول میں انگریزی شروع کی۔ دو سال بعد کینگ کالجیٹ اسکول میں داخل ہو کر

انٹرنس تک باقاعدہ تعلیم حاصل کی ۱۸۸۳ء میں محکمۂ دیوانی میں آپ کا تقرر ہوا۔ مختلف مقامات اور مختلف عہدوں پر رہ کر ۱۹۲۳ء میں چہل سالہ خدمات کے لئے پنشن پائی ہے اور اب گوشہ نشینی اختیار کرکے اردو ادب کی خدمت میں زندگی بسر کر رہے ہیں

حضرت صفی کی زمانہ لکھنؤ میں مسلم الثبوت استاد مانے جاتے ہیں بیسیوں موزوں طبع آپ کے دامن تربیت میں پرورش پاکر شاعر اور استاد ہو گئے۔ آپ کا کلام ابھی شائع نہیں ہوا۔ ابتدائی کلام کہیں نظر سے نہیں گزرا۔ البتہ آپ کی نظمیں اور غزلیں مختلف رسائل میں شائع ہوتی رہتی ہیں مشاعروں میں بھی آپ اپنا کلام سناتے ہیں خاکسار نے الہ آباد کے مشاعروں میں اکثر آپ کا کلام سنا ہے۔ ان ہی مطبوعہ اور مشاعروں میں سنی ہوئی نظموں اور غزلوں سے جو خاکسار نے آپ کے کلام کے متعلق رائے قائم کی ہے۔ وہ سطور ذیل میں پیش کرتا ہے

کہا جاتا ہے کہ حضرت صفی نے لکھنؤ اسکول کی شاعری کے دامن کو بدنامی کے دھبے سے پاک کیا۔ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ جس قدر کلام آپ کا منظر عام پر آچکا ہے اس میں نہ مبالغہ کا عیب ہے۔ نہ رعایت لفظی کی بھرمار۔ ضلع جگت اور ابتذال جو لکھنؤ اسکول کی شاعری کی خصوصیت ہوگئی تھی اس کا شائبہ بھی آپ کے کلام میں نہیں لیکن مکمل کلام پر مجموعی رائے قائم کرنے کے لئے ابھی آپ کے کلام کی اشاعت تک انتظار کرنا پڑے گا۔

مدت ہوئی حضرت صفی دارالبقا کو سدھار گئے تاریخ رحلت معلوم نہ ہو سکی۔

سادگی آپ کی غزلیات کا خاص جوہر ہے۔ زبان اور طرز بیان دونوں
میں سادگی اور دلکشی ہے۔ عاشقانہ مضامین کو نہایت مؤثر طریقے پر نظم
کرتے ہیں۔ محاورات، روزمرہ اور تشبیہات کا لطف بھی ہر جگہ برقرار رہتا ہے
فلسفہ زندگی اور موجودہ عہد کے اہم مسائل پر بھی آپ نہایت خوبی سے روشنی
ڈالتے ہیں اور لطف یہ کہ تغزل کا سررشتہ ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ کلام کی
پختگی آپ کی کہنہ مشقی اور استادی کو مسلم کرتی ہے۔

نظمیں زیادہ تر شیعہ کانفرنس کے سالانہ جلسوں کے سلسلے میں لکھی گئی
ہیں۔ بعض نظمیں عام دلچسپی کی بھی ہیں۔ آپ کی نظموں کا عام جوہر پرجوش
سادگی ہے۔ دوسرا جوہر دلکشی ہے۔ آپ نے دو چار نظمیں مختلف مقامات کے
تاریخی اور جغرافیائی حالات پر بھی لکھی ہیں۔ جو باوجود اپنے خشک موضوع کے
دلکش اور پر لطف ہیں۔ ان نظموں میں الفاظ کے ذریعے سے جو تصویریں تیار
کی گئی ہیں وہ ہر لحاظ سے داد کے قابل ہیں

ایک غزل بطور نمونہ ملاحظہ ہو۔

سبزۂ گلشن دیکھئے، سبزۂ بیاباں دیکھئے	دل ہو قابو میں تو سب کچھ دیکھئے ہاں دیکھئے
اپنی اپنی گا رہے ہیں دونوں شیخ و برہمن	طے بھی ہوتی ہے یہ بحث کفر و ایماں دیکھئے
حق شناسی نام اسی کا ہے کہ دل بھر آئے جب	دیر کو برباد یا مسجد کو ویراں دیکھئے
نقص بینائی سمجھئے فرق گر آئے نظر	ایک ہی صورت کے ہیں گبر و مسلماں دیکھئے
دیر اسی کو جانئے کعبہ اسی کو مانئے	پوجئے وہ دل جسے ہمدرد انساں دیکھئے
دل کے اندر آئیے کیجئے حریم جاں کی سیر	زلزلوں نے جس کو ڈھایا ہے وہ ایواں دیکھئے

ناکجا سرمستی نظارہ باغ و بہار | چشم عبرت سے ذرا گور غریباں دیکھئے!
مہر برلب دیکھئے محفل کی محفل زیر خاک | بیکسی کو ان خزانوں کا نگہباں دیکھئے
حال اپنا اب یہ ہے بیداری احساس سے | سونے سوتے جس طرح خواب پریشاں دیکھئے
ذرے ذرے کو زمیں حل کے ہے کر اضطراب | کب خدا جانے ٹھہرتا ہے یہ طوفاں دیکھئے

الغرض بات جہاں کی فکر ہی کیا ہے صفیؔ!
جو دکھلائے گردش گردوں گرداں دیکھئے

ظریف لکھنوی سید مقبول حسین نام ظریف تخلص جناب صفیؔ لکھنوی کے چھوٹے بھائی اور فخر لکھنؤ ہیں عمر ایسی ہی کوئی پچاس پچپن کے قریب[1] ہوگی آپ کی شاعری کا رنگ آپ کے تخلص سے ظاہر ہے۔

شاعری کا شوق ابتدا سے تھا۔ لیکن طبیعت کی شوخی اور چلبلے پن نے ظرافت کی طرف مائل کیا۔ ابتداً محض ہنسی ٹھٹھول سے سروکار تھا دو چار شعر اس رنگ کے ملاحظہ ہوں:۔

یہ چلم دکھا کے بولے میاں مجنوں ساربان سے
بھئی ایک کش لگا لو چلے آتے ہو کہاں سے

دیکھنا ہو آپ کو گر حسن یورپ کی بہار
چاہے شلجم دیکھئے چاہے چقندر دیکھئے

ان سے کہئے آپ جو بوسے کے طالب ہیں حضور

---

[1] کئی سال ہوئے انتقال ہو چکا ہے۔ تاریخ وفات معلوم نہ ہو سکی۔

مصحف رخ چاٹ جائیں گے یہ جھینگر دیکھئے

نہ ہے یا مادہ عجب ترکیب ہے اس نام کی — کچھ حقیقت ہی نہیں کھلتی ہے سیتارام کی

بعض اوقات انسانی خامیوں کو کسی خاص انداز سے منظر عام پر لانا ہنسنے ہنسانے کا ذریعہ بنجاتا ہے جن لوگوں پر کھلا حملہ کیا جاتا ہے ان کے دل پر خواہ کچھ بھی گذرے شاعر کو اس سے سروکار نہیں ہوتا۔ اگر وہ لوگ کھسیانی ہنسی ہنس کر خودبخود اپنی خامیوں کی اصلاح کرلیں تو شاعر کی توقعات سے زیادہ اس کی ظرافت کا نتیجہ نکل آیا۔ اب اگر آپ چاہیں تو شاعر کو ادبی، مذہبی، سوشل یا سیاسی مصلح کہہ لیجئے۔ آپ کو اختیار ہے شاعر کے مدنظر تو محض ہنسنا ہنسانا تھا۔ ظریف صاحب کی شاعری کا دوسرا دور یہ ہے جو سطور بالا میں عرض ہوا۔ اس رنگ کے بھی دو چار شعر ملاحظہ ہوں:

لیڈری سستی ہوئی سرچیر مہنگی ہوگئی — ایک ہی آنہ میں مل جاتا ہے لیڈر[1] دیکھئے

ڈاڑھی مونچھیں صاف ہیں مثل قلندر دیکھئے — مادہ بد ہیں مغربی تہذیب کے نر دیکھئے

دہن غائب کمر معدوم اس پر حسن کا دعوے — حسیں ایسا اگر ہو تو عجائب گھر کے قابل ہے

ظریف صاحب کی غزلوں کا عام رنگ یہی ہے لیکن اب انہوں نے طولانی نظمیں مسدس وغیرہ کی شکل میں لکھنی شروع کردی ہیں جو حقیقت میں بلند پایہ اور قابل قدر ادبی کوششیں ہیں۔ آپ کی طولانی نظموں میں سفرنامہ عراق

[1] لیڈر انگریزی اخبار جو الہ آباد سے نکلتا ہے۔

گول میز کانفرنس، میونسپل الیکشن، شہر آشوب وغیرہ نہایت کامیاب اور مفید ہیں۔

ظریف صاحب کے موجودہ کلام کو دیکھ کر آپ کے سچے مصلح ہونے میں شک نہیں رہتا۔ آپ کی طولانی نظموں میں خندہ دنداں نما کم ہے۔ تبسم زیر لب ضرور ہے لیکن سامعین کے چہروں پر غور و فکر کے آثار پیدا کر دیتا ہے۔ آپ ادبی، اخلاقی مذہبی، سوشل، سیاسی خامیوں کو اس انداز سے بیان کرتے ہیں کہ دلوں میں تاثیر کے نشتر اتر جاتے ہیں۔

آپ کی طبیعت ہمہ گیر ہے۔ مطالعہ فطرت قدم قدم پر نمایاں ہے۔ آپ کا موضوع سخن زیادہ تر انسان ہے شہری دیہاتی، پردیسی غرض جس شخص کو لیتے ہیں اس کی تصویر نگاہوں کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ آپ کو سیرت نگاری میں کمال حاصل ہے۔ اردو زبان پر جو قدرت حاصل ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ اردو کے علاوہ پوربی زبان کو نہایت پر لطف طریقے سے نظم کرتے ہیں۔ ان کے دیہاتی اشخاص جب اپنی پوربی زبان میں ہلکی ہلکی اور جہالت کی باتیں کرتے ہیں تو محفل ادب میں ایک عجیب کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

زبان میں لطف محاورہ۔ روز مرہ کی صفائی اور بندش کی چستی ہر جگہ جلوہ فرما ہے۔ ابتذال اور عامیانہ پن سے التزاماً گریز کرتے ہیں۔ لیکن دیہاتی اشخاص کی زبان سے سبک اور سوقیانہ الفاظ کو روا رکھتے ہیں۔ اس سے بجائے عیب کے کلام میں اصلیت اور حسن پیدا ہو جاتا ہے۔

عزیز لکھنوی | مرزا محمد ہادی نام عزیزؔ تخلص لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ بزرگوں کا وطن شیراز تھا۔ شیراز سے کشمیر اور شاہان اودھ کے دورِ حکومت میں کشمیر سے لکھنؤ گئے۔ مرزا صاحب ۱۸۸۲ء میں پیدا ہوئے سات برس کی عمر تھی کہ سایۂ پدری سے محروم ہوگئے۔

ابتدائی تعلیم نہایت ذوق وشوق سے حاصل کی اس کے بعد اساتذہ کا کلام ہمیشہ نظر سے گزرتا رہا جس سے آپ کا علم وفضل رفتہ رفتہ ترقی کرتا رہا۔ آخر دم تک تعلیم وتعلم کا سلسلہ جاری رہا۔ آخر ۱۹۳۵ء میں انتقال فرمایا۔

شاعری کا شوق ابتدا سے تھا حضرت صفیؔ سے استفادہ سخن کیا اور طبعی رجحان اور کثرت مشق سے بہت جلد مرتبہ استادی حاصل کرلیا۔ آپ کی استادی مسلّم ہے۔ مرزا جعفر علی خاں اثرؔ لکھنوی اور شبیر حسن خاں جوشؔ ملیح آبادی جیسے خوش گو شعرا نے آپ کے دامنِ تربیت میں پرورش پائی ہے۔

آپ کا مجموعہ غزلیات "گلکدہ" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ غزلیات کے علاوہ آپ کے قصائد بھی شائع ہوئے ہیں۔ دونوں صنفوں پر آپ کو قدرت کامل حاصل ہے۔

گلکدہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے لکھنؤ اسکول کی شاعری کی خصوصیات سے گریز کیا ہے۔ آپ کا کلام عام طور پر فرسودہ اور سوقیانہ مضامین سے پاک ہے۔ لوازمِ حسن کی تعریف وتوصیف بھی کہیں نہیں ملتی۔

آپ متقدمین میں میرؔ اور متوسطین میں غالبؔ کے دلدادہ ہیں اور ان ہی

کی تقلید کرتے ہیں۔ غالب سے آپ نے متانت لی اور انداز بیان میں بھی ان ہی سے استفادہ کیا۔ میر سے سوز و گداز لیا۔ لیکن مرثیہ کی ہر دلعزیزی سے متاثر ہو کر سوز و گداز کو آہ و بکا میں تبدیل کر دیا۔ آپ کے کلام میں مرض، نزع، موت، نوحہ، ماتم، گورِ غریباں وغیرہ کے مضامین اس کثرت سے ہیں کہ تمام کلام پر گویا مرثیت چھائی ہوئی ہے۔

زبان خاص لکھنؤ کی ٹکسالی زبان ہے۔ صفائی اور سلاست کی انتہا نہیں لیکن غالب کی تقلید میں فارسی تراکیب کا استعمال زیادہ کرتے ہیں جن میں دو چار مقامات کو چھوڑ کر عام طور پر صفائی اور چستی پائی جاتی ہے۔ چند غزلیات و متفرق اشعار بطور نمونہ ملاحظہ ہوں۔

وہ شوقِ قتل و ولولہ وہ دل نہیں رہا ! اب ان کے امتحان کے قابل نہیں رہا
پردے دوئی کے دیدۂ عالم سے اٹھ گئے جز جلوہ ہائے رخ کوئی حائل نہیں رہا
بو شوخیٔ نگاہ سر بزم تا بہ کے ! باقی کسی کے سینہ میں اب دل نہیں رہا
ہے ناشکیبیٔ دل مضطر کا کیا علاج ! مانا وہ میرے حال سے غافل نہیں رہا
کب پوچھنے ہیں آ کے مزاج مریض عشق جب بد نصیب بات کے قابل نہیں رہا
کوسوں دیارِ عشق میں آبادیاں نہیں یا دشت بحر جیسے مرا دل نہیں رہا

کیا فائدہ ہے عرض ہنر سے عزیزؔ اب
جب امتیاز ناقص و کامل نہیں رہا

شمع بجھ کر رہ گئی پروانہ جل کر رہ گیا یادگارِ حسن و عشق اک داغ دل پر رہ گیا
اس طرح بجھ تو دم آخر تڑپ کر رہ گیا ایک افسانہ ترا اے قلبِ مضطر رہ گیا

ضعف میں کرتا بیاں کس طرح آخر دردِ دل
آپ کا بیمار اک کروٹ بدل کر رہ گیا

مرتے مرتے بھی نہ ہی ہم چھٹنے ہی غم کی خلش
جو کھٹکتا تھا وہ کانٹا دل کے اندر رہ گیا

شوق نے کہہ کہہ کے پہنچایا آخر قبر تک
دو قدم بس اور آگے کوئے دلبر رہ گیا

ہم تو دل پہ ہی سمجھتے تھے بتوں کا اختیار
لعد ب کعبہ میں بھی اب تک ایک پتھر رہ گیا

دل کی بے چینی کوئی دیکھے ذرا اس بزم میں
جب کوئی آیا تو میں پہلو بدل کر رہ گیا

نور سے کر دیدۂ یعقوب سے نکلا جو اشک
شب کو زنداں پہ ستارہ اک چمک کر رہ گیا

ان کے فریادی جو پہنچے داد خواہی کیلئے
صور کیسا دم بخود محشر کا محشر رہ گیا

چارہ سازوں سے دمِ آخر بتا ایسا رغم
دل کی جانب کچھ اشارے سے بتا کر رہ گیا

قطرہ قطرہ اشک کا ہے مخبرِ سوزِ دل
ہم کو اب سونا اسی کا زندگی بھر رہ گیا

جا چکے احباب رو کر اٹھ چکی ماتم کی صف
آپ کب آئے کہ جب خالی مرا گھر رہ گیا

دیکھ لی دنیا چلو شہرِ خموشاں اب عزیز
قابل دید اک یہی دلچسپ منظر رہ گیا

اپنی ہی ذات میں خود اس کا نظارا ہوتا
ہجر میں ہم نے اگر نفس کو مارا ہوتا

دیکھتا غیر کو کیوں دیدۂ کوتاہ نظر
اپنی ہستی کا میسر جو نظارا ہوتا

کون ہے تیرے سوا روحِ رواں ہستی
تو نہ ہوتا تو بھلا کون ہمارا ہوتا

تو نے اس لطف سے دیکھا تھا ازل میں اسکو
مر بھی جاتے تو کبھی دل نہ ہمارا ہوتا

دل ہی ہوتا نہ اگر پایہ شناس کونین
کوئی ہوتا نہ ہمارا نہ تمہارا ہوتا

غیر ممکن تھا کہ آتی نہ صدائے لبیک
مرنے والوں کو اگر تم نے پکارا ہوتا

شمعیں افسردہ جہاں پھول ہیں پژمردہ جہاں
دل کو اس گورِ غریباں میں پکارا ہوتا

آپ دم بھر کو اگر آ کے چلے بھی جاتے　　ایک بیمار کو مرنے کا سہارا ہوتا

جلوہ اس شوخ کا دنیا کی نظر میں ہے عزیز
ایسے حالت میں بھلا کون ہمارا ہوتا

یہ عالم ہے کہ اب سب چارہ گر ناچار بیٹھے ہیں
وہ خود بھی دیکھنے حال رخ بیمار بیٹھے ہیں

ہجوم عام ہے بالیں پہ سب غمخوار بیٹھے ہیں
وہ خود جب سے قریب بستر بیمار بیٹھے ہیں

پرستار صنم مایوسیاں کس سے کہیں اپنی
خدا سے بھی معاذ اللہ اب بیزار بیٹھے ہیں

دم آخر مریض غم میں یہ کیسا تغیر ہے
مداوا کرنے والے جان سے بیزار بیٹھے ہیں

کہے کون ان سے زائل ہو رہا ہے نور آنکھوں کا
وہ سر کھولے قریب بستر بیمار بیٹھے ہیں

شریک اس سانحہ میں تھیں فلک کی گردشیں بھی کچھ
پشیماں ہو کے اب وہ قبر پہ بیکار بیٹھے ہیں

چھڑا ہے حلت صہبا کا مبحث بادہ نوشوں میں
جناب شیخ آپ اس بزم میں بیکار بیٹھے ہیں

خیال ان کا ہے آشفتہ سری ان کی جنوں ان کا
جو دیوانے قریب دامن کہسار بیٹھے ہیں

یہ کیا حالت ہے میری کون سا وقت آپڑا مجھ پر
الٰہی دور کیوں مجھ سے مرے غمخوار بیٹھے ہیں

یہ کہہ کر ہاتھ اٹھایا جانب بند نقاب اس نے
ابھی کچھ مدعیٔ حسرت دیدار بیٹھے ہیں!

یہ کیسا ہو چلا ہے رنگ یارب میرے چہرے کا
یہ کیوں پچھلے پہر سے سب کے سب ہشیار بیٹھے ہیں

وہی اس بزم میں جو ہیں شناس بزم ساقی ہیں
لئے جو درد کش پیمانہ سرشار بیٹھے ہیں

ہر اک ہچکی میں کیونکر کھل رہے ہیں موت کے عقدے
فقط وہ دیکھنے یہ حالت بیمار بیٹھے ہیں

عزیزؔ اس رہگذار عشق میں اک یوسفستاں ہے
ہزاروں دل لئے ہم سے سر بازار بیٹھے ہیں

ہجوم بےکسی سے کوئی سرگرم فغاں کیوں ہو
مذاق ضبط کامل ہو تو کہنے کو زباں کیوں ہو!

ہلاک رشک ہوں میں دل کی غمخواری سے باز آیا
تمہارا رازداں جو ہے وہ میرا رازداں کیوں ہو

جفا و امتحاں کا عشق میں جب ایک حاصل ہے
ستم ہی کیوں نہ ہو بدنام نام امتحاں کیوں ہو

یہاں شوریدگی کو دھن کہ ہم سر کو دہیں چھوڑیں

وہاں یہ ضد کہ یہ سر اور میرا آستاں کیوں ہو

نہ پوچھو دم کے رکنے کا سبب تم نزع میں مجھ سے
گیا ہو زندگی بھر ضبط جس نے رائیگاں کیوں ہو

ملے ہیں جبکہ دونوں دل تو آخر شرم سے حاصل
تکلف برطرف ہے جب تو پردہ درمیاں کیوں ہو

جفا جو بھی تمہاری فتنہ پردازی سے ڈرتے ہیں
نہ ہو خوف ستم تو دور دور آسماں کیوں ہو

زمانے کے حوادث خود مری فطرت میں داخل ہیں
مصیبت دل کی کیا کم ہے بلائے آسماں کیوں ہو

چلو جھگڑا مٹا ہم زندگی سے یوں بھی عاجز تھے
یہ بیجا مہربانی کیا تم اتنے مہرباں کیوں ہو

زمانہ کی شکایت ہم کو کرنا نامناسب ہے
کہ جب نامہرباں وہ ہے تو عالم مہرباں کیوں ہو

دم آخر مریض غم کی بالیں تک چلے آؤ!
کسی کی عمر بھر کی جانفشانی رائیگاں کیوں ہو

نہیں کم سوگواری کے لئے خود حسرتیں اس کی
دل مردہ پہ میرے آکے کوئی نوحہ خواں کیوں ہو

مریض غم کو اپنے ہاتھ سے تم زہر ہی دے دو
اک اس کے دم سے عاجز اس قدر سارا جہاں کیوں ہو

عزیز اب تک ہوا ظاہر نہ یہ راز اہل دنیا پر !
وہی چاروں طرف جب جلوہ گر ہو پھر نہاں کیوں ہو

اب بلگوں ہے چہرہ مگر پہلے زرد تھا — انجام درد یہ ہے وہ آغاز درد تھا
اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز تھا حسن — بھولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا
دیکھ کر ہر در و دیوار کو حیراں ہونا — وہ مرا پہلے پہل داخل زنداں ہونا
وصال دائمی کیا ہے شب فرقت میں جانا — فنا کیا ہے دلی جذبات کا حد سے گزر جانا

مریض ہجر کی انسوں کو قدر کیا ہو گی !
اٹھے میں مسند سے جب سر پہ آفتاب آیا

اصغر گونڈوی

اصغر حسین نام۔ اصغر تخلص ہے۔ اصلی وطن گورکھپور کے ضلع میں ہے۔ لیکن ایک مدت تک گونڈہ میں مقیم رہے ہیں اس لئے گونڈوی مشہور ہیں۔ آپ یکم مارچ ۱۸۸۴ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم و تربیت معمولی اور غیر مستقل طور پر ہوئی۔ کچھ دنوں انگریزی مدرسوں میں بھی تعلیم پائی۔ تاہم اس تھوڑی سی مدت میں فطری صلاحیت کی وجہ سے اتنی استعداد پیدا ہو گئی کہ انگریزی کی ادبی کتابوں کا کافی لطف اٹھا سکتے تھے۔ اور اب تو یہ حال ہے کہ "ہندوستانی" کی اڈیٹری کے سلسلے میں اگر کبھی کسی انگریزی کتاب یا مضمون کے ترجمے کا اتفاق ہوتا ہے تو اس بے تکلفی سے بے تکان ترجمہ کرتے چلے جاتے ہیں کہ اچھے اچھے ڈگری یافتہ منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ یہی حال عربی اور فارسی کا ہے خصوصاً فارسی پر آپ کو بڑا عبور

حاصل ہے۔ کبھی کبھی فارسی میں بھی سخن سنجی کرتے ہیں۔

شاعری کا شوق ابتدا سے تھا۔ زمانہ نومشقی کے چار اشعار "ہمارا جادو" میں نظر سے گزرے جن سے شاندار مستقبل کا پتہ چلتا ہے۔ وہ مستقبل اب حال ہے جس کا تذکرہ آئندہ آتا ہے۔ آپ نے مستقل طور پر کسی سے استفادہ نہیں کیا۔ ابتدا میں کچھ دنوں منشی خلیل احمد محمد بلگرامی کو اپنا کلام دکھایا۔ آخر میں کچھ غزلیں منشی امیر اللہ تسلیم کو دکھائیں۔ اس کے بعد سلسلہ بند ہو گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ حقیقی شاعر کے لئے اس کے ذوق صحیح اور وجدان سلیم سے بڑھ کر کوئی استاد ہو ہی نہیں سکتا۔

حضرت اصغر پہلے گونڈے میں مقیم تھے۔ وہیں آپ کا ایک چشمہ کا کارخانہ تھا۔ اس کے بعد آپ لاہور تشریف لے گئے اور وہاں ادبی خدمات انجام دیتے رہے۔ کچھ دنوں انڈین پریس الہ آباد سے بھی تعلق رہا۔ فی الحال "ہندوستانی اکاڈمی" کے ماہی رسالہ "ہندوستانی" کے ایڈیٹر ہیں۔ اور الہ آباد میں مستقل قیام ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کے انفاس میں برکت دے[1]۔

خاکسار کو حضرت اصغر سے نیاز حاصل ہے۔ آپ کی صحبت میں اٹھنے بیٹھنے کا اکثر اتفاق ہوا ہے۔ ناچیز پر از بس بزرگانہ مشفقانہ عنایت فرماتے ہیں۔ آپ کے وسیع اخلاق کے متعلق صرف اس قدر عرض کر سکتا ہوں کہ حضرت اصغر پکے مسلمان ہیں لیکن زاہد خشک نہیں۔ مزاج میں رنگینی لئے ہوئے یا ظرافت

---

[1] حضرت اصغر نے مرض فالج بتاریخ ۳۰ نومبر ۱۹۳۶ء داعی اجل کو لبیک کہا۔ آپ کی قبل از وقت رحلت سے دنیائے اردو کو ناقابل تلافی صدمہ ہوا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

طبیعت میں مروّت کہیے یا لطافت یا ان سب اوصاف کا مجموعہ غرض دوست تو دوست اجنبی بھی آپ کی پر مغز اور مسلسل گفتگو سے نہیں اکتاتا۔ آپ بادۂ تصوف کے بھی ذوق شناس ہیں حضرت قاضی شاہ عبدالغنی صاحب منگلوری سے شرف بیعت حاصل ہے۔

آپ کے کلام کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ایک "نشاط روح" ۱۹۲۵ء میں اور دوسرا "سرود زندگی" ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا۔ دونوں مجموعے اگرچہ مختصر ہیں لیکن اس اختصار میں بلند ترین شاعری کے اعلیٰ نمونے موجود ہیں حضرت اصغر بہت کم گو شاعر ہیں۔ اور اسی کم گوئی میں ان کی شاعری کا راز مضمر ہے۔ فرمایا کرتے ہیں کہ پرگوئی کے معنی میری لغت میں ہیں "رطب و یابس سے کلام کو بھر دینا دو چار شعر اس رنگ کے کہنا دو چار اس رنگ کے کہنا۔ کچھ ادھر کے کچھ ادھر کے غرض چشم زدن میں لمبی چوڑی غزل تو تیار کر دینا لیکن خود اپنا رنگ کچھ نہ ہونا" اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اصغر صاحب نہائت کاوش سے شعر کہتے ہیں اور وہی کہتے ہیں جو کہنا چاہتے ہیں۔ اور یہ حقیقت ہے کہ ان کے کلام میں جس قدر ہمواری اور یک رنگی ہے اس کی نظیر مشکل ہی سے کہیں اور ملے گی۔

شعرائے ماضی و حال سے اصغر صاحب کو صرف اس قدر تعلق ہے کہ آپ بھی ان کی طرح غزل گو ہیں۔ اس کے سوا آپ کے کلام میں کسی کی تقلید کا جلوہ ہے اور نہ تتبع کی جھلک۔ آپ کی اجتہادی شان آپ کو محفل ادب میں سب حاضرین سے ممیز و ممتاز کرتی ہے اور یہی اجتہادی اور غیر تقلیدی رنگ آپ کے فطری شاعر ہونے کی دلیل ہے۔

اصغر صاحب کی زبان اور انداز بیان میں لطافت اور جدت ہے۔ زبان کی متانت اور سنجیدگی، انداز بیان کی شگفتگی اور رنگینی سے امتزاج پاکر کلام میں وہ دلآویز ندرت پیدا کر دیتی ہے کہ تاثیر شعری خود بخود آ جاتی ہے۔ تشبیہ و استعارات کا استعمال بھی ہے لیکن اصغر صاحب کی تشبیہوں میں ندرت اور استعارات میں اچھوتا پن پایا جاتا ہے۔ یہ تعبیریں سب نئی ہوں گی لیکن ان میں لطافت اور نزاکت کی انتہا نہ ہو گی۔ ندرت ادا کا یہ عالم ہے کہ معمولی سی بات بھی کہیں گے تو اس انداز سے کہیں گے کہ دلکش اور انوکھی معلوم ہونے لگے گی۔

آپ کے کلام پر اگرچہ ذوق فارسیت غالب ہے تاہم آپ کی زبان میں صفائی اور برجستگی ہے۔ مصرعے ایسے ڈھلے ہوتے ہیں کہ سلاست اور روانی سے خود بخود ترنم پیدا ہو جاتا ہے۔

خیالات و جذبات میں جوش اور صداقت بدرجہ احسن موجود ہے عام آ جذبات اور فرسودہ خیالات کی سطح سے گزر کر اصغر صاحب کی نظر لطیف حقائق و معارف تک پہنچتی ہے جوش و مسرت، غم و رنج، ہجر و وصال، بیم و امید وغیرہ کیفیات سے متاثر ہونا اور اس تاثر کا کسی نہ کسی طرح اظہار کر دینا عام شعراء کا شیوہ ہے۔ اصغر صاحب ان کیفیات سے متاثر ہو کر عالم بے خودی میں چلا نہیں اٹھتے۔ بلکہ یہ کیفیات ان پر الہامی حالت طاری کر دیتی ہیں۔ اور وہ فلسفہ و حکمت کی تہ میں اتر جاتے ہیں۔ اور وہاں جن نتیجوں پر پہنچتے ہیں ان کو شاعرانہ رنگینی اور لطافت سے شعر کے سانچے میں ڈھال دیتے ہیں

فلسفہ اور تصوف کے خشک مسائل کو اصغر صاحب جس رنگینی اور شعریت کے پیرائے میں بیان کرتے ہیں وہ خاص ان ہی کا حصہ ہے۔ حکیمانہ خیالات کے اظہار میں ہمیشہ لطافت اور دلاویزی ملحوظ رہتی ہے۔ آپ کے کلام میں حسن ترنم، سکون، اضطراب، سرمستی اور بے خودی کے امتزاج سے ایک ایسی کیفیت پیدا ہو گئی ہے کہ سامعین و قارئین کے دل و دماغ پر کیف و سرور اور رقص کی حالت طاری ہو جاتی ہے۔

آپ کے حکیمانہ خیالات میں اتحاد و یکرنگی پائی جاتی ہے۔ فلسفۂ اضافیت کو جس جس انداز سے آپ نے کہا ہے اس کی مثال کہیں اور نہیں مل سکتی۔ مثال کے طور پر محض حسن و عشق کو لیجئے۔ آپ کے نزدیک حسن و عشق کوئی علیحدہ اور مستقل ہستی نہیں رکھتے۔ بلکہ ایک کا وجود دوسرے کے وجود پر مبنی ہے عام زبان میں اس مضمون کو اس طرح ادا کیا جا سکتا ہے کہ عاشق میں جس درجہ کا ذوق نظر ہے معشوق میں اسی درجہ کا حسن ہوتا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں

ہاں وادیٔ ایمن کے معلوم ہیں سب قصے — موسٰی نے فقط اپنا اک ذوق نظر دیکھا

وہ عشق کی عظمت سے شاید نہیں واقف ہیں — سو حسن کروں پیدا اک ایک تمنا سے

سوز و گداز غزل کی خصوصیت ہے۔ اگر اس سوز و گداز سے یاس و حسرت آہ و بکا۔ گریہ و زاری، فریاد و ماتم وغیرہ مراد لی جائے تو اصغر صاحب کا کلام ایسے سوز و گداز سے یکسر پاک ہے۔ خود فرماتے ہیں

غزل کیا اک شرار معنوی گردش میں ہے اصغر

یہاں افسوس گنجائش نہیں فریاد و ماتم کی

ایک جگہ اور فرمایا ہے۔

شعر میں رنگینیٔ جوش تخیل چاہیئے ، مجھ کو اصغر کم ہے عادت نالہ و فریاد کی

لیکن اگر سوز و گداز دل کی ایک لطیف دردمندانہ کیفیت کا نام ہے تو اصغر صاحب کا کلام ایسے سوز و گداز سے لبریز ہے۔

آخری اور شاید بہترین خصوصیت آپ کے کلام کی یہ ہے کہ آپ کے اشعار فکر انگیز اور خیال افزا ہوتے ہیں۔ جن کے مطالعہ سے لطیف اور بلند جذبات دل میں ابھرتے ہیں چنانچہ آج سے آٹھ نو سال پیشتر[1] جب "نشاط روح" اول اول خاکسار کی نظر سے گزری تو چند صفحات کے مطالعہ سے جو تاثیر راقم کے دل پر مترتب ہوئی اس کا اظہار اس طرح ہوا تھا۔

معجز نما کلام ہے اصغر کا اے صغیر ، افسردہ دل کو محشر جذبات کر دیا

اب حضرت اصغر کے کلام سے لطف اٹھائیے۔

کیا کہیے جاں نوازیٔ پیکان یار کو ، سیراب کر دیا دل منت گزار کو

جوش شباب ، نشۂ صہبا ، ہجوم شوق ، تعبیر یوں بھی کرتے ہیں فصل بہار کو

پھر ہے تھوڑی سی بھی غفلت طریق عشق میں ، آنکھ جھپکی قیس کی اور سامنے محمل نہ تھا

نیاز عشق کو سمجھا ہے کیا اے واعظ ناداں ، ہزاروں بن گئے سجدے جبیں میں نے جہاں رکھ دی

رنگ افسردہ نہیں شایان ارباب نظر ، اب کوئی منظر بلند از کفر و ایماں دیکھیے

مستی میں فروغ رخ جاناں نہیں دیکھا ، سنتے ہیں بہار آئی گلستاں نہیں دیکھا

زاہد سے مرا حاصل ایماں نہیں دیکھا ، رخ پہ تری زلفوں کو پریشاں نہیں دیکھا

۱۔ یعنی ۱۹۴۳ء سے قبل

آئے تھے سبھی طرح کے جلوے مرے آگے — میں نے مگر اے دیدۂ حیراں نہیں دیکھا
اس طرح زمانہ کبھی ہوتا نہ پر آشوب — فتنوں نے ترا گوشۂ داماں نہیں دیکھا
ہر حال میں بس پیش نظر ہے وہی صورت — میں نے کبھی روئے شب ہجراں نہیں دیکھا
کچھ دعوئ تمکیں میں ہے معذور بھی زاہد — مستی میں تجھے چاک گریباں نہیں دیکھا
روداد چمن سنتا ہوں اس طرح قفس میں — جیسے کبھی آنکھوں سے گلستاں نہیں دیکھا
کیا کیا ہوا ہنگام جنوں یہ نہیں معلوم — کچھ ہوش جو آیا تو گریباں نہیں دیکھا

شائستۂ صحبت کوئی ان میں نہیں اصغر
کافر نہیں دیکھے کہ مسلماں نہیں دیکھا

جو نقش ہے ہستی کا دھوکا نظر آتا ہے — پردے پہ مصور ہی تنہا نظر آتا ہے !
ہر رنگ تماشا وہ جلوہ نظر آتا ہے — آنکھوں سے اگر دیکھو پردا نظر آتا ہے
لو شمع حقیقت کی اپنی ہی جگہ پر ہے — فانوس کی گردش سے کیا کیا نظر آتا ہے
اے پردہ نشیں ضد ہے کیا چشم تماشا کو — تو دفتر گل میں بھی سوا نظر آتا ہے
نظارہ بھی اب گم ہے بے خود ہے تماشائی — اب کون کہے اس کو جلوا نظر آتا ہے
جو کچھ تھی یہاں رونق سب باد چمن سے تھی — اب کنج قفس مجھ کو سونا نظر آتا ہے
احساس میں پیدا ہے پھر رنگ گلستانی — پھر داغ کوئی دل میں تازا نظر آتا ہے

تھی فرد عمل اصغر کیا دست مشیت میں
ایک ایک ورق اس کا سادا نظر آتا ہے

نمایاں کر دیا اس نے بہار رنگ حیداں کو — کر دی نغمے کو مستی رنگ کچھ صبح گلستاں کو
ذرا تکلیف جنبش دے نگاہ برق ساماں کو — جہاں میں منتشر کر دے مذاق سوز پنہاں کو

دار و کے ہوئے موجِ تبسم ہائے پنہاں کو
ابھی پہلے اڑیں گی بجلیاں تارِ رگِ جاں کو

قفس ہو دام ہو کوئی چھڑا لے اب یہ ناممکن
ازل کے دن کلیجے میں بٹھایا تھا گلستاں کو

بس اتنے پر ہوا ہنگامۂ دار و رسن برپا
کہ لے آغوش میں آئینہ کیوں مہرِ درخشاں کو

تمنا ہے نکل کر سامنے بھی عشوہ فرما ہو
کوئی دیتا ہے جنبش پردۂ بیتابیٔ جاں کو

یہاں کچھ نخل پر بکھرے ہوئے اوراقِ رنگیں ہیں
مگر اک مشتِ پر سے پوچھئے رازِ گلستاں کو

دکھائی صورتِ گل پر بہارِ شوخیٔ پنہاں
چھپایا معنیٔ گل میں کبھی حسنِ نمایاں کو

ہوئے جو ماجرے خلوت سرائے راز میں اس سے
نہ کفر اب تک ہوا واقف خبر اس کی نہ ایماں کو

سنا ہے حشر میں شانِ کرم بیتاب نکلے گی
لگا رکھا ہے سینے سے متاعِ ذوقِ عصیاں کو

نہ میں دیوانہ ہوں اصغرؔ نہ مجھ کو ذوقِ عریانی
کوئی کھینچے لئے جاتا ہے خود جیب و گریباں کو

جینے کا نہ کچھ ہوش نہ مرنے کی خبر ہے
اے شعبدہ پرداز یہ کیا طرزِ نظر ہے

سینے میں یہاں دل ہے نہ پہلو میں جگر ہے
اب کون ہے جو تشنۂ پیکانِ نظر ہے

ہے تابشِ انوار سے عالم تہ و بالا
جلوہ وہ ابھی تک تہِ دامانِ نظر ہے

کچھ ملنے لگے پختگیٔ عشق کے آثار
نالوں میں رسائی ہے نہ آہوں میں اثر ہے

ذروں کو یہاں چین نہ اجرامِ فلک کو
یہ قافلہ بیتاب کہاں گرمِ سفر ہے

خاموش یہ حیرت کدۂ دہر ہے اصغرؔ
جو کچھ نظر آتا ہے وہ سب طرزِ نظر ہے

اسرارِ عشق ہے دلِ مضطر لئے ہوئے
قطرہ ہے بے قرار سمندر لئے ہوئے

آشوبِ دہر و فتنۂ محشر لئے ہوئے
پہلو میں یعنی ہوں دلِ مضطر لئے ہوئے

موجِ نسیمِ صبح کے قربان جائیے
آئی ہے بوئے زلفِ معنبر لئے ہوئے

کیا مستیاں چمن میں ہیں جوشِ بہار سے
ہر شاخِ گل ہے ہاتھ میں ساغر لئے ہوئے

قاتل نگاہِ یاس کی زد سے نہ بچ سکا
خضر تھے ہم بھی اک تہ خنجر لئے ہوئے

خیرہ کئے ہے چشمِ حقیقت شناس کو
ہر ذرہ ایک مہرِ منور لئے ہوئے

پہلی نظر بھی آپ کی اُف کس بلا کی تھی
ہم آج تک وہ چوٹ ہیں دل پر لئے ہوئے

تصویر ہے کھنچی ہوئی ناز و نیاز کی
میں سر جھکائے اور وہ خنجر لئے ہوئے

صہبائے تند و تیز کو ساقی سنبھالنا
اچھلے کہیں نہ شیشہ و ساغر لئے ہوئے

میں کیا کہوں کہاں ہے محبت کہاں نہیں
رگ رگ میں دوڑی پھرتی ہے نشتر لئے ہوئے

نام ان کا آگیا کہیں ہنگامِ بازپرس
ہم تھک کے اٹھ گئے صفِ محشر لئے ہوئے

اصغر حریمِ عشق میں ہستی ہی جرم ہے
رکھنا کبھی نہ پاؤں یہاں سر لئے ہوئے

اب یہی ہے وجہِ تسکینِ خاطرِ ناشاد کی
زندگی میں نے دیارِ حسن میں برباد کی

ہوش بہکے بجلی گری آنکھیں بھی خیرہ ہو گئیں
تم تو کیا تھے اک جھلک سی تھی تمہاری یاد کی

چل دیا مجنوں تو صحرا سے کسی جانب مگر
اک صدا گونجی ہوئی ہے نالۂ فریاد کی

نغمۂ پُر درد چھیڑا اپنے اس انداز سے
خود بخود مجھ پر نظر پڑنے لگی صیاد کی

دل ہوا مجبور جس دم اک حسرت بن گیا
روح جب تڑپی تو صورت بن گئی فریاد کی

اس حریمِ قدس میں کیا لفظ و معنی کا گذر
پھر بھی سب باتیں پہنچی ہیں لبِ فریاد کی

تمتما اٹھے وہ عارض میرے عرضِ شوق پر
حسن جاگ اٹھا ہے جب عشق نے فریاد کی

آشیاں میں اب کسی صورت نہیں پڑتا ہے چین
تھی نظر ڈوبی ہوئی تاثیر میں صیاد کی

شعر میں رنگینیٔ جوش تخیل چاہیئے !
مجھ کو اصغرؔ کم ہے عادت نالۂ فریاد کی

آنکھوں میں تیری بزم تماشا لئے ہوئے — جنت میں بھی ہوں جنت دنیا لئے ہوئے

پاس ادب میں جوش تمنا لئے ہوئے — میں بھی ہوں اک حباب میں دریا لئے ہوئے

ہے آرزو کہ آئے قیامت ہزار بار — فتنہ طرازیٔ قد رعنا لئے ہوئے

طوفان ناز اور پریشاں غبار قیس — شان نیاز محمل لیلیٰ لئے ہوئے

پھر دل میں التفات ہوا ان کے جا گزیں — اک طرز خاص رنجش بیجا لئے ہوئے

پھر ان لبوں پہ موج تبسم ہوئی عیاں — سامان جوش رقص تمنا لئے ہوئے

صوفی کو ہے مشاہدۂ حق کا ادعا — صدہا حجاب دیدۂ بینا لئے ہوئے

صدہا تو لطف مے سے بھی محروم ہو گئے — یہ امتیاز ساغر و مینا لئے ہوئے

مجھ کو نہیں ہے تاب خلشہائے روزگار — دل ہے نزاکت غم لیلیٰ لئے ہوئے

تو برق حسن اور تجلی سے یہ گریز — بس خاک اور ذوق تماشا لئے ہوئے

افتادگان عشق نے سر اب تو رکھ دیا — اٹھیں گے بھی تو نقش کف پا لئے ہوئے

رگ رگ میں اور کچھ نہ رہا جز خیال دوست — اس شوخ کو ہوں آج سراپا لئے ہوئے

دل مبتلا و مائل تمکین اتقا — جام شراب نرگس رسوا لئے ہوئے

سرمایۂ حیات ہے حرمان عاشقی — ہے ساتھ ایک صورت زیبا لئے ہوئے

جوش جنوں میں چھوٹ گیا آستان یار — روتے ہیں منہ پہ دامن صحرا لئے ہوئے

اصغرؔ ہجوم درد غریبی میں اس کی یاد
آئی ہے اک طلسم تمنا لئے ہوئے

نالۂ سوز خواہش میں آہ جگر گداز میں | کون ستم طراز ہے پردۂ سوز ساز میں
چاہئے داغ معصیت اس کی حریم ناز میں | پھول یہ ایک بھی نہیں دامن پاکباز میں
بال خرد کو ہوش کو مستی دے بیخودی سکھا | یا نہ کسی کو ساتھ لے اسکے حریم ناز میں
حشر میں اہل حشر سے دیکھئے خوش ادائیاں | فرد عمل تو چاہئے دست کرشمہ ساز میں
اب وہ عالم عدم نہیں پرتو حسن یار سے | باغ و بہار بن گیا آئینہ دست ناز میں
گم ہے حقیقت آشنا بندۂ دہر بے خبر | ہوش کسی کو بھی نہیں میکدۂ مجاز میں
موج نسیم صبح میں بوئے صنم کدہ بھی ہے | اور بھی جان پڑ گئی کیفیت نماز میں
کچھ تو کمال عشق سے حسن کا رنگ اڑ گیا | ایک ادائے ناز ہے بیخودی نیاز میں
شورش عندلیب نے روح چمن میں پھونک دی | ورنہ یہاں کلی کلی مست تھی خواب ناز میں

اصغر خاکسار وہ ذرہ خود شناس ہے
حشر سا کر دیا بپا جس نے جہان راز میں

ستم کے بعد اب انکی پشیمانی نہیں جاتی | نہیں جاتی نظر کی فتنہ سامانی نہیں جاتی
نمود جلوۂ بے رنگ سے ہوش اس قدر گم ہیں | کہ پہچانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی
پتہ ملتا نہیں اب آتش وادیٔ ایمن کا | مگر مینائے مے کی نور افشانی نہیں جاتی
مگر اک مشت پر کی خاک سے کچھ ربط باقی ہے | ابھی تک شاخ گل کی شعلہ افشانی نہیں جاتی
چمن میں چھیڑتی ہے کس مزے سے غنچہ و گل کو | مگر موج صبا کی پاکدامانی نہیں جاتی

اڑا دیتا ہوں اب بھی تار تار ہست و بود اصغر
لباس زہد و تمکیں پر بھی عریانی نہیں جاتی

ذرے ذرے میں اسی کو جلوہ گر سمجھا تھا میں — عکس کو حیرت میں آئینہ مگر سمجھا تھا میں

حد کیا نظارہ کیا اس کی تجلی گاہ میں — وہ بھی موج حسن تھی جس کو نظر سمجھا تھا میں

پھر وہی واماندگی ہے پھر وہی بیچارگی — ایک موج بوئے گل کو بال و پر سمجھا تھا میں

سطوتِ شب کو سر بسجدہ ساکت و مدہوش تھے — ماہ و انجم کو تو سرگرم سفر سمجھا تھا میں

رہبری نے مجھ پہ کھولی راہِ بے پایانِ عشق — راہبر کو اک فریب رہ گذر سمجھا تھا میں

کتنی پیاری شکل اس پردے میں ہے جلوہ فزا — عشق کو ژولیدہ و آشفتہ سر سمجھا تھا میں

تا طلوع جلوۂ خورشید پھر آنکھیں ہیں بند — تجھ کو اے موج فنا نور سحر سمجھا تھا میں

مست و بیخود ہیں مہ و انجم زمین و آسماں — یہ تری محفل تھی جس کو رہ گذر سمجھا تھا میں

ذرہ ذرہ ہے یہاں کا رہبر راہ فنا — سامنے کی بات تھی جس کو خبر سمجھا تھا میں

چپے چپے پر چمن کے ہے وہی چھائی ہوئی — عندلیب زار کو اک مشت پر سمجھا تھا میں

کائنات دہر ہے سرشار اسرار حیات — ایک مست آگہی کو بے خبر سمجھا تھا میں

جان ہے محو تجلی جسم و گوش و لب ہیں بند — حسن کو حسن بیاں حسن نظر سمجھا تھا میں

میں تو کچھ لایا نہیں اصغرؔ بجز بے مائگی
سر کو بھی اس آستاں پر درد سر سمجھا تھا میں

جگر مراد آبادی

علی سکندر نام۔ جگرؔ تخلص۔ مراد آباد آپ کی وطنیت پر فخر کرتا ہے۔ بزرگوں کا وطن دہلی تھا۔ آپ کے والد علی نظر شاعر اور صاحب دیوان تھے۔ اور خواجہ وزیرؔ لکھنوی سے اصلاح سخن لی تھی۔ جگرؔ کی ابتدائی تعلیم معمولی اور غیر مستقل طور پر ہوئی۔ فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ انگریزی سے بھی کچھ واقفیت ہے۔

آپ کی عمر اس وقت کوئی پچاس کے قریب ہوگی۔ میانہ سے کچھ کم قد۔ منحنی۔ سیاہ گوں۔ فرنچ کٹ ڈاڑھی۔ سر کے بال پریشاں۔ لباس سے بے پروا۔ بظاہر شاعری کے سحر کے مجنوں۔ لیکن شگفتہ مزاج اور رنگین طبع۔ مستقل قیام کا فخر کسی خاص مقام کو حاصل نہیں۔ جہاں کسی قدردان نے مدعو کر لیا کچھ دن گذار دیئے۔[1]

آپ نے ذوق سخن ترکہ میں پایا ہے۔ ابتدا تو والد بزرگوار سے مشورۂ سخن کیا۔ ان کے بعد داغ سے فیض پایا۔ کچھ غزلیں منشی امیر اللہ تسلیم کو بھی دکھائیں لیکن ابتدائی کلام پر داغ کا رنگ زیادہ غالب ہے۔

آپ کے کلام کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں ایک "داغ جگر" اور دوسرا "شعلۂ طور" لیکن ان دونوں مجموعوں کا رنگ ایک دوسرے سے قطعی مختلف ہے "داغ جگر" کی خصوصیات سادگی، روانی، دل نشین فارسی تراکیب، شوخی، معاملہ بندی اور جذبات و خیالات میں عمق وغیرہ ہیں۔ عجب ہے کہ جگر صاحب "داغ جگر" کو پسند نہیں فرماتے۔ خاکسار نے خود ان کی زبانی سنا ہے کہ جگر اب وہ جگر نہیں رہا۔ "داغ جگر" بھی اسی جگر کے ساتھ ختم ہوا۔ موجودہ جگر کو سمجھو تو موجودہ کلام سے سمجھو۔" آپ کا یہ قول خواہ شاعرانہ وارفتگی پر مبنی ہو لیکن اس میں بہت کچھ اصلیت بھی

---

[1] آج کل آپ کا مستقل قیام گونڈہ میں ہے جہاں آپ نے حضرت اصغر مرحوم کی یاد میں ایک اسلامیہ ہائی سکول قائم کیا ہے اور ہمہ تن اس کی فلاح و بہبود میں مصروف رہنے میں مسلسل کے درابدانہ دستقیانہ زندگی بسر کرتے ہیں اور گاہ گاہ پاکستان آکر مشاعروں کو چار چاند لگاتے ہیں۔

پائی جاتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جس زمانے میں اصغر صاحب گونڈے میں چشموں کا کاروبار کرتے تھے، جگر صاحب چشموں کی ایجنسی کیا کرتے تھے اور اس سلسلہ میں جگر صاحب کو ان سے تبادلہ خیالات کا موقع ملتا تھا۔ صحبتیں گرم اور شعر و سخن کے چرچے رہتے تھے اسی زمانہ میں جگر صاحب کو اصغر صاحب سے عقیدت پیدا ہو گئی۔ چنانچہ آجکل یہ حالت ہے کہ آپ اصغر صاحب کے روبرو دو زانو باادب بیٹھتے ہیں۔ اگر ان کے ہاں قیام کرنے کا موقع ملتا ہے تو نخت رز سے بگاڑ اور پنج وقتہ نماز کی پابندی کر لیتے ہیں۔ مشاعروں میں ان کی غزل خود پڑھتے ہیں اور اگر کوئی اور پڑھنا چاہے تو اس سے بگڑ جاتے ہیں۔ اصغر صاحب کو بھی آپ کی خاطر اور دل دہی منظور ہوتی ہے۔ چنانچہ ان ہی سے غزل پڑھواتے ہیں اس عقیدت کی وجہ پردہ راز میں ہے۔ لیکن کسی کسی حلقے میں لوگوں کا خیال ہے کہ جگر حضرت اصغر کے شاگرد ہیں۔ اگر استادی و شاگردی کو عام معنوں میں سمجھا جائے تو یہ غلط ہے کہ جگر صاحب اصغر کے شاگرد ہیں۔ ورنہ اصغر صاحب کی صحبت اور ان کے کلام کا جو اثر جگر صاحب کے کلام پر پڑا ہے اس کے رو سے ایک معنی میں آپ ضرور ان کے شاگرد ہیں۔ اور اس تاثر کا جلوہ "شعلہ طور" میں صاف نظر آتا ہے۔

سطور بالا سے "داغ جگر" اور "شعلہ طور" کے باہمی فرق کو سمجھنے میں سہولت ہوگی۔ "شعلہ طور" میں سادگی، روانی، اور دل نشین فارسی ترکیب وہی ہیں جو "داغ جگر" میں ہیں۔ لیکن شوخی اور معاملہ بندی، کیف، وارفتگی، بیخودی اور والہانہ انداز بیان سے بدلتی ہے۔ ان پر رنگینی اور دلکشی کا اضافہ ہوتا

ہے۔ متانت اور پختگی بڑھتی ہے۔ تخیل میں بلندی اور جذبات میں جوش و صداقت پیدا ہوتی ہے۔ حقائق و معارف کی شاعرانہ رنگینی سے کلام میں گہرائی اور عمق پیدا ہوتا ہے۔

جگر صاحب کے کلام میں حسن ہے۔ خواہ حسن ادا کہیے خواہ حسن تخیل غرض حسن ہے اور شعر میں حسن کا ہونا شاعری کی معراج ہے۔ آپ کے پڑھنے کا طرز بھی عجیب والہانہ ہے۔ ایک مخصوص ترنم سے اس طرح پڑھتے ہیں کہ شعر کے حسن تاثیر کی انتہا نہیں رہتی۔ اطراف ہند و پاکستان میں جہاں ان کے رنگ شاعری کی تقلید کی جا رہی ہے۔ وہاں انکے ترنم سے بھی مشاعروں کو گرمایا جاتا ہے۔

نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

کام آخر جذبۂ بے اختیار آ ہی گیا — دل کچھ اس صورت سے تڑپا انکو پیار آ ہی گیا
ہائے یہ حسن تصور کا فریب رنگ و بو — میں یہ سمجھا جیسے وہ جان بہار آ ہی گیا

عشق کی یہ نمود پیہم کیا — ہو نہیں تم اگر تو پھر ہم کیا
آہ بیتاب و اشک پیہم کیا — نقد غم ہے تو حاصل غم کیا
جز ترے کچھ نظر نہیں آتا — آرزو بن گئی مجسم کیا
تیرا ملنا، ترا نہیں ملنا — اور جنت ہے کیا جہنم کیا
میں وہاں ہوں جہاں نہیں میں بھی — عالم و ماورائے عالم کیا
ہم ہیں تیرے وہ لغزشیں تیری — شکر راحت شکایت غم کیا
ان نگاہوں کے سب کرشمے ہیں — ورنہ یہ اضطراب پیہم کیا

کر لیا دل نے عیش وصل قبول — پا گیا کچھ شباہت غم کیا!
نیت شب بخیر اے ساقی — بزم جم کیا ہے ساغر جم کیا
شوق گستاخ کر چکا تقصیر — دیکھتا اب ہے حسن برہم کیا
موت کی نیند چھائی جاتی ہے — کہہ چکا میں فسانہ غم کیا
ہمہ تن عشق بہ ملا بن جا — درد کی اک صدائے مبہم کیا
اس نظر میں نہیں سماتا کچھ — جان بیتاب و چشم پرنم کیا

عشق خاموش کے مزے ہیں جگر
جوش فریاد و شور ماتم کیا

اب کہاں زمانے میں دوسرا جواب ان کا — فصل حسن ہے ان کی موسم شباب ان کا
اوج پر جمال انکا جوش پر شباب ان کا — عہد ماہتاب ان کا دور آفتاب ان کا
عرض شوق پر میرے پہلے کچھ عتاب انکا — خاص اک ادا کے ساتھ پھر وہ کچھ حجاب انکا
رنگ و بو کی دنیا میں اب کہاں جواب انکا — عشق فرش بزم انکا حسن فرش خواب انکا
ہم سے پوچھ اے ناصح دل گرفتگی ان کی — ہم نے چھپ کے دیکھا ہے عالم پرآب انکا
پھول مسکراتے ہیں دل پہ چوٹ پڑتی ہے — ہائے وہ رخ خنداں اف رے وہ شباب انکا
یونہی کھلے جاتے ہیں عشق و حسن کے اسرار — اک نفس سوال اپنا اک نفس جواب انکا
کیا اسی کو کہتے ہیں ربط و ضبط حسن و عشق — شوق نارسا اپنا ناز کامیاب ان کا
اسطرح سے ہوں غارت ہائے عشق کی غفلت — جان کہہ رہے صدا ان کی دل کہے ہے باب انکا
رنگ و بو کے پردے میں کون پھوٹ نکلا ہے — چھپ سکا چھپائے سے کیا کہیں شباب انکا
ضبط کا جنہیں دعوی عشق میں رہا اکثر — ہم نے حال دیکھا ہے بیشتر خراب ان کا

اور کس کی یہ طاقت اور کس کی یہ جرأت — عشق آپ اٹھا دے حسن خود حجاب ان کا
کہیے حال دل لیکن دیکھئے کن آنکھوں سے — ہر سکوں کے پردے میں حشر اضطراب انکا
عشق ہی کے ہاتھوں میں کچھ سکت نہیں رہتی — ورنہ چیز ہی کیا ہے گوشۂ نقاب ان کا
جیسے حسن کی دیوی جھانکتی ہو چلمن سے — نیم وا سی آنکھوں میں وہ کیف خواب انکا
عرض غم نہ کر اے دل دیکھ ہم نہ کہتے تھے — رہ گئے وہ "اونہہ" کر کے سن لیا جواب انکا
تو جگر جو رسوا ہے تو ہی آہ رسوا رہ — نام تو نہ کر رسوا خانماں خراب انکا

تو جگر سے مستوں پر طعن کر نہ اے واعظ
تو غریب کیا جانے مسلک شراب انکا

یہ میکشی ہے تو پھر شان میکشی کیا ہے — بہک نہ جائے جو پی کر وہ رند ہی کیا ہے
بس ایک سمت اڑا جا رہا ہوں وحشت میں — خبر نہیں کہ خودی کیا ہے بیخودی کیا ہے
میں زہر مرگ گوارا کروں کہ تلخیٔ زیست — مری خوشی تو ہے سب کچھ تری خوشی کیا ہے
لبوں پہ موج تبسم نگہ میں برق غضب — کوئی بتائے یہ انداز برہمی کیا ہے
کسے مجال کہ افشائے راز یار کرے — یہ زندگی ہی سے سمجھو کہ زندگی کیا ہے
ستم کشان محبت سے کوئی پوچھے تو — امید پہ ہے بھروسا امید ہی کیا ہے
کہاں کی خانقہ و مسجد و کنشت و بہشت — فقیر ہوں مرے ساقی کے گھر کمی کیا ہے
یہ درس میں نے لیا مکتب محبت سے — کسی طرح جو بہل جائے زندگی کیا ہے

اسی کے واسطے مے بھی ہے میکشی بھی جگر
خبر نہیں جسے مے کیا ہے میکشی کیا ہے

وہ کون ہے ایسا کہ تری شکل دکھا دے — احسان ہے اس کا جو مجھے مجھ سے ملا دے

ہاں جذبِ غمِ عشق کی تاثیر دکھا دے
مجبور نہ بن حسن کو مجبور بنا دے

تو چاہے تو لے جلوۂ اعجازِ محبت
تصویر کو تصویر کا دیوانہ بنا دے

تو حسن ہے میں عشق ہوں تو جان ہے میں جسم
کس کی ہے یہ طاقت کہ مجھے تجھ سے چھڑا دے

اے جانِ دو عالم ترے عالم کے تصدق
اپنا جو بنایا ہے تو اپنا سا بنا دے

جنت میں بھی ایسا تو نہ ہوگا گلِ خنداں
اے زخمِ جگر زینتِ قاتل کو دعا دے

دل گیا رونقِ حیات گئی
غم گیا ساری کائنات گئی

دل دھڑکتے ہی پھر گئی وہ نظر
لب تک آئی نہ تھی کہ بات گئی

دن کا کیا ذکر تیرہ بختوں میں
ایک رات آئی ایک رات گئی

تیری باتوں سے آج تو واعظ
وہ جو تھی خواہشِ نجات گئی

ان کے بہلائے بھی نہ بہلا دل
رائیگاں سعیِ التفات گئی

مرگِ عاشق تو کچھ نہیں لیکن
اک مسیحا نفس کی بات گئی

اب جنوں آپ ہے گریباں گیر
اب وہ رسمِ تکلفات گئی

ہم نے بھی وضعِ غم بدل ڈالی
جب سے وہ طرزِ التفات گئی

ترکِ الفت بہت بجا ناصح
لیکن اس تک اگر یہ بات گئی

ہاں مزے لوٹ لے جوانی کے
پھر نہ آئے گی یہ جو رات گئی

ہائے سرشاریاں جوانی کی
آنکھ جھپکی ہی تھی کہ رات گئی

جلوۂ ذات اے معاذ اللہ
تابِ آئینۂ صفات گئی

نہیں ملتا مزاجِ دل ہم سے
غالباً دور تک یہ بات گئی

قید ہستی سے کب نجات جگر
موت آئی اگر حیات گئی

آیا نہ راس نالۂ دل کا اثر مجھے
اب تم ملے تو کچھ نہیں اپنی خبر مجھے

دل لے کے مجھ سے دیتے ہو داغ جگر مجھے
یہ بات بھولنے کی نہیں عمر بھر مجھے

ہر سو دکھائی دیتے ہیں وہ جلوہ گر مجھے
کیا کیا فریب دیتی ہے میری نظر مجھے

ملتی نہیں ہے لذت درد جگر مجھے
بھولی ہوئی نہ ہو نگہ فتنہ گر مجھے

ڈالا ہے بیخودی نے عجب راہ پر مجھے
آنکھیں ہیں اور کچھ نہیں آتا نظر مجھے

کرنا ہے آج حضرت ناصح سے سامنا
مل جائے دو گھڑی کو تمہاری نظر مجھے

مستانہ کر رہا ہوں رہِ عاشقی کو طے
لیجائے جذب شوق مرا اب جدھر مجھے

یکساں ہے حسن و عشق کی سرمستیوں کا رنگ
ان کی خبر نہیں ہے نہ میری خبر مجھے

مرنا ہے ان کے پاؤں پہ رکھ کر سر نیاز
کرنا ہے آج قصۂ غم مختصر مجھے

کیا جانئے قفس میں رہے کیا معاملہ
اب تک تو ہیں عزیز مرے بال و پر مجھے

کیا بلا عشق تماشا ساز ہے
اس کا ہر انجام اک آغاز ہے

موت پر حیرانی و حیرت ہی کیا
زندگی خود اک طلسم راز ہے

روح ہے اک نغمۂ ساز الست
جسم خاکی پردۂ آواز ہے

ان کو اپنی شان رحمت پر غرور
مجھ کو اپنی بے بسی پر ناز ہے

لفظ و معنی جس کو چھو سکتے نہیں
وہ مرا افسانۂ آغاز ہے

لب تک اے صیاد آ سکتی نہیں
دل میں جتنی حسرت پرواز ہے

یوں نہ دیکھے کوئی تو کچھ بھی نہیں — ورنہ ہر ذرہ طلسمِ راز ہے!
ہوشیار اے طائرِ جاں ہوشیار — اس گلستاں کی ہوا ناساز ہے
سرِ ہستیِ دو عالم کچھ نہ پوچھ — ابتدا سے انتہا تک راز ہے
اضطرابِ دل بھی کیا شے ہے کہ اب — بے پر و بالی پہ بھی پرواز ہے!
زندگی کیا ہے نمودِ عاشقی — عشق کیا ہے حسن کا آغاز ہے

زندگی جس سے عبارت ہے جگر
وہ کسی کی اک نگاہِ ناز ہے!

تا شرِ محبت کی اللہ رے مجبوری — ہر بعد میں اک قربت ہر قرب میں اک دوری
یوں خود فنا ہو جائے دل راہِ الفت میں — ہر سانس سے پیدا ہو اک نغمۂ منصوری
کل ہستیِ عالم پہ طاری ہیں صفات اسکے — سب کہنے کی باتیں ہیں ہماری مجبوری
خود اپنے لئے بلبل تجویزِ قفس کر لے — اس پر بھی جو کھل جائے صیاد کی مجبوری

لوٹے ہی جگر اس کو ہستی میں ملایا ہے
ورنہ یہ ترا دل تھا اک آئینۂ نوری

شورشِ کائنات نے مارا — موت بن کر حیات نے مارا
پرتوِ حسنِ ذات نے مارا — مجھ کو میری صفات نے مارا
ستمِ یار کی دہائی ہے — نگہِ التفات نے مارا
میں تھا رازِ حیات اور مجھے — میرے رازِ حیات نے مارا
ستمِ زیست آفریں کی قسم — خطرۂ التفات نے مارا
موت کیا ایک لفظِ بے معنی — جس کو مارا حیات نے مارا

جو پڑی دل پہ سہہ گئے لیکن　　ایک نازک سی بات نے مارا
شکوۂ موت کیا کریں کہ جگرؔ!
آرزوئے حیات نے مارا

خود اپنے عکس کو اپنے مقابل دیکھنے والے　　ذرا آنکھیں تو کھول او نقشِ باطل دیکھنے والے
حقیقت کو حقیقت کے مقابل دیکھنے والے　　مجھے بھی دیکھ میری ہستیٔ دل دیکھنے والے
یہ محفل ہے یہاں ہیں رنگِ محفل دیکھنے والے　　ہے بیگانہ بن کر جانبِ دل دیکھنے والے
نقوشِ رنگ و بو رنگینیٔ دل دیکھنے والے　　کبھی خود کو بھی دیکھ او خود سے غافل دیکھنے والے
ترے جلووں کو دیکھیں یا مرے دل کی طرف دیکھیں　　کہاں ہیں اتصالِ موج و ساحل دیکھنے والے
ترے کوچے میں آ کر فخر سمجھے ہیں اسیری کو　　زمیں سے آسماں تک وسعتِ دل دیکھنے والے
نہ دیکھیں آنکھ اٹھا کر بھی جمالِ شاہدِ مقصد　　غمِ بے حاصلی کا حسنِ حاصل دیکھنے والے
تری صورت کا مظہر ہے ترا ہر نقشِ رنگیں　　تجھی کو دیکھتے ہیں تیری محفل دیکھنے والے
شہادت تا مقامِ عشق کی صورت بدلتی ہے　　سنبھلنا ہاں سنبھلنا رقصِ بسمل دیکھنے والے
مری ہستی کا ہر ذرہ اڑا جاتا ہے منزل سے　　مری منزل دیکھتے ہیں جذبِ منزل دیکھنے والے
زمین و آسماں کیا ہیں مکان و لامکاں کیسے　　سما جاتا ہے تو بھی تنگنائے دل دیکھنے والے
انہیں ہمت کی ہے کیا گو ہے مقصد کہ کیا جانب　　یہ سب ہیں رقصِ موج و سکرِ ساحل دیکھنے والے
ضمیرِ محبت سے ذرا آنکھیں ملا اے ناصح　　یہی وہ ہیں جنہیں کہتے ہیں قاتل دیکھنے والے
مری آشفتہ حالی کا بھی کچھ اندازہ فرمائیں　　اسی محفل میں بیٹھے ہوں گے تنہا محفل دیکھنے والے
ان آنکھوں کو کھینچ کر سوئے محبت میں کھڑی ہے　　مرے اشعار دیکھیں گے مرا دل دیکھنے والے

مجھے آغوشِ طوفاں ہی جگرؔ آغوشِ مادر ہے!!

وہ کوئی اور ہوں گے اہلِ ساحل دیکھنے والے

اس طرح خوش ہوں کسی کے وعدۂ فردا پہ میں — فی الحقیقت جیسے مجھ کو اعتبار آ ہی گیا

پیتا بغیر اذن یہ کب تھی مری مجال — در پردہ چشمِ یار کی شہ پا کے پی گیا

فنائے عشق کو رنگِ بقا دیا تو نے — حیات و موت کو یکجا دکھا دیا تو نے

ہزار جانِ گرامی فدا بایں نسبت — کہ میری ذات سے اپنا پتہ دیا تو نے

یہ کیا کیا کہ عطا کر کے عشقِ لامحدود — مجھے حریفِ مقابل بنا دیا تو نے

ہزار دل کو مٹا کر دیا مجھے اک درد — اس ایک درد کو پھر دل بنا دیا تو نے

ہر ایک دل کو عطا کر کے مدعائے حیات — جگر کو اک دلِ بے مدعا دیا تو نے

فکرِ منزل ہے نہ ہوشِ جادۂ منزل مجھے — جا رہا ہوں جس طرف لیے جا رہا ہے دل مجھے

روک سکتی ہو تو بڑھ کر روک لے منزل مجھے — لے اڑی ہے ایک موجِ بے قرارِ دل مجھے

ٹھوکریں دے اے غیرتِ سوزِ محبت ٹھوکر — اب سمجھتی ہیں وہ نظریں رحم کے قابل مجھے

فانی بدایونی شوکت علی نام۔ فانی تخلص ۱۳ ستمبر ۱۸۷۹ء کو پیدا ہوئے فانی صاحب کے والد مرحوم محمد شجاعت علی خاں محکمہ پولیس میں انسپکٹر تھے۔ انہیں اپنے بیٹے کے لئے کسی آزاد پیشے کی تمنا تھی چنانچہ انہوں نے فانی صاحب کو وکالت کے لئے مجبور کیا آپ نے انٹرنس تک اپنے وطن بدایوں ہی میں تعلیم پائی بریلی کالج سے بی۔اے اور الہ آباد و علی گڑھ سے ایل ایل بی پاس کیا۔ آجکل آپ حیدرآباد دکن میں تشریف رکھتے ہیں[1]

شعر و سخن کا شوق بچپن سے دامنگیر تھا۔ ان کے والد انہیں شعر گوئی سے

---

[1] عرصہ ہوا انتقال ہو چکا ہے۔

رہ کرتے تھے اور یہ پوشیدہ طور پر کہتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ بذریعہ خط و کتابت داغ دہلوی سے مشورۂ سخن کرنا چاہا مگر یہ راز افشا ہو گیا اور انہیں یہ سلسلہ ختم کر دینا پڑا۔ غرض یہ کہ آپ نے کسی سے اصلاح نہیں لی۔ مذاق صحیح اور وجدان سلیم نے آپ کی راہنمائی کی اور آخر راہ راست پر ڈال دیا۔

آپ نے تین دیوان تصنیف کئے تھے دو مثنویاں اور دو ڈرامے بھی لکھے۔ مگر آپ کی عدم توجہی سے یہ ذخیرہ تلف ہو تا رہا۔ آخر بچا کھچا کلام "باقیات فانی" کے نام سے شائع کیا۔

آپ کی زبان عام طور پر شستہ اور صاف ہے فارسی تراکیب بھی دلکش اور مناسب ہیں لیکن کہیں کہیں مضمون کی گہرائی اور تخیل کی بلندی کی وجہ سے تراکیب میں پیچیدگی اور ثقالت آ گئی ہے۔ لطف محاورہ بھی موجود ہے خاص خاص محاورے زبان پر زیادہ چڑھے ہوئے ہیں۔

پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی نے "باقیات فانی" پہ مقدمہ لکھا ہے آپ فرماتے ہیں کہ "فانی یاسیات کے امام ہیں" اس میں شک نہیں کہ آپ کے کلام میں سوز و گداز، یاس اور حزن و ملال کی حد تک بڑھا ہوا ہے۔ لہجہ ایسا دردناک ہے کہ دل پر اثر کئے بغیر نہیں رہتا۔ اس ضمن میں ایک مشہور و معروف غزل کے چند اشعار درج کئے جاتے ہیں۔

مآل سوز غم ہائے نہانی دیکھتے جاؤ — بھڑک اٹھی ہے شمع زندگانی دیکھتے جاؤ
غرور حسن کا صدقہ کوئی جاتا ہے دنیا سے — کسی کی خاک میں ملتی جوانی دیکھتے جاؤ
سنے جاتے نہ تھے تم سے مرے دن رات کے شکوے — کفن سرکاؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ

پروفیسر صاحب موصوف الصدر نے فانی اور غالب کا موازنہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں "غالب کی مانند فانی کو بھی مجردات سے بحث کرنے کا خاص ذوق اور اس کے اظہار پر غیر معمولی قدرت ہے۔ ان کو دقیق سے دقیق مسئلہ کی تشریح و تفسیر کے لئے بھی غیر مانوس یا دقیق الفاظ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ان کو غالب کے مقابلے میں ایک امتیازی حیثیت دی جا سکتی ہے مگر بہر حال الفضل للمتقدم علاوہ بریں وہ غالب کی مانند متنوع نہیں یعنی انہوں نے غالب کی طرح زندگی کے ہر پہلو کا ہر نقطۂ نگاہ سے مطالعہ نہیں کیا ہے"

فانی کے کلام میں تصوف کی چاشنی بھی ایک پر لطف حد تک موجود ہے بیان میں عام طور پر ندرت و جدت پائی جاتی ہے۔ جذبات میں بہ درد جوش کے ساتھ اضطراب اور کشمکش کی آمیزش شعر کو نازک اور پر لطف بنا دیتی ہے۔

کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو:۔

امکاں معرفت کو سمو کر محال میں
وہ دل میں یوں ہے کہ نہ آئے خیال میں

ٹوٹا نہ ہم سے رشتۂ رسم حجاب عشق
چھوٹا نہ ہم سے ہجر کا دامن وصال میں

قدموں پہ گر کے کوئی خطا کار مر نہ جائے
ذوق آفرینیاں ہیں تمہارے ملال میں

ملتی نہیں تصور ہستی سے اب نجات
گھر سا گیا ہوں حلقۂ دام خیال میں

آخر زمانہ آئینہ دکھلا کے رہ گیا
لانا پڑا تمہیں کو تمہاری مثال میں

بے اجل کام نہ اپنا کسی عنواں نکلا
دم تو نکلا مگر آزردۂ احساں نکلا

آ گئی ہے تیرے بیمار کے منہ پہ رونق — جان کیا جسم سے نکلی کوئی ارماں نکلا

دل آگاہ سے کیا کام ہمیں اب ہیں بس — وہ بھی قسمت سے چراغ تہ داماں نکلا

دل بھی تھا منہ سے بس اک آہ نکل جانے تک — آگ سینہ میں لگا کر غم پنہاں نکلا

چارہ گر، ناصح مشفق، دل بے صبر و قرار — جو ملا عشق میں غمخوار وہ ناداں نکلا

شکوہ منظور نہیں تذکرۂ عشق نہ چھیڑ — کہ وہ در پردہ مرا حال پریشاں نکلا

بجلیاں شاخ نشیمن پہ بچھی جاتی ہیں — کیا نشیمن سے کوئی سوختہ ساماں نکلا

اب جنوں سے بھی توقع نہیں آزادی کی — چاک داماں بھی باندازۂ داماں نکلا

ہائے وہ وعدۂ فردا کی مدد وقت اخیر — ہائے وہ مطلب دشوار کہ آساں نکلا

شوق بیتاب کا انجام تحیر پایا — دل سمجھتے تھے جسے دیدۂ حیراں نکلا

اس لئے کیا سینۂ صد چاک سے کھینچا فانی
دل میں کہتا ہوں وہ کہتا ہے کہ پیکاں نکلا

کسی کے ایک اشارے میں کس کو کیا نہ ملا — بشر کو زیست ملی موت کو بہانہ ملا

مذاق تلخ پسندی نہ پوچھ اس دل کا — بغیر مرگ جسے زیست کا مزا نہ ملا

دبی زباں سے مرا حال چارہ ساز نہ کہہ — بس اب تو زہر ہی دے زہر میں دوا نہ ملا

خدا کی دین نہیں ظرف خلق پہ موقوف — یہ دل بھی کیا ہے جسے درد کا خزانہ ملا

دعا گدائے اثر ہے گدا پہ تکیہ نہ کر — کر اعتماد اثر کیا ملا ملا نہ ملا

ظہور جلوہ کو ہے ایک زندگی درکار — کوئی اجل کی طرح دیدہ آشنا نہ ملا

تلاش خضر میں ہوں روشناس خضر نہیں — مجھے یہ دل سے گلہ ہے کہ رہنما نہ ملا

نشان مہر ہے ہر ذرہ ظرف مہر نہیں — خدا کہاں نہ ملا اور کہیں خدا نہ ملا

مری حیات ہے محروم مدعائے حیات — وہ رہگزر ہوں جسے کوئی نقش پا نہ ملا

وہ نامراد ہیں بزم یاس میں بھی نہیں
یہاں بھی فانیؔ آوارہ کا پتا نہ ملا

مجھ کو مرے نصیب نے روز ازل نہ کیا دیا — دولت دو جہاں نہ دی اک دل مبتلا دیا

دل ہی نگاہ ناز کا ایک ادا شناس تھا — جلوۂ برق طور نے طور کو کیوں جلا دیا

قبر میں جب کسی طرح دل کی تڑپ کم ہوئی — یاد خرام ناز نے حشر کا آسرا دیا

معذرت گلہ تو کیا شکر ستم ہی بن پڑا — ہائے کہ دل کے درد نے درد کو دل بنا دیا

اب مری لاش پر حضور موت کو کوستے تو ہیں — آپ کو یہ بھی ہوش ہے کس نے کسے مٹا دیا

دل میں سما کے بھر گئی آس بندھ کے بکھر گئی — آج نگاہ دوست نے کعبہ بنا کے ڈھا دیا

اف کہ گناہگار ہم ہیں تو مگر خطا معاف — آٹھ پہر کے درد نے دل ہی تو ہے دکھا دیا

آپ ہم اپنی آگ میں اے غم عشق جل بجھے — آگ لگے اس آگ کو پھونک دیا جلا دیا

یوں نہ کسی طرح کٹی جب مری زندگی کی رات — چھیڑ کے داستان غم دل نے مجھے سلا دیا

گریۂ آتشیں کی داد دے شب غم تو کون دے — خود سر شام کیا کبھی شمع نے دل بجھا دیا

یاس نے درد ہی نہیں حق تو یہ ہے دوا بھی دی
فانیؔ نا امید کو موت کا آسرا دیا!

آور نہ جانتا ہوں فریب نظر کو میں — دیکھوں الٹ کے پردۂ داغ جگر کو میں

ہر نقش پا کو دیکھ کے دھنتا ہوں سر کہ میں — پہچانتا نہیں ہوں تری رہگزر کو میں

عہد خزاں میں رفتۂ آشوب ہوش ہوں — بھولا ہوا ہوں موسم دیوانہ گر کو میں

گم کردہ راہ ہوں قدم اولیں کے بعد — ٹھہرا ہے پھر مجھے نہ ملا راہ سبک کو میں

وہ پائے شوق دے کہ جہت آشنا نہ ہو — پوچھوں نہ خضر سے بھی کہ جاؤں کدھر کو میں
مانوس انتظار ہوں ممنون اضطراب — ہنستا ہوں دیکھ دیکھ کے دیوار و در کو میں
بہلا نہ دل نہ تیرگیٔ شام غم گئی — یہ جانتا تو آگ لگاتا نہ گھر کو میں
دو تین ہچکیوں میں دم نزع کر گیا — شرح دراز زندگیٔ مختصر کو میں

فانیؔ دعائے مرگ کی فرصت نہیں مجھے
یعنی ابھی تو ڈھونڈ رہا ہوں اثر کو میں

فانیؔ کف قاتل میں شمشیر نظر آئی! — لے خواب محبت کی تعبیر نظر آئی
پھر ابر میں وحشت کی تصویر نظر آئی — لہرائی ہوئی بجلی زنجیر نظر آئی
جب میں نے دعاؤں کا رخ سوئے فلک دیکھا — تدبیر کے پہلو میں تقدیر نظر آئی
جو دل سے نکل آئی وہ آہ سناں نکلی — جو ڈوب گئی دل میں وہ تیر نظر آئی
ہر عیش کی محفل میں پروانہ کا ماتم تھا — جو شمع نظر آئی دلگیر نظر آئی
کعبہ میں کلیسا میں ہم نے تو جہاں دیکھا — اے قصر وفا تیری تعمیر نظر آئی
جب خون ہوا دل کا وہ آنکھوں میں آ بیٹھے — آہوں کا حجاب اٹھا تاثیر نظر آئی
کایا غم دنیا کی وحشت نے پلٹ دی ہے — خاک رہ ویرانہ اکسیر نظر آئی
دنیا کی بلاؤں کو جب جمع کیا میں نے — دھندلی سی مجھے دل کی تصویر نظر آئی
دل ان کے نہ آنے تک لبریز شکایت تھا — وہ آئے تو اپنی ہی تقصیر نظر آئی

فانیؔ غم ہستی نے زندہ ہی مجھے سمجھا
جب تک مرے مرنے میں تاخیر نظر آئی

قطرہ دریائے آشنائی ہے — کیا تری شان کبریائی ہے

تیری مرضی جو دیکھ پائی ہے　　خلشِ درد کی بن آئی ہے

وہم کو بھی ترا نشاں نہ ملا　　نارسائی سی نارسائی ہے

کون دل ہے جو دردمند نہیں　　کیا ترے درد کی خدائی ہے

جلوۂ یار کا بھکاری ہوں　　شش جہت کاسۂ گدائی ہے

موت آتی ہے تم نہ آؤ گے　　تم نہ آئے تو موت آئی ہے

بجھ گئے راہ یار میں کانٹے　　کس کو عذرِ برہنہ پائی ہے

ترکِ امید بس کی بات نہیں　　ورنہ امید کب بر آئی ہے

مژدۂ جنتِ وصال ہے موت　　زندگی محشرِ جدائی ہے

آرزو پھر ہے در پئے تدبیر　　سعیِ ناکام کی دہائی ہے

موت ہی ساتھ دے تو دے فانیؔ

عمر کو عذرِ بے وفائی ہے!

مر کر مریضِ غم کی وہ حالت نہیں رہی　　یعنی وہ اضطراب کی صورت نہیں رہی

ہر لمحۂ حیات رہا وقفِ کارِ شوق　　مرنے کی عمر بھر مجھے فرصت نہیں رہی

اک نالۂ خموش مسلسل ہے اور ہم　　یادش بخیر ضبط کی طاقت نہیں رہی

یوں مٹ گئی وفا کہ زمانہ کا ذکر کیا　　اب دوست سے بھی کوئی شکایت نہیں رہی

وہ عہدِ دلفریبیِ تاثیر اب کہاں　　مدت سے آہ آہ کی حسرت نہیں رہی

ان کے تو دل سے نقشِ کدورت بھی مٹ گیا　　ہم شاد ہیں کہ دل میں کلفت نہیں رہی

دل ہو رہا ہے سلسلہ جنبانِ نشاط　　کیوں پاسِ وضعِ غم تجھے غیرت نہیں رہی

اے دردِ عشق اب تو خدا کے لیے نہ چھیڑ　　دل میں کراہنے کی بھی طاقت نہیں رہی

ہر بے گنہ سے وعدۂ بخشش ہے روزِ حشر — گویا گناہ کی بھی ضرورت نہیں رہی

اے عرضِ شوق مژدہ کہ دل چاک ہو گیا — تکلیفِ پردہ داریٔ حسرت نہیں رہی

پتھرا گئی تھی آنکھ مگر بند تو نہ تھی ! — اب یہ بھی انتظار کی صورت نہیں رہی

عبرت نے بیکسی کا نشاں بھی مٹا دیا — اڑتی تھی جس پہ خاک وہ تربت نہیں رہی

محشر میں بھی وہ عہدِ وفا سے مکر گئے — جس کی خوشی تھی اب وہ قیامت نہیں رہی

کس منہ سے غم کے ضبط کا دعویٰ کیے کوئی — طاقت بقدرِ حسرتِ راحت نہیں رہی

فانیؔ امیدِ مرگ نے بھی دے دیا جواب
جینے کی ہجر میں کوئی صورت نہیں رہی

تاکید ہے کہ دیدۂ دل وا کرے کوئی — مطلب یہ ہے کہ دور سے دیکھا کرے کوئی

آئے ہی تیرے وعدۂ فردا کا اعتبار — گھبرا کے مر نہ جائے تو پھر کیا کرے کوئی

وہ جلوہ بے حجاب سہی ضد کا کیا علاج — جب دل ہی روک کے آنکھ سے پردا کرے کوئی

کہتے ہیں حسن ہی کی امانت ہے دردِ عشق — اب کیا کسی کے غم کا دعویٰ کرے کوئی

خالی ہے بزمِ ذوقِ طلب اہلِ ہوش سے — ایسا نہیں کہ میری تمنا کرے کوئی !

وہ درد دے کہ موت بھی جس کی دوا نہ ہو — اس دل کو موت دے جسے اچھا کرے کوئی

فانیؔ دعائے مرگ کی تکرار کیا ضرور !
غافل نہیں کہ ان سے تقاضا کرے کوئی

دنیا میری بلا جانے مہنگی ہے یا سستی ہے
موت ملے تو مفت نہ لوں ہستی کی کیا ہستی ہے

آبادی بھی دیکھی ہے ویرانے بھی دیکھے ہیں

جو اجڑے اور پھر نہ بسے دل وہ نرالی بستی ہے

خود جو نہ ہونے کا ہو عدم کیا اسے ہونا کہتے ہیں
نیست نہ ہو تو ہست نہیں یہ ہستی کیا ہستی ہے

عجز گناہ کے دم تک ہیں عصمت کامل کے جلوے
پستی ہے تو بلندی ہے راز بلندی پستی ہے

جان سی شے بک جاتی ہے ایک نظر کے بدلے میں
آگے مرضی گاہک کی ان داموں تو سستی ہے

وحشت دل سے پھرنا ہے اپنے خدا سے پھر جانا
دیوانے یہ ہوش نہیں یہ تو ہوش پرستی ہے

جگ سونا ہے تیرے بغیر آنکھوں کا کیا حال ہوا
جب بھی دنیا بستی تھی اب بھی دنیا بستی ہے

آنسو تھے سو خشک ہوئے جی ہے کہ امڈا آتا ہے
دل پہ گھٹا سی چھائی ہے کھلتی ہے نہ برستی ہے

دل کا اجڑنا سہل سہی بسنا سہل نہیں ظالم
بستی بسنا کھیل نہیں بستے بستے بستی ہے !

فانی جس میں آنسو کیا دل کے لہو کا کال نہ تھا
ہائے وہ آنکھ اب پانی کی دو بوندوں کو ترستی ہے

نہیں کہ وحشت دل چارہ گر نہیں ہے مجھے جنون چارۂ وحشت مگر نہیں ہے مجھے
خراب لذت جانکاہی محبت ہوں مآل عشق سے قطع نظر نہیں ہے مجھے

نہیں یہ مردن دشوار بے سبب یعنی! | یقین مژدۂ مینا میسر نہیں ہے مجھے
جنوں سہی اثر بے خودیٔ غم نہ سہی! | تمہیں خبر ہے کہ اپنی خبر نہیں ہے مجھے
نہ راحت ناخن، نہ خطرۂ سوزن! | مجال بخیۂ زخم جگر نہیں ہے مجھے!
یہ کیا ہے پھر کہ مجھے اک جہاں نظر آیا | خمار بادۂ وحدت اگر نہیں ہے مجھے
یہ جستجو ہے کہ ہے عالم مجاز کہاں | تلاش چشم حقیقت نگر نہیں ہے مجھے

ہلاک تلخیٔ تاثیر شکوہ ہوں فانی
شکایتِ گلۂ بے اثر نہیں ہے مجھے

تبصرہ

زبان

اس دور میں آپ کو کوئی شاعر روایتی استاد کی حیثیت لئے ہوئے
نظر نہ آئیگا۔ فی زمانہ یہ خیال ہوتا جاتا ہے کہ روایتی استادی اور شاگردی
کا زمانہ اب ختم ہوگیا جو علوم و فنون اساتذہ کے سینوں میں چھپے ہوئے تھے اور
جن کے حصول کے لئے ان کے روبرو زانوئے تلمذ تہ کرنا پڑتا تھا۔ وہ علوم و فنون
اب کتب فروشوں کی دکانوں سے نہایت ارزاں قیمت پر خریدے جا سکتے ہیں
متروکات کی لمبی چوڑی فہرست اور توضیح قواعد و قوانین کا اب زمانہ نہیں رہا
شخصی سعی و کوشش کی قدر و قیمت نہیں رہی۔ اب رنگ زمانہ جگت استاد ہے
مدعا یہ ہے کہ شعراء کی توجہ اصلاح زبان کی طرف نہیں۔ اس کی وجہ یا تو یہ ہے
کہ اساتذہ متوسطین کے احسانات سے زبان منجھ کر اس قدر صاف ہو چکی ہے
کہ اب مزید اصلاح کی حاجت نہیں رہی۔ یا یہ وجہ ہو سکتی ہے کہ شعرا کا رجحان

زیادہ تر تخیل کی بلندی اور مضمون کی ندرت کیطرف ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جذبات کی صداقت، تخیل کی بلندی اور کلام کا جوش وخروش خود بخود زبان کی اصلاح کرتا رہتا ہے۔

بہرکیف زبان کی کچھ نہ کچھ ترقی اس دور میں بھی نظر آتی ہے۔ مغربی اثر اور سائنس اور فلسفہ کی جہانگیری سے خیالات کی دنیا متاثر ہوئی۔ خیالات کا تاثر زبان پر اثر انداز ہوا جس کی وجہ سے زبان میں ادائے مطالب کی وسعت بڑھنی شروع ہوئی۔ موجودہ شعراء کا خیال ہے کہ ادائے مطالب کی وسعت اور افزائش حسن کی صلاحیت جس قدر فارسی تراکیب میں ہے اور کسی زبان میں نہیں لہذا یہ دور فارسی تراکیب کے اعتدال سے بڑھے ہوئے استعمال کے لئے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ فارسی تراکیب سے زبان میں جو وسعت، جو حسن اور نزاکت پیدا ہوگئی ہے۔ وہ محتاج بیان نہیں فارسی تراکیب کے استعمال میں بے اعتدالیاں بھی ہو رہی ہیں لیکن جو فطری شاعر ہیں ان کا کلام اعتدال کی عمدہ مثال ہے

اصناف سخن | فی زمانہ اگرچہ نظموں کی کمی نہیں۔ ادبی رسائل میں ان کی بھرمار ہے لیکن مجھے ان نظموں سے کسی شاندار مستقبل کی توقع نہیں ناچیز کے نزدیک اس دور کی غزل تمام اصناف سخن پر بھاری ہے۔ اور یہی اس دور کی خاص صنف ہے۔

موضوع سخن | غزل کا خاص موضوع اگرچہ حسن وعشق ہی ہے لیکن حسن حسن مطلق ہے اور عشق عشق حقیقی۔ جذبات میں صداقت

ہے اور واردات میں اصلیت، تصوف اور فلسفہ بھی اس دور کا خاص موضوع ہے
لیکن حقائق و معارف کے بیانات میں شاعرانہ لطافتیں موجود ہوتی ہیں۔
حیات انسانی اور نفسیات کا گہرا مطالعہ بھی اس دور کی خصوصیت ہے۔

اسالیب بیان فرسودہ مضامین اور عامیانہ انداز بیان اس دور میں مفقود ہے۔ طرز ادا زیادہ تر حکیمانہ ہے لیکن کلام میں خشکی اور بے رنگی نہیں آنے پاتی۔ کیف و سرور اجیودی و سرمستی، رنگینی و رعنائی، متانت اور سنجیدگی کے ساتھ ترکیب پاکر کلام میں تڑپ اور اثر پیدا کر دیتی ہے
غزلیں عام طور پر اس طرح لکھی جاتی ہیں کہ چاہے انہیں مجازی معنوں میں سمجھو چاہے حقیقی معنوں میں۔ اور یہ اس دور کا خاص اسلوب بیان ہے۔
اس اسلوب نے عشق مجازی اور عشق حقیقی کو ایک کر کے دکھا دیا ہے۔ اس دور کی شاعری کا لب و لہجہ متین اور مہذب ہے آپ آجکل کے اشعار کو سوسائٹی میں بلا تکلف پڑھ کر سنا سکتے ہیں۔ غرض اس دور کے اسلوب بیان نے غزل کو بہت بلندی پر پہنچا دیا ہے۔

نتیجہ غالب نے غزل کی زمین میں جو تخم بویا تھا۔ موجودہ زمانہ میں وہ سرسبز و شاداب پودا ہی نہیں بن گیا ہے بلکہ بار آور بھی ہو رہا ہے۔ اردو شاعری کی معرکۃ الآرا صنف یعنی غزل اس دور میں معراج کمال پر پہنچ گئی ہے۔ ایک زمانہ میں جو اس کی طرف سے بدگمانی پیدا ہو گئی تھی۔ اس وقت وہ بدگمانی خوش اعتقادی سے بدل چلی ہے اور یقین ہوتا جاتا ہے۔ کہ غزل ہی تمام اصناف کی سرتاج ہے۔

باب ۱۲

عہد حاضرہ کے نظم نگار شعراء

تمہید عہد حاضر کی نظموں کے بے پایاں دفتر پر اگر غور سے نظر کی جائے تو اسکو صوری اور معنوی حیثیت سے پانچ حلقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے

۱۔ تخیلی نظمیں۔

۲۔ سادہ نظمیں، موضوع، خیال اور طرز ادا تینوں سادہ۔

۳۔ حسن جذباتی نظمیں۔

۴۔ عاشقانہ (رومانی) نظمیں۔

۵۔ { ا۔ تحریکی نظمیں۔
ب۔ آزاد نظمیں۔ }

یہ تقسیم میرے ذاتی غور و مطالعہ کا نتیجہ ہے میں اس امر کا دعویدار نہیں ہوں کہ اس تقسیم میں ترمیم و اضافے کی گنجائش نہیں میری رائے ہے کہ تخیلی نظم نگاروں کے نمائندے حضرت سیماب اکبرآبادی مرحوم ہیں اور باقی تین گروہوں کے نمائندے علی الترتیب افسر میرٹھی، حفیظ جالندھری اختر شیرانی مرحوم ہیں۔ آخری گروہ یعنی تحریکی اور آزاد نظم نگاری کے نمائندے دو شاعر ہیں۔ تحریکی نظموں کے نمائندے حضرت جوش ہیں اور آزاد نظم نگاری کے ایک

فیض احمد فیض جو غزلیں بھی لکھتے ہیں اور نیم آزاد نظمیں بھی۔ اور دوسرے مسٹر نذر محمد راشد جو قطعی آزاد ہیں۔

یہاں یہ امر واضح کر دینا بھی غیر مناسب نہ ہوگا کہ نظم نگار حضرات کی بارونق مجلس میں جو شعرا صدر نشین ہیں انہیں غزل سے لگاؤ نہیں رہا ہے بلکہ ان میں سے بیشتر شعرا کی ادبی زندگی کا آغاز غزلگوئی ہی سے ہوتا ہے۔ بعض نظم نگار شعرا تو غزل گوئی میں استادانہ حیثیت کے مالک ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ اہل ذوق ناقدین نے ان کی نظموں کو غزلوں پر ترجیح دی اور انہیں نظم گو شعرا کی حیثیت سے پسند کیا اور سراہا۔

سیماب اکبرآبادی

حضرت سیماب کے مندرجہ ذیل مختصر سوانح حیات نگار بابت ماہ جنوری و ماہ فروری ۱۹۴۱ء سے اخذ کیے گئے ہیں۔

شیخ عاشق حسین صاحب سیماب اکبرآبادی جمادی الثانی ۱۲۹۹ھ مطابق ۱۸۸۰ء بروز دوشنبہ بمقام اکبرآباد (آگرہ) پیدا ہوئے۔ آپ کے والد محمد حسین اجمیر شریف میں ٹائمس آف انڈیا پریس کی شاخ کے افسر اعلیٰ تھے۔

شاعری مولانا سیماب کا فطری ذوق اور موروثی میراث ہے۔ آپ کی عمر ۱۷ سال کی تھی کہ والد کا انتقال ہو گیا چنانچہ آپ کو مجبوراً فارغ التحصیل ہونے سے قبل ہی کالج چھوڑ دینا پڑا۔ بیس سال کی عمر میں شادی ہوئی اور بسلسلہ معاش آپ کو کانپور جانا پڑا وہاں لکھنؤ کے شعرا خصوصاً جلال لکھنوی کا طوطی بول رہا تھا مگر چونکہ سیماب کا رجحان طبع شعرائے دہلی کی طرف تھا لہٰذا آپ نے ۱۸۹۸ء میں داغ دہلوی سے شرف تلمذ حاصل کیا جن کی مشفقانہ نصیحت اور شاعرانہ مشورے

آپ نے مشق سخن جاری رکھ کر جلد ہی پختگی کلام کے مدارج طے کئے۔

مولانا کو تصوف سے بھی ذوق تھا۔ چنانچہ آپ حضرت حاجی حافظ سید شاہ وارث علی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت تھے۔

قیام کانپور کے بعد آپ بسلسلہ ملازمت اجمیر شریف لے گئے اور وہاں کچھ عرصہ تک مقیم رہے۔ بعد ازاں اپنے وطن پہنچ کر رسالہ "مرصع" کی ادارت کی وہاں سے ٹونڈلہ (ضلع آگرہ) پہنچے جہاں ملازمت کے ساتھ ساتھ آگرہ اخبار کی ادارت کرتے رہے۔

۱۹۲۹ء میں آپ نے سلسلہ ملازمت کو قطع کر دیا۔ اور ادبی خدمات کے لئے خود کو وقف کرکے اپنے وطن آگرہ میں مستقل اقامت اختیار کی۔

تقسیم ہندوستان اور قیام پاکستان کے بعد آپ کچھ عرصے تک دہلی مقیم رہے اور بعد ازاں کراچی تشریف لے آئے۔ دوران قیام کراچی میں آپ ریڈیو پاکستان سے روزانہ "اردو مصادر" کے عنوان سے تقریر نشر فرماتے تھے۔ جو کہ انکم اہل پاکستان کے لئے بہت مفید ہوتی تھی۔ مگر یہ سلسلہ زیادہ مدت تک جاری نہ رہ سکا۔ آخر ۱۳ جنوری ۱۹۵۱ء کو بمقام کراچی داعی اجل کو لبیک کہا۔

آپ کے مندرجہ ذیل مجموعے شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔
کارامروز "کلیم عجم" "تبستان" ان کے علاوہ "الہام منظوم" کے نام سے مثنوی مولانا جلال الدین رومی کا اردو ترجمہ بھی آپ نے شائع کیا ہے۔

حضرت سیماب کا شمار اردو شاعری کے مشہور اساتذہ میں ہوتا ہے۔ آپ نہایت پرگو اور مشاق شاعر تھے۔ اگرچہ آپ نے شاعری کا آغاز غزل ہی سے کیا۔

مگر آپ کا کلام تقلید اور فرسودگی کے عام عیب سے ہمیشہ پاک رہا۔ آپ کی غزلیات
میں جدتِ خیال اور طرزِ ادا میں شاعرانہ متانت ہوتی ہے اور زور اور اثر سے معمولی
معمولی باتوں میں اثر پیدا کر دیتے ہیں۔ جدید رنگ کی نظموں میں آپ دور
حاضرہ کے شعراء میں استادانہ حیثیت کے مالک تھے۔ آپ نے عصرِ جدید
کے تمام تحریکی مسائل پر اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ آپ کی نظموں کے متعلق
صرف اس قدر عرض کر دینا کافی ہے کہ ان میں پختگی اور متانت، صفائی اور سادگی
بدرجہ احسن موجود ہوتی ہے۔ لیکن اثر کی نمایاں کمی محسوس ہوتی ہے۔ اس لئے
کہ آپ بجائے پرسوز جذبات کے پاکیزہ تخیل سے زیادہ کام لیتے ہیں۔

نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

آزادی

وہ اک حورِ مجسم، صد بہار و صد چمن بردر
نشاطِ دو جہاں در دل، حیاتِ انجمن در بر

سیاہ و ست لمبے بال، پیچ و خم سے بیگانہ
نشیلی انکھڑیاں لیکن مذاقِ سم سے بیگانہ

نگاہیں آسماں کی رفعتوں پر جھومنے والی
جبینِ صاف معراجِ افق کو چومنے والی

خلش گل کی جگر میں اور دل میں ولولے کا
ادھر اک ہاتھ میں مسجد ادھر گنبد شوالے کا

زباں پر نغمۂ ناقوس سے تنویر کی موجیں
لبِ گلرنگ پر مچلی ہوئی تکبیر کی موجیں

ہمالہ کا پری اور طور کا اک جلوۂ رعنا
جو اس کی اک نظر زمزم تو اسکی اک نظر گنگا

غریبوں اور مزدوروں سے ہنس کر بولنے والی
یتیموں اور بیواؤں کے عقدے کھولنے والی

مساوات و رواداری کے جذبے پاک جوبن میں
وفاداری کی دلداری کے نقشے چلبلے پن میں

فضا کی وسعتوں میں اڑنے والی اک ردا سر پر	اوڑھنی نیلی لہرانے والی ہواؤں کے سمندر پر
تعصب و نفرت کے بہوے دست و پا تنگیں	وفا کے رنگ سے ہر عشوہ رنگیں ہر ادا رنگیں
تنفس میں ہیں نکہات اس کے بزم میں حیات اسکے	تکلم گلستاں سکا جلوہ میں گلستاں اس کے
سکوں برسا ہوا اسکے تبسم سے محبت کا	شگفتہ تیوروں میں موجزن دریا صداقت کا
سطح حسن لرزاں اسکے فردوسی اشاروں میں	بہار افروز پھولوں میں صباحت رہتا دامن میں
زمین و آسماں اسکے حریم ناز کے آنگن	مہ و خورشید سے اسکی بساط انجمن روشن
چمن اس کے بیاباں اسکے کوہ و آبشار اسکے	سمندر اسکے میداں اس کے امصار و دیار اسکے
وہ فطرت سے براہ راست رشتہ جوڑنے والی	غلامی اس کے پائے ناز پر دم توڑنے والی
وہ شہزادی ہے من اسکی محبت کا بھکاری ہوں	وہ آزادی کی دیوی اور من اسکا پجاری ہوں

۲۔ حامد اللہ افسر میرٹھی

حامد اللہ نام۔ افسر تخلص۔ میرٹھ وطن مالوف ہے اور ممتاز مفتی خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ سن پیدائش ۱۸۹۸ عیسوی ہے۔ عربی و فارسی کی تعلیم مدرسہ عالیہ عربیہ میں حاصل کی اور انگریزی کی تکمیل میرٹھ کالج اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ہوئی۔ آپ کو فارسی زبان سے بچپن ہی سے خاص مناسبت تھی اور اب تک اسی زبان کی کتابیں اکثر مطالعہ میں رہتی ہیں۔

حضرت افسر کو لڑکپن ہی سے شعر و شاعری کا ذوق تھا۔ چنانچہ زمانہ طالب علمی کی ایک نظم بعنوان "گرمی کی چھٹیاں" ملاحظہ ہو

مشکل سے پھر اسکول نہ جانے کے دن آئے
بے فکری سے پھر وقت گنوانے کے دن آئے
پھر رات کو چھپ چھپ کے ڈرانے کے دن آئے

سہمے ہوئے لوگوں کو بنانے کے دن آئے
پھر بیٹھ کے طبلہ سا بجانے کے دن آئے
پھر لیٹ کے تنہائی میں گانے کے دن آئے

کر دی تھی کتابوں نے ہماری تو زباں بند
گھر بھر میں اب اک شور مچانے کے دن آئے

اب وقت کا رونا نہیں اب وقت بہت ہے
ہر کام میں کچھ دیر لگانے کے دن آئے!
گھر پر بھی تھے گھبرے ہوئے اسکول کے دھندے
آزادی سے اب موج اڑانے کے دن آئے

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ابتداءً آپ کچھ مدت تک اخبار نویسی کرتے رہے۔ آخر گورنمنٹ کالج لکھنؤ میں لکچرار مقرر ہوگئے جہاں آپ اپنے فطری ذوق مناسبت کے ساتھ درس و تدریس اور ادبی خدمات میں مصروف ہیں۔

آپ کی تصانیف میں سے چند یہ ہیں:۔
تپام روح، نظموں اور غزلوں کا مجموعہ "جوئے رواں" نظموں اور غزلوں کا دوسرا مجموعہ "ڈالی کا جوگ" اور "پرچھائیاں" یہ دونوں مختصر افسانوں کے مجموعے ہیں "نوریں" ادبی اور تنقیدی مقالات اور "نقد الادب" فن تنقید پر ایک مبسوط کتاب ہے۔

ان کے علاوہ آپ ایک طویل نظم لکھ رہے ہیں آپ نے اس نظم کا نام "آدم نامہ" رکھا ہے۔ اس نظم کا موضوع یہ ہے کہ حضرت آدم کے وقت سے اس وقت تک انسان کی اصلاح و درستی کے لئے کیا کیا کوششیں ہوئیں۔

اور ان کوششوں سے اس لئے کیا کیا فائدہ اٹھایا۔ اس نظم کے ایک ہزار سے زیادہ اشعار لکھے جا چکے ہیں۔

سادگی، لطیف موسیقیت، نرم اور مترنم طرزادا، جذبات نگاری اور مناظر قدرت کی عکاسی آپ کے کلام کی خصوصیات ہیں۔ اور ان ہی خصوصیات کی وجہ سے آپ کو ہمعصر شعرا میں خاص امتیاز حاصل ہے۔ آپ کا دل وطن کی محبت سے لبریز ہے۔ آپ کے وطنی نغمے اپنی موسیقیت اور والہانہ شیفتگی کی وجہ سے اپنے اندر ایک عجیب کیفیت رکھتے ہیں۔

نمونہ کلام ملاحظہ ہو:۔

جن کو ہر حالت میں خوش اور شادماں پاتا ہوں میں
ان کے گلشن میں بہار بے خزاں پاتا ہوں میں

اللہ اللہ موجزن ہے کس قدر بحر حیات
دل میں ہر ذرہ کے رقصاں اک جہاں پاتا ہوں میں

کچھ تو بتلا کیا مآل علم و حکمت ہے یہی
زنگ آلودہ تری دانائیاں پاتا ہوں میں

کیسی حیرت ہے کہ خود ان کو ہے مزدوری سے عار
جن کو مزدوروں کے حق میں تر زباں پاتا ہوں میں

بھیجتے ہیں لعنتیں جو اہل زر پہ خود انہیں
اہل زر کے در پہ خم مثل کماں پاتا ہوں میں

وعظ کہتے ہیں محبت کے مودت کے جو روز

گھر میں خود اپنے انہیں چنگیز خاں پاتا ہوں میں
دیکھتا ہوں کوچہ ہائے معصیت میں گھومتے
بر سر ممبر جنہیں رطب اللساں پاتا ہوں میں
صبح کی منزل کا تاروں سے پتا کیا پوچھنا
ظلمت شب کا رواں در کارواں پاتا ہوں میں
چاند کے اس پار۔ سورج سے ادھر تاروں سے دور
رقص کرتے روز و شب لاکھوں جہاں پاتا ہوں میں

یہ دلنواز نغمے جنگل کی خامشی میں | لرزہ سا آرہا ہے تاروں کی روشنی میں
للہ یہ بتا دے اے جذبۂ محبت | کیا حسن ہے خدا میں کیا عیب آدمی میں

بزم میں تیرے کوئی بیخود کوئی مدہوش ہے | او نشیلی آنکھ والے کچھ تجھے بھی ہوش ہے
سامنے بت ہیں تو رسوائی کا کس کو ہوش ہے | یا الٰہی تو گنہگاروں کا پردہ پوش ہے
بزم میں ان مدھ بھری آنکھوں کو گردش دے مگر | اس کا اندازہ تو کر لے کس کو کتنا ہوش ہے
جرأت دیدار کیسی تاب نظارہ کہاں | آرزوئے دید تمہید وداع ہوش ہے
یہ نظر کی جنبشیں یہ چال اٹھلاتی ہوئی | کچھ تمہیں بھی آج اپنی بیخودی کا ہوش ہے

۳۔ خانصاحب ابوالاثر حفیظ جالندھری
آپکے خودنوشتہ سوانح حیات "نگار" بابت

جنوری و فروری ۱۹۴۱ء میں درج ہیں۔ ان سے اخذ کر کے یہ چند سطور پیش کی جاتی ہیں
آپ کا خاندان کوئی دو سو برس پیشتر جو ہاں راجپوت کہلاتا تھا۔ آپ کے بزرگوں
نے اسلام قبول کیا۔ جالندھر کو آپ کی وطنیت پر فخر ہے۔
ابتدائی تعلیم بے قاعدہ اور غیر مسلسل رہی اور بعد منقطع ہو گئی کم عمری ہی میں تفکرات
زمانہ نے آپ کو گھیر لیا تھا۔ خانگی اور مالی مشکلات میں گھرے رہنے کے باوجود آپ نے
غیر معمولی استقلال کا ثبوت دیا۔ شاعری کا شوق ابتدا سے تھا۔ چنانچہ آپ نے
علامہ نادر گرامی جالندھری سے مشورہ سخن کیا۔ ۱۹۲۲ء تک آپ نے کسب
معاش کے سلسلے میں بہت جد و جہد کی لیکن فراغت نصیب نہ ہوئی آخر آپ
نے لاہور میں مستقل قیام کیا۔ اور ادب و شعر ہی کو اپنا واحد پیشہ قرار دیا۔
اللہ تعالیٰ نے آپ کو شاید اسی اہم کام کے لئے پیدا کیا تھا۔ چنانچہ اسی کی بدولت
آپ کو فراغت اور اطمینان کے دن میسر آئے۔ آجکل آپ عارضی طور پر دہلی میں
مقیم ہیں اور حکومت ہند کے محکمہ پراپیگنڈا میں ایک اعلیٰ عہدہ پر
فائز ہیں۔[1]

خوف ہے کہ کہیں یہ ملازمت رگوں رنگی ہے آپ کی شاعری کی راہ میں دشوار
گذار گھاٹی بن کر نہ رہ جائے۔ اگر آپ نے اس گھاٹی کو تحیر و عافیت عبور کر
لی۔ تو گویا آپ کی شاعری اللہ کے گھر سے پھری۔
آپ کی نظموں کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں ایک "نغمہ زار" اور دوسرا
"سوز و ساز" اس کے علاوہ آپ ایک عظیم الشان کام بھی کر رہے ہیں۔ لیعنی

[1] قیام پاکستان کے بعد حکومت پاکستان نے آپ کو وہی عہدہ عطا کیا جو ہندوستان میں حاصل تھا

"شاہنامہ فردوسی" کے مقابلے میں "شاہنامۂ اسلام" تصنیف فرما رہے ہیں جس
کی تین جلدیں شائع ہو چکی ہیں

اپنی شاعرانہ جدوجہد کے متعلق آپ خود رقم طراز ہیں کہ اردو نظم میں نئی نئی
اختراعیں کی ہیں۔ گیت لکھے ہیں۔ مناظر قدرت کی مصوری کی ہے۔ کھورداوران
میں تصرفات کئے ہیں بچوں کے لئے شاعری کی ہے"۔

آپ کی شاعری کا جوہر خصوصی رنگینی اور ترنم ہے۔ آپ کے کلام میں جذبات کی
فراوانی ہے لیکن اس میں اقبال کی سی گہرائی نہیں۔ وہ حسن میں حسرت آگیں بھی
ہیں ماتم انگیز بھی۔ لیکن انکا مجدد یا نہیں۔ توتا "شاہنامہ اسلام" آپ کی معرکۃ الآراء
تصنیف ہے جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ یہ گویا اسلامی تاریخ ہے لیکن نہایت
مختصر "شاہنامہ فردوسی" کی طرح یہ رزمیہ نظم نہیں ہے۔ بلکہ اس کا شمار بیانیہ شاعری
کے ذیل میں ہوتا ہے "شاہنامہ اسلام" میں بلند اور پست قسم کی شاعری میں
توازن قائم نہیں رہ سکا ہے۔ کہیں کہیں اصلی شاعری کے نمونے ملتے ہیں
لیکن عام طور پر شاعری کی سطح کچھ بلند نہیں ہو سکی ہے۔ بحر ہزج مثمن
سالم جو اس مثنوی کے لئے انتخاب کی گئی ہے۔ گو بہت رواں اور مترنم ہے
لیکن مسلسل بیانیہ شاعری کے لئے وہ اپنی طوالت کی وجہ سے زیادہ موزوں
نہیں معلوم ہوتی ۔ آپ سے پہلے کسی نے اس بحر میں مثنوی نہیں لکھی۔
بحر کا بیت بھرنے کے لئے جابجا حشو و زوائد سے کام لینا پڑتا ہے جس کی وجہ
سے ایجاز بیان کی راہ میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ حفیظ بڑے ہوشیار
مرقع کار ہیں۔ انہوں نے ان مشکلات کو بڑی حد تک رفع کیا ہے۔ تاہم

عقود زوائد سے ہر جگہ دامن نہیں بچا سکے ہیں
بطور نمونہ "شاہنامہ اسلام" کا کچھ حصہ پیش کیا جاتا ہے۔

معرکۂ بدر

فضائے بدر کو اک آپ بیتی یاد ہے اب تک — یہ وادی نعرۂ توحید سے آباد ہے اب تک
مہ و انجم یہ اس مٹی کے ذرے مسکراتے ہیں — زبان حال سے ماضی کے افسانے سناتے ہیں
پلٹ کر اس جگہ شیطان آیا ہی نہیں اب تک — فرشتوں کی زیارتگاہ ہے یہ سرزمیں اب تک
یہاں ہر صبح روشن پرتو خورشید ایماں سے — یہاں ہر شام رنگیں غازۂ خون شہیداں سے
جو دیکھا اس کی آنکھوں نے وہ کب افلاک نے دیکھا — حق و باطل کا پہلا معرکہ اس خاک نے دیکھا
مرے پیش نظر کوئی کہانی ہے نہ قصہ ہے — یہ قرآنی بیاں تاریخ کا زریں حصہ ہے
خدا کے بالمقابل جمع کر کے اک خدائی کو — اٹھے تھے پہلوانان عرب زور آزمائی کو
فریبی قوم کو لے کر چلا شیطان مکے سے — مدینے کی تباہی کو اٹھا طوفاں مکے سے
یہ مشرک جا رہے تھے حق پرستی کے مٹانے کو — یہ آندھی چل رہی تھی شمع ہستی کے بجھانے کو
یہ تمسخر ہیں یہ خنجر یہ تبر یہ تیر یہ بھالے — یہ سب مردان جنگی اونچی اونچی کلغیوں والے
یہ آہن پوش اسوار اور زرہ پہنے ہوئے گھوڑے — یہ ریشم کی کمندیں لوہے ہیں گو بندھے ہوئے کوڑے
یہ اونٹوں کی قطاریں یہ رسد یہ خیمہ و خرگاہیں — ہزار انساں جن کے خوف سے مسدود تھیں راہیں
یہ مکے سے چلے تھے اور مدینہ پر چڑھائی تھی — ادھر نام خدا تھا اس طرف ساری خدائی تھی

لشکر اسلام کا ورود

زمیں بدر تک جب آ گیا سیل سبک کاری

مدینے سے اٹھا نور خدا بہر جنیسا باری
مبارک جمعہ کا دن سترھویں تھی ماہ رمضاں کی
شہادت گاہ میں فوج آن پہنچی اہل ایماں کی

عجب انداز سے آئے خدا کے بوجھے والے
زبانیں خشک، پوستا کیں دریدہ، پاؤں میں چھالے
یہ اس قربان گہ میں آج پیدل چل کے آئے تھے
بہا کر اوس میں اور دھوپ میں جل جل کے آئے تھے

نہ ان کے پاس تلواریں نہ ان کے پاس ڈھالیں تھیں
نہ غلہ ان کے اونٹوں پر نہ پانی کی پکھالیں تھیں
علم خورشید کا ان کے سروں پر سایہ افگن تھا
کہ یہ ایک ایک چہرہ نور عرفانی کا مخزن تھا

مئے وحدت سے قلب مطمئن سرشار تھا ان کا
کہ سردار دو عالم قافلہ سالار تھا ان کا
ان ہی کا فرض تصویر وفا میں رنگ بھرنا تھا
رگ ہستی کو اپنے خون سے سیراب کرنا تھا

نہیں تھا تین سو تیرہ سے آگے تک شمار ان کا
سنا یہ ہے کہ ان کے ساتھ تھا پروردگار ان کا

۴۔ اختر شیرانی

محمد داؤد خاں نام۔ اور اختر تخلص تھا۔ ۱۹۰۶ء میں بمقام ٹونک پیدا ہوئے۔ آپ کے والد

پروفیسر حافظ محمود خاں شیرانی اسلامیہ کالج اور اورنٹیل کالج لاہور کے پروفیسر اردو کی حیثیت سے خصوصاً پنجاب میں اردو کے مصنف کی حیثیت سے اچھی خاصی شہرت کے مالک ہیں۔ اختر پنجاب کے ان نوجوان شعراء میں تھے جن کی شاعری کی بنیاد افسانہائے عشق و ہوس پر قائم ہے آپ کی نظموں میں تخییل کی رنگینی اور نزاکت ادا کے ساتھ لطف موسیقیت کی آمیزش نہایت خوشگوار ہوتی ہے حسن پرستی اور نفاست طبع آپ کے کلام کی روح رواں ہے۔

نمونہ کلام یہ ہے۔

اے عشق کہیں لے چل

اے عشق کہیں لے چل اس پاپ کی بستی سے
نفرت گہ عالم سے۔ لعنت گہ ہستی سے
ان نفس پرستوں سے۔ اس نفس پرستی سے
دور اور کہیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

ہم پریم پجاری ہیں۔ تو پریم کنہیا ہے
تو پریم کنہیا ہے۔ یہ پریم کی نیّا ہے
یہ پریم کی نیّا ہے۔ تو اس کا کھویّا ہے
کچھ فکر نہیں لے چل

اے عشق کہیں لے چل

بے رحم زمانے کو اب چھوڑ رہے ہیں ہم
بے درد عزیزوں سے منہ موڑ رہے ہیں ہم
جس آس پہ جیتے تھے اب توڑ رہے ہیں ہم
اب تاب نہیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

حیرت کدہ آزاد افکار کا دشمن ہے!
احرار کا مدفن ہے اسرار کا دشمن ہے!
اشرار کا مسکن ہے اخیار کا دشمن ہے
چل یاں سے کہیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

آنکھوں تلے پھرتی ہے اک خواب نما دنیا
تاروں کی طرح روشن مہتاب نما دنیا
للہ وہیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

سنسار کے اس پار اک اس طرح کی بستی ہو
جو قرنوں سے انساں کی صورت کو ترستی ہو
اور جس کے مناظر پہ تنہائی برستی ہو
یوں ہو تو وہیں لے چل

اے عشق کہیں لے چل
ان چاند ستاروں کے بکھرے ہوئے شہروں میں
ان نور کی کرنوں کی ٹھہری ہوئی لہروں میں
ٹھہری ہوئی لہروں میں سوئی ہوئی لہروں میں
اے خضر حسیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

ایسی ہی بہشت آئیں وادی میں پہنچ جائیں
جس میں کبھی دنیا کے غم دل کو نہ تڑپائیں
اور جس کی بہاروں میں جینے کے مزے پائیں
لے چل تو وہیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

تحریکی و آزاد نظمیں

اس باب کی تمہید میں عرض کیا گیا ہے کہ حضرت جوش ملیح آبادی تحریکی نظم نگار شعراء کے نمائندے ہیں۔ موصوف کو دور جدید (باب ۱۰) کے سلسلے کی آخری کڑی بھی کہا گیا ہے اور انہیں اسی محفل میں جگہ دی ہے جس کی صدارت حالی اور آزاد کر رہے ہیں۔ یہ اس لئے ہوا کہ جوش کا کلام فن شعر کے اعتبار سے اسی مقام کا مستحق ہے۔ البتہ ان کے کلام کے بعض عناصر ایسے ہیں کہ انہیں تحریکی شاعری کا نمائندہ ہونے کا فخر بھی حاصل ہے۔ اور موجودہ عہد میں ان کو شاعر انقلاب سمجھا جاتا ہے۔

تحریکی شاعری کو ترقی پسندانہ، انقلابی اور آزاد شاعری بھی کہتے ہیں۔ اس

صنف کے موجد یا علم بردار جو اپنے تئیں ترقی پسند شاعر کہتے ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ اب غزل گوئی اور روایتی شاعری کا زمانہ ختم ہوا۔ ہمارے قدیم شعر و ادب کا مقصود بجز تفریح و تفنن کچھ نہ تھا۔ قدیم شاعر ادب برائے ادب کے قائل تھے اور اسی پر عمل پیرا لیکن اب زمانہ بدل چکا ہے آج ہمارے شعراء کو زندگی کے عام مسائل کے حل کی کوششوں میں بھی حصہ لینا چاہیئے۔ اور اپنے ادب کو برائے زندگی بنانا چاہیئے۔

قدیم اور روایتی شاعری کے اعتدال سے بڑھے ہوئے عناصر سے تنفر کوئی نئی چیز نہیں ہے یہ حقیقت ہے کہ اردو شاعری نے عالم طفلی میں فارسی شاعری کا سہارا لیا تھا۔ اور ہوش سنبھال کر بھی اسی کے نقش قدم پر چلی تھی۔ وہی مثنوی تھی، وہی غزل۔ وہ قصیدہ اور وہی رباعی۔ وہی طرز بیان اور وہی نوک پلک۔ لیکن نظیر اکبر آبادی کا ظہور ثابت کرتا ہے کہ غزل کو چھوڑ کر نئی راہوں کی تلاش کا ذوق پیدا ہو چلا تھا۔ نظیر اکبر آبادی اردو کا پہلا ترقی پسند شاعر تھا۔ مگر اس کی ترقی پسندی خارجی اور داخلی دونوں اعتبار سے خالص ہندوستانی ترقی پسندی تھی۔

۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد فارسی کی جگہ انگریزی نے لے لی۔ اور فارسی شاعری کی ہر دلعزیزی کم۔ اور انگریزی شعر و ادب کی ادائیں پسندیدہ ہونے لگیں چنانچہ حالی آزاد اور اسمٰعیل میرٹھی نے نظم نگاری کی راہیں صاف کیں۔ لیکن انہوں نے بھی اردو شعر کی ہیئت کو نہیں بدلا۔ نہ عروض میں دست اندازی کی نہ ردیف وقافیہ میں رخنہ اندازی۔ البتہ ان ہی قدیم شیشوں میں شراب رنگ رنگ کی بھر دی جو اپنی چاشنی اور کیفیت دونوں میں غزل سے بالکل الگ تھی۔

حالی اور آزاد کی ترقی پسندی انگریزی شعر و ادب کی مرہون منت ہے۔ لیکن ان کی نظموں کا رنگ بہت پھیکا اور مزہ سیٹھا سیٹھا سا تھا۔ اقبال نے اس رنگ کو شوخ کیا۔ اس لئے جو کچھ ہمیں دیا وہ ہر لحاظ سے قابل قدر ہے۔ ملاحظہ ہو اقبال کی ترقی پسندی اور انقلاب انگیزی کا یہ انداز ہے۔

گرماؤ غلاموں کا لہو سوز یقیں سے | کنجشک فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی | اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو
سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ ! | جو نقش کہن تم کو نظر آئے مٹا دو !

یا مثلاً ساقی نامہ میں فرماتے ہیں

زمانہ کے انداز بدلے گئے ، | نیا راگ ہے ساز بدلے گئے
پرانی سیاست گری خوار ہے | زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے
گیا دور سرمایہ داری گیا | تماشا دکھا کر مداری گیا
ہمالہ کے چشمے ابلنے لگے ! | گراں خواب چینی سنبھلنے لگے

اقبال حقیقت میں مفکر ہے۔ اور صحیح معنوں میں ہندوستانی ترقی پسند شاعر۔ اس کے کلام میں جہاں فلسفہ، اخلاق، تصوف، مذہب ہے وہاں سیاست بھی ہے۔ اور بغاوت بھی۔ مزدور بھی اور سرمایہ داری بھی۔ بھوک بھی ہے اور روٹی بھی۔ غرض عہد حاضرہ کے جملہ مشرقی مسائل موجود ہیں۔ ان کا احساس بھی اور حل بھی۔ لیکن جو کچھ بھی ہے ساعری کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ اقبال شاعر پہلے تھے اور سب کچھ بعد میں۔ ان کی شاعری میں خیالات، جذبات اور احساسات میں اتنا ہی تنوع ہے۔ جتنا ایک

انسان کے کلام میں ممکن ہے لیکن انہوں نے کہیں اردو شاعری کے فن کو قربان
نہیں کیا۔ انہوں نے کبھی بحور و قوافی کی تنگی داماں کی شکایت نہیں کی۔ انہوں نے
سنگ برنگ کی شراب ان ہی قدیم پیالوں میں پیش کی یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری
پر خاص و عام وجد کرتے رہیں۔

ادھر پنجاب میں اقبال داد شاعری دے رہے تھے ادھر لکھنؤ میں چکبست مصروف
نغمہ سرائی تھے۔ ان کی شاعری میں بھی سب کچھ ہے اور جو کچھ ہے دلفریب ہے اور مؤثر۔
اکبر الہ آبادی نے بھی بہت کچھ کہا، بہت سارا سا ... رسالہ بھی اور شگوفیاں سے گزرتا پایا بھی
لیکن زبان اور فن کو بزرگوں کی میراث سمجھ کر سینے سے لگائے رکھا

ہندوستان سے ہزاروں میل دور مغرب میں سرمایہ داری اور مزدور کی کشمکش کا
آغاز ہو چکا تھا۔ روس میں مزدور کو کامل فتح حاصل ہو چکی تھی۔ ہندوستان کی فضا
بھی اس کشمکش کی اڑائی ہوئی گرد سے محفوظ نہ رہ سکی۔ آزادی کی لگن پہلے ہی کارفرما
تھی۔ بالشویک روس کے حالات نے اس لگن میں سماجی انصاف اور مزدور کے احترام کے
تصور کو اور شامل کر دیا۔ بنگال میں قاضی نذر الاسلام نے باغیانہ شاعری کی اردو
میں جوش ملیح آبادی نے یہ اثر قبول کیا اور وہ اردو کے شاعر انقلاب ہو گئے۔ اور
ملک میں وہ شہرت اور قبول عام حاصل کیا کہ اقبال کے بعد جوش ہی شاعر اعظم
سمجھے گئے۔ اس مقبولیت کی وجہ یقیناً یہ ہے کہ اقبال کی طرح جوش بھی اردو شاعری
کے نبض شناس ہیں۔ انہوں نے نفس شاعری کی بوقلمونی کے باوجود زبان و فن
میں کہیں دخل اندازی نہیں کی۔

اردو شاعروں کی ترقی پسندی آپ نے ملاحظہ کی۔ آپ نے دیکھا کہ اب تک ہمارے

شعراء کی ترقی پسندی انفرادی حیثیت رکھتی تھی ہر شاعر مع اپنے حلقہ اثر کے گویا
ایک مستقل دبستان تھا اور ہر دبستان کا طرز فکر اور مطمح نظر علیحدہ اور مستقل لیکن
ماضی قریب یعنی ۱۹۳۶ء میں ترقی پسندی نے ایک منظم تحریک کی شکل اختیار کی۔ اور
جو شعراء اس تنظیم کے بانی ہوئے وہ ایک سوچے سمجھے اور مقرر کئے ہوئے پروگرام
کے ماتحت شاعری کرنے لگے۔ یہ پروگرام جس پر یہ ادبی تحریک کے آغاز میں اعلان ہوا تھا
"ہماری انجمن کا مقصد یہ ہے کہ ادب اور آرٹ کو دقیانوسیوں سے بچائیں اور فنون
لطیفہ کو عوام کی زندگی سے قریب لائیں تاکہ وہ حقیقتوں کو پیش کرنے کے ساتھ
مستقبل کی دنیا کی طرف ہماری رہبری کریں۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ ہندوستان کے لئے
ادب کو آج ہماری زندگی کے اہم مسائل مثلاً بھوک، غریبی، سماجی پستی اور سیاسی
غلامی سے بحث کرنا چاہئے۔ ہمارے نزدیک وہ تمام ادب جو ہم میں بے حسی اور بیکار بنا
رہا ہے رجعت پسند ہے۔ اور وہ ادب جو ہم میں تنقیدی قوت پیدا کرے
جو عقل کی روشنی میں ہمارے رسم و رواج کی جانچ پڑتال کرے۔ جو ہمارے عمل اور
ہماری تنظیم میں مدد دے ترقی پسند ہے"

ترقی پسند شعراء کے مندرجہ بالا پروگرام کی افادیت سے انکار نہیں ہو سکتا۔
لیکن جہاں تک ادب اور آرٹ کو دقیانوسیوں سے بچانے کا مسئلہ ہے اس میں
یقیناً یہ بات بھی شامل سمجھی گئی کہ قدیم شعر و ادب کی ہیئت کو جہاں
تک ممکن ہو سکے بدل دیا جائے۔ چنانچہ متداول اصناف سخن، وزن شعر،
اور ردیف و قافیہ میں تصرف کرنا یا انہیں یکسر ترک دینا۔ اور ترقی
پسندی لازم و ملزوم قرار پائی۔ اس کے علاوہ اخلاقی اور مذہبی اقدار

کی بے قدری بھی اسی پروگرام میں شامل سمجھی گئی۔ عریانی و دریدہ دہنی کو واقعیت اور حقیقت نگاری کہہ کر مستحسن قرار دیا گیا۔ انداز بیان میں ابہام اور استاریت ترقی پسندی کی خصوصیت ٹھہری۔ اور اس ابہام اور استاریت کو نبھانے کے لئے زبان اور انداز بیان کے قواعد کو جملہ قیود سے آزاد کر دیا گیا۔ یہاں تک کہ الفاظ کے متعارف و لغوی معنوں میں بھی تصرف کو جائز رکھا گیا۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا۔ کہ ترقی پسندانہ نظم کا سمجھنا کوہ کندن و کاہ برآوردن کا مصداق ہو گیا۔

حالی، اقبال، اکبر وغیرہم شاعر پہلے اور مبلغ و پیغامبر بعد میں تھے۔ یعنی ان کا ادب برائے ادب اول اور برائے زندگی بعد میں تھا۔ لیکن ترقی پسندانہ ادب محض برائے زندگی ہو کر رہ گیا۔ ترقی پسند سب کچھ پہلے ہیں۔ اور شاعر اگر ہیں تو آخر میں۔ افلاطون نے کہا تھا کہ شعر کے لئے الہام ضروری ہے۔ یہاں یہ حال ہے کہ اگر نہیں ہے تو الہام ہی نہیں ہے باقی سب کچھ ہے۔ فرائڈ کے نظریات و نفسیات پر ایمان بھی ہے تو فحش گوئی۔ اور عریانی بھی، کارل مارکس کی مادیت بھی ہے اور اشتراکیت بھی۔ لینن بھی ہے اور اسٹالن بھی۔ روس بھی ہے اور چین بھی۔ غرض ان کی شاعری میں نہ ان کے دل کی آواز ہے نہ ان کے اہل وطن کی۔ وہ داخلی اور خارجی دونوں حیثیتوں سے خالص پردیسی چیز ہے۔ اس میں بھوک، مزدور سرمایہ داری غلامی وغیرہ کو اس کثرت سے دہرایا جاتا ہے کہ شاعری پر ارزاں قسم کے پراپیگنڈے اور اشتہار بازی کا شبہ ہوتا

ہے۔ اور شاعر شاعر نہیں بلکہ اشتراکی جلوس کے نعرے لگانے والے سرخ علمبردار معلوم ہوتے ہیں۔

عرض کیا جا چکا ہے کہ حضرت جوش ملیح آبادی تحریکی شاعری کے امام ہیں۔ لیکن ان کا تذکرہ باب ۱۰ میں کیا گیا ہے۔ اس لئے کہ آپ فنی اعتبار سے اسی محفل کے مستحق تھے۔ یہاں چند ترقی پسند آزاد شاعروں کا کلام پیش کیا جاتا ہے۔

پروفیسر فیض احمد فیض اور مسٹر نذر محمد راشد

پروفیسر فیض احمد فیض اور مسٹر نذر محمد راشد

ن۔م راشد ان نوجوان شعرا میں ہیں جو اپنے آپ کو "باغی" کہہ کر بہت خوش ہوتے ہیں۔ اور یہ واقعہ بھی ہے کہ یہ دونوں حضرات ہمارے ملک شعر و سخن کے نہایت سرکش و باغی شاعر ہیں۔ یعنی ترقی پسندانہ آزاد نظمیں لکھتے ہیں۔

فیض احمد صاحب اپنی شاعری کے متعلق اپنی تصنیف "نقش فریادی" کے دیباچہ میں فرماتے ہیں۔ "ان نظموں میں ہم نے روائتی اسالیب سے غیر ضروری انحراف مناسب نہیں سمجھا۔ بحور میں کہیں کہیں بہت ہلکا سا تصرف ہے اور قوافی میں دو ایک جگہ صوتی مناسب کو لفظی صحت پر ترجیح دی گئی ہے لو ربس' لیکن راشد کی "آزاد نظموں" میں یہ انحراف داخلی اور خارجی۔ فنی اور فکری لحاظ سے مکمل ہے

سطور بالا سے واضح ہوتا ہے کہ فیض کی شاعری راشد کی شاعری سے کسی قدر کم آزاد ہے۔ یہاں اشارۃً یہ بھی عرض کر دینا مناسب ہوگا کہ فیض تخیل اور زبان کے معاملے میں کسی قدر احتیاط کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ

کی نظمیں نسبتاً قریب الفہم ہوتی ہیں۔ بطور نمونہ دو نظمیں ملاحظہ ہوں

مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

میں نے سمجھا تھا کہ تو ہے تو درخشاں ہے حیات
تیرا غم ہے تو غم دہر کا جھگڑا کیا ہے ؟
تیری صورت سے ہے عالم میں بہاروں کو ثبات
تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے ؟

تو جو مل جائے تو تقدیر نگوں ہو جائے

یوں نہ تھا میں نے فقط چاہا تھا یوں ہو جائے
اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
ان گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم
ریشم و اطلس و کمخواب میں بنوائے ہوئے
جا بجا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم
خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے

جسم نکلے ہوئے امراض کے تنوروں سے

پیپ بہتی ہوئی گلتے ہوئے ناسوروں سے

لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجے ؟

اب بھی دلکش ہے ترا حسن مگر کیا کیجے ؟
اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

تنہائی

پھر کوئی آیا دل زار نہیں۔ کوئی نہیں !
راہرو ہوگا۔ کہیں اور چلا جائے گا !
ڈھل چکی رات، بکھرنے لگا تاروں کا غبار
لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ
سو گئی راستہ تک تک کے ہر اک راہگذار
اجنبی خاک نے دھندلا دیے قدموں کے سراغ
گل کرو شمعیں۔ بڑھا دو مے و مینا و ایاغ
اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو !
اب یہاں کوئی نہیں۔ کوئی نہیں آئے گا

ن۔م۔راشد کی نقصنیف "ماورا" میں تین طرح کی نظمیں ہیں
(۱) نیم آزاد (۲) سانیٹ (۳) آزاد

• "سانیٹ" ایک انگریزی صنف نظم کا نام ہے۔ اس میں قوافی کا ایک خاص التزام ہوتا ہے۔ یعنی قوافی کی ترتیب یہ ہوتی ہے۔ اب ب

طرح دج دج ہ وہ و زز اور مصرعوں کی تعداد ہمیشہ چودہ ہوتی ہے ۔
راشد صاحب نے اردو فارسی قوافی کے التزام کا جوا تو اتار پھینکا۔
لیکن انگریزی التزام کا جوا اپنے کندھوں پر رکھ لیا۔ اگر یہ اجتہاد ہے
تو بہت اچھی قسم کا اجتہاد نہیں۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

انسان (سانیٹ)

الٰہی تیری دنیا جس میں ہم انسان رہتے ہیں
غریبوں، جاہلوں، مردوں کی بیماروں کی دنیا ہے
یہ دنیا بے کسوں کی اور لاچاروں کی دنیا ہے
ہم اپنی بے بسی پر رات دن حیران رہتے ہیں

ہماری زندگی اک داستاں ہے ناتوانی کی
بنا لی اے خدا اپنے لیے تقدیر بھی تو نے
اور انسانوں سے لے لی جرأت تدبیر بھی تو نے
دوا اچھی ملی ہے ہم کو اپنی بے زبانی کی

اسی غور و تجسس میں کئی راتیں گزاری ہیں
میں اکثر چیخ اٹھتا ہوں بنی آدم کی ذلت پر
جنوں سا ہو گیا ہے مجھ کو احساس بضاعت پر

ہماری بھی نہیں افسوس جو چیزیں ہماری ہیں

کسی سے درد و اندوہ بیاں ہو نہیں سکتا
خدا سے بھی علاج درد انساں ہو نہیں سکتا

ن۔م راشد اپنی تیسری قسم کی یعنی مطلق آزاد نظموں میں ہر قید و بند سے آزاد ہو جاتے ہیں حتیٰ کہ آپ کی یہ نظمیں اکثر پڑھنے والوں کے لئے مبہم ہیں بطور نمونہ ایک نظم ملاحظہ کیجئے۔

خودکشی

کر چکا ہوں آج عزم آخری ——
شام سے پہلے ہی کر دیتا تھا میں
چاٹ کر دیوار کو نوک زباں سے ناتواں
صبح ہونے تک وہ ہو جاتی تھی دوبارہ بلند
رات کو جب گھر کا رخ کرتا تھا میں
تیرگی کو دیکھتا تھا سرنگوں
منہ بسورے رہگزاروں سے لپٹے سوگوار
گھر پہنچتا تھا میں انسانوں سے اکتایا ہوا
میرا عزم آخری یہ ہے کہ میں
کود جاؤں ساتویں منزل سے آج

آج میں نے پالیا ہے زندگی کو بے نقاب
آتا جاتا ہوں بڑی مدت سے میں
ایک عشوہ ساز و سرزہ کار محبوبہ کے پاس
اس کے تحت خواب کے نیچے مگر
آج میں نے دیکھ پایا ہے لہو
تازہ و درخشاں لہو
بوئے مے میں بوئے خوں الجھی ہوئی
وہ ابھی تک خواب کہ میں لوٹ کر آئی نہیں
اور میں کر بھی چکا ہوں اپنا عزم آخری
جی میں آتی ہے لگا دوں ایک بے باکانہ جست
اس دریچے میں سے جو
جھانکتا ہے ساتویں منزل سے کوئے و بام کو
شام سے پہلے ہی کر دیتا تھا میں
چاٹ کر دیوار کو نوک زباں سے ناتواں
صبح ہونے تک یہ ہو جاتی تھی دوبارہ بلند
آج تو آخر ہم آغوش زمیں ہو جائے گی

اب ہم آزاد شاعری کے چند اور نمونے پیش کرتے ہیں۔ تاکہ پڑھنے والوں کو آزاد نظموں کی خارجی اور داخلی خصوصیات کا اندازہ ہو سکے۔ میرا جی کی ایک

لہ مراد زندگی (نوٹ مصنف)

نظم ہے جس کا عنوان ہے "سرسراہٹ" ملاحظہ ہو

۱۔ یہاں ان سلوٹوں پر ہاتھ رکھ دوں

۲۔ یہ لہریں بہی جاتی ہیں اور مجھ کو بہاتی ہیں

۳۔ یہ موج بادہ ہیں ـــــ سلونی خوابیدہ فضا دل میں

۴ اچانک جاگ اٹھتی ہے

۵۔ حقیقت کے جہاں سے کوئی اس دنیا میں در آئے

۶۔ تو اس کے ہونٹ متبسم ہوں ـــــ ستارہ جھلملا اٹھ کر

۷۔ مرے دل کو جکڑ لے اپنے ہاتھوں سے

۸۔ مگر میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ لہریں ابھی تک ساحلی منظر سے ناواقف
ہیں یونہی اک بہانہ کر رہی ہیں، اک بہانہ کس کو کہتے ہیں؟

۹۔ بہانے ہی بہانے ہیں۔

۱۰۔ بڑھا کر رکھ دیا لہروں پہ میں نے ہاتھ۔ میرا ہاتھ اس کشتی کی مانند اک موج
تند کی افتاد کے جلوے کو میرے سامنے لا کر۔

۱۱۔ ہوا ہے گم

۱۲ مگر میں سوچتا ہوں بات جو کہنے کی تھی میں نے یہ کیوں پہلے ہی کہہ دی۔
وقت کا بے فائدہ مصرف

۱۳۔ ہر اک پوشیدہ منظر کو

۱۴۔ اگل ڈالے گا۔ اک لمحہ وہ آئے گا

۱۵۔ کہ جب اس بات کے سننے پہ سننے والے سوچیں گے۔

۱۶۔ بہانہ کیا تھا۔ سلوٹ کیا تھی۔ موج بادہ بھی کیا تھی؟
۱۷۔ مگر شب کی اندھیری خلوت گمنام کے پردے میں کھو کر ان کو یہ معلوم ہو
جائے گا اک پل میں۔
۱۸۔ اور اک لذت کے کیف مختصر میں کھو کے وہ بے ساختہ یہ بات کہہ اٹھیں گے
"تم کو مجھ کو اجازت ہے"
۱۹۔ یہاں ان سلوٹوں پر ہاتھ رکھ دوں" ؟ ــــ یہ جھجک کیسی ؟
۲۰۔ یہ لہریں ہیں۔ انہیں نسبت ہے کالی رات کے عمیق دریا سے۔
۲۱۔ جو بہتا ہی چلا جاتا ہے۔ رکتا ہی نہیں پل کو
۲۲۔ جسے کچھ بھی غرض اس سے نہیں میں ہاتھ رکھوں یا جھجک اس ہاتھ کو میرے کلیجے
سے لگا دے اور میں سو جاؤں ان لہروں کے بستر میں'

یہ نظم بحر ہزج میں کہی گئی ہے۔ اس میں کل ۲۲ مصرعے ہیں۔ گیارہواں
مصرعہ سب سے چھوٹا ہے۔ یعنی صرف ایک رکن کا ہوا ہے گم ....
مفاعی لن، اور آٹھواں، دسواں اور بائیسواں مصرع لمبے سے لمبا ہے۔
یعنی گیارہ گیارہ رکنوں کا (مفاعی لن گیارہ مرتبہ) اس نظم کے
معانی کے علاوہ مصرعوں کی تخفیف و تطویل کی بھی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔
ڈاکٹر خالد کی ایک نظم ملاحظہ ہو۔ اس کا عنوان ہے "ایک کدبہ"

۱۔ شبر دل خاں!
۲۔ میں نے دیکھے تیس سال
۳۔ سپے بہ سپے فاقے

۴۔ مسلسل ذلتیں
۵۔ سو رہا ہوں ۳۱ گرمیوں کی گود میں
۶۔ آفتاب مصر کے سائے تلے
۷۔ میں کنوارا ہی رہا
۸۔ کاش میرا باپ بھی
۹۔ اف کنوارا!
۱۰۔ کیا کہوں؟ ــــــ

یہ نظم شائد بحر رمل میں ہے۔ اس لئے کہ پہلا مصرعہ "شیر دل خاں" فاعلاتن کے وزن پر ہے ــــــ لیکن چوتھا مصرعہ بحر ہزج کے رکن "مفاعی لن" سے شروع ہوتا ہے اور آخری یعنی دسویں مصرعے کا وزن ہے۔ فاعلن۔ دو مصرعے یعنی نمبر ۵ و نمبر ۶ بحر رمل مسدس میں پورے اترتے ہیں۔
عبدالحمید بھٹی کی نظم کا آخری بند ملاحظہ ہو۔

تو ہے ان سب سے الگ
اور علیحدہ
یکتا
میں ہوں بیدل
مایوس
ایک
بیچارہ

تنہا
تجھ کو آ جائے اگر جمع کا یہ سادہ سوال
تیری دنیا بھی حسیں ہو جائے

اب ایک دو نمونے انقلابی نظموں کے بھی پیش کیے جاتے ہیں۔

۱۔ انقلاب اب کہاں ہے
کونسی وادیوں میں
کونسی منزلوں میں
مرے شوق کا کارواں ہے
ہم بھی اس جانِ عصرِ رواں کے لئے
اپنی آنکھیں بچھائے ہوئے ہیں
اپنے زخموں کی پوشاک پہنے کھڑے ہیں
اپنے خوابوں کی شمعیں جلائے ہوئے ہیں

۲۔ اب یہ سیلاب بڑھتا چلا جائے گا
چین کی سرزمیں سے ملایا ملک
اور ملایا سے برما تلک
اور برما سے ہندوستان

اور ہندوستاں سے فلسطین و یونان و اسپین تک
اب یہ طوفان چڑھتا چلا جائیگا

میرے خیال ناقص میں بس اسی قدر نمونے کافی ہیں۔ ان عجیب و غریب نظموں پر اگر انہیں نظم کہا جا سکے تبصرہ کرنا سعی لاحاصل ہے۔

باب ۱۳

اردو نثر کی ابتدا۔ مذہبی دور

۱۳۹۸ء سے ۱۷۹۰ء تک

تمہید مولنا محمد حسین آزاد "آب حیات" میں فرماتے ہیں کہ یہ عجیب بات ہے کہ ایک بچہ پہلے شعر کہے پھر بات کرنی سیکھے۔ اس سے ان کا مطلب یہ ہے کہ تاریخ ادب اردو میں نظم نثر سے قدیم ہے۔ موصوف کے نزدیک ولی (۱۶۶۸-۱۷۴۴ء) اردو شعر و شاعری کے باوا آدم ہوئے۔ اس عہد میں آپ کو اردو نثر کا سراغ نہیں ملتا۔ آپ کے نزدیک فضلی کی "دہ مجلس" اردو نثر کی پہلی کتاب ہے۔ یہ کتاب ولی سے کوئی نوے سال بعد ۱۸۳۳ء میں لکھی گئی۔

لیکن زمانہ حال کی تحقیق و تجسس نے اس خیال کا قطعی عکس ثابت کر دکھایا ہے۔ موجودہ تحقیق کی رو سے بچہ نے پہلے بات کرنی سیکھی پھر شعر

کہا؛ حصہ نظم کے ابتدائی دور (دکن میں) باب دوم میں دکھایا جا چکا ہے
کہ نظم کی ابتدا یوسف عادل شاہ کے عہد حکومت سے (سنہ ۱۴۹۰ء -
سنہ ۱۵۱۸ء) ہو چکی تھی۔ اسی طرح نثر کے باب میں موجودہ تحقیق، تلاش و جستجو
کرتی ہوئی ۷۹۵ھ سنہ ۱۳۹۵ء تک پہنچی ہے اور "معراج العاشقین" کو اردو نثر کی پہلی
کتاب مانی ہے۔ اگرچہ قیاس کہتا ہے کہ نثر کی عمر اس سے بھی زیادہ ہونی
چاہئے۔ چنانچہ مصنف "اردوئے قدیم" کی رائے میں شیخ عین الدین گنج العلم
متوفی ۷۹۵ھ (سنہ ۱۳۹۲ء) کے رسالے نثر کے قدیم ترین نمونے ہیں۔ لیکن چونکہ
یہ رسالے دستیاب نہیں ہو سکے۔ لہذا عملی سہولت کو مد نظر رکھتے ہوئے
"معراج العاشقین" ہی کو اردو نثر کی پہلی کتاب سمجھا جاتا ہے تحقیق و جستجو ابھی
ہمت ہار کر نہیں بیٹھی ہے۔ اس کی سرگرمی ہنوز جاری ہے۔ لہذا ابھی سے
کوئی آخری فیصلہ کر دینا قبل از وقت ہوگا۔

اس ابتدائی دور کو مذہبی دور اس لئے کہا گیا ہے کہ اس میں جو تصانیف
ملتی ہیں وہ زیادہ تر مذہبی مقاصد کو مد نظر رکھ کر لکھی گئی ہیں۔ اور عوام کی
زبان یعنی اردو کو اشاعت و تبلیغ اسلام کا ذریعہ سمجھا گیا ہے۔

۱۔ **معراج العاشقین** | اس وقت اولیت کا فخر اسی تصنیف کو حاصل ہے
حضرت ابوالفتاح صدرالدین سید محمد حسینی گیسو دراز
(متوفی سنہ ۱۴۲۱ء) نے اسے سنہ ۱۳۹۸ء میں تصنیف کیا۔ نمونۂ عبارت یہ ہے۔

نبی علیہ السلام کہے۔ انسان کے بوجنے کوں پانچ تن۔ ہر ایک تن کو پانچ دروازے
ہیں۔ ہور پانچ دربان ہیں۔ پہلا تن واجب الوجود مقام اس کا شیطانی نفس

اس کا اشارہ یعنی واجب کی آنک سوں غیر نہ دیکھنا سو۔ حرص کے کان سوں غیر نہ سنا سو۔ حسد کی نک سوں۔ بدبوئی نہ لینا سو۔ بغض کی زبان سوں بدگوئی نہ کیا سو۔ کینہ کی شہوت کوں غیر جاگہ خرچنا۔ پیر طبیب کامل ہونا۔ نبض پچھان کو دوا دینا سو

طبیب عشق را دکاں کدام است علاج جان کند او راچہ نام است

پیر منع کئے سوں پرہیز کرنا۔ مراقبے کی گولی۔ مشاہدے کے کاسے میں میکائیل کے مدد کے پانی سوں جلی کا کاڑا کر کو پلانا۔ سگن کا کاڑا دینا۔ نرگن ہوا تو توشفا پاوے گا طبیب فرمائے تیوں پرہیز کرے تو اپنے بھی طبیب ہووے گا۔ بھور ماٹی میں ماٹی۔ ماٹی میں پانی۔ ماٹی میں آگ۔ ماٹی میں بارا۔ ماٹی میں خالی مل پانچ عناصران کا واجب الوجود ہوجا تو معرفت تمام ہوا۔"

"معراج العاشقین" کو حال ہی میں مولانا عبدالحق صاحب نے حیدرآباد دکن سے شائع کیا ہے

"معراج العاشقین" کے بعد تقریباً ایک صدی تک کسی تصنیف و تالیف کا سراغ نہیں ملتا۔ "اردوے قدیم" میں چند بزرگوں کے دو ایک اردو فقرے لکھے ہیں۔ لیکن ان فقروں کو اردو کی مستقل تالیف نہیں کہا جا سکتا۔

۲۔ شرح مرغوب القلوب

حضرت شاہ میراں جی شمس العشاق بیجاپوری متوفی ۹۰۲ھ کا تذکرہ باب دوم میں گذر چکا ہے

"شرح مرغوب القلوب" آپ ہی کی تالیف ہے۔ سال تالیف معلوم نہیں ظاہر ہے کہ ۹۰۲ھ سے قبل ہی تصنیف ہوئی ہوگی۔ نمونہ عبارت یہ ہے۔

"پیغمبر کہے جے کچھ کام کرے گا کوئی خدا ناتوں نا لیکر تو وہ کام پاشمال ہوگا۔
سرانا۔ تو اترنا خدا کو بہوت کرا دیا لسن ہارا ہے عالم کا"

۳۔ کلمۃ الحقائق شاہ برہان الدین جانم کا تذکرہ بھی باب دوم میں گزر چکا ہے۔ یہ تصنیف آپ ہی کی ہے جو ۱۵۸۲ء سے قبل تصنیف کی جا چکی تھی عبارت کا نمونہ یہ ہے۔

سوال۔ یہ حق الا دھاد (علیحدہ) بلکہ ستر یکا روپ دستا ہے یک بل قرار نہیں کیوں سکے روپ۔

جواب۔ نئے عالم۔ ظاہر حق کے نقل نے گذر با دیا باطن کرنے دسے۔ اس کا قانون سو ممکن الوجود۔ دوسرا اس سوں بی کہ اس ابعدین کا انکار حقیقتا کرن ہارا۔ سو دہی حق نہیں تو لوحاک و سو کھو دو دکھ کھو کس ہارا۔ جینا نکار روپ دہی دوسرا حق تو تو لطا کر دیکھے یہ حق فہم سوں گذریا۔ تو کن اس کا تبول رہے۔

۴۔ احکام الصلوٰۃ یہ کتاب ۱۶۲۲ء میں قطب شاہ کے عہد حکومت میں لکھی گئی۔ اس کے مصنف مولانا عبداللہ ہیں۔
نمونہ عبارت یہ ہے۔

"تاب کرنے سوں نماز جاتا ہے۔ نماز میں آدمیاں کی مثال دعا منگنے نماز جاتا ہے۔ وہ کہے سوں نماز جاتا ہے۔ درد سوں یا مصیبت سوں نماز جاتا ہے۔ نماز میں کسی موت کی خبر سن کر قالوا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ہ بولے سوں نماز جاتا ہے۔ مصحف دیکھ کر پڑھے سوں نماز جاتا ہے۔ قہقہہ ہنسے سوں

نمازجاتاہے۔

۵۔ سب رس یہ تصنیف اس دور کی مایہ ناز ادبی کوشش ہے۔ اسے ملا وجہی معاصر سلطان عبداللہ قطب شاہ نے ۱۶۳۵ء میں تصنیف کیا۔ حال ہی میں مولوی عبدالحق صاحب نے اسے مع مقدمہ اور فرہنگ کے شائع کیا ہے۔ یہ کتاب ادبی لحاظ نگاہ سے قدیم اردو میں ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں حسن و عشق کی کشمکش اور عشق و دل کے معرکے کو قصے کی صورت میں پیش کیا ہے۔ طرز بیان بھی اس دور کی تصانیف سے مختلف ہے۔ تمام عبارت مقفی اور مسجع ہے۔ لیکن روانی اور سلاست کا رشتہ کہیں ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پایا ہے۔ عبارت کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

زینت سخن و تسمیۂ کتاب

یو قدرت اللہ ہے۔ یو اسرار اللہ ہے۔ یو خلقت اللہ ہے۔ لاالہ الا اللہ۔ لو عجب کتاب ہے۔ سبحان اللہ۔ اس کتاب کا ناؤں "سب رس" سب کوں پڑھتے آوے ہوس۔ بول بول کوں جڑے اس۔ یادگار رہو اچھے گا دنیا میں کئی لاکھ برس۔ رہو بجھ (بہت ہی) تس رئیں ہو تجھ لذیذ عاشقوں کے گلے کا تعویذ۔ لو کتاب سب کتاباں کا سرتاج۔ سب باتاں کا رواج۔ ہر بات میں سوسو معراج۔ اس کا سواد سمجھے نا کوئی عاشق باج۔ اس کتاب کی لذت پانے عالم سب محتاج۔ کیا عورت کیا مرد جس میں کچھ عشق کا درد۔ اس کتاب کوں سینے پرلے ہلاسے تا۔ اس کتاب بغیر کوئی اپنا وقت ہلاسے نا۔ جو

کوئی پڑھے گا جنس جنس کا اثر چھوڑے گا۔

مندرجہ بالا تصانیف کے علاوہ اس عہد میں اور بھی کتابیں مثلاً طوطی نامہ (۱۷۲۹ء) مصنفہ محمد قادری، "اسرار التوحید" مصنفہ سید شاہ میر وغیرہ لکھی گئیں جن کا تذکرہ طوالت سے خالی نہیں۔ واضح ہو کہ اب تک جن دو کتابوں کا تذکرہ کیا گیا وہ سب دکنی پیداوار ہیں۔ شمالی ہند میں اس وقت تک سناٹا ہے۔

شمالی ہند میں اول تو لوگوں پر شاعری کا رنگ غلبہ کئے ہوئے تھا۔ دوسرے ان کے دل و دماغ پر فارسی اس قدر مسلط تھی کہ وہ اردو میں تصنیف و تالیف کرنا ننگ و عار سمجھتے تھے۔ تصنیف و تالیف تو ایک طرف مراسلات بھی فارسی ہی میں ہوتے تھے۔ یہی فارسی اثر تھا کہ اردو نثر کی طرف لوگوں کی توجہ ہوئی بھی تو قافیہ و سجع کے تکلفات کی وجہ سے ایک مدت تک آزاد نہ ہو سکے

کربل کتھا یا ذہ مجلس "کربل کتھا" یا "دہ مجلس" شمالی ہند کی پہلی کتاب ہے جو ۱۷۳۲ء میں تصنیف ہوئی۔ مصنف شاہ فضل اللہ المتخلص بہ فضلی ہیں۔ یہ کتاب روضۃ الشہدا کا ترجمہ ہے عبارت اس کی مقفی و مسجع اور پیچیدہ ہے۔ نمونہ عبارت ملاحظہ ہو:۔

اس کا سبب تالیف کا یہ تھا کہ قبلہ حقیقی اور کعبہ تحقیقی میرے نواب مستطاب معلیٰ القاب اعنی نواب بابا امیر اشرف علی خاں سلمہ اللہ الملک المنان ہر سال تعزیہ ابو عبداللہ الحسین علیہ الصلوٰۃ والسلام کا بخلوص بے اندوز

محل بوجہ احسن بجا لاتا تھا۔ اور بندۂ حقیر پرتقصیر حسب الارشاد اس قبلہ گاہ کے روضۃ الشہداء کا خلاصہ کہ سب نکتہ سنجوں مناقب شاہ لافتی نے اور سب دقیقہ فہمان مصائب سیدالشہداء نے واقعہ شہادت کربلا اس میں لکھا ہے سناتا تھا لیکن معنی اس کے عورتوں کے سمجھ میں نہ آتے تھے اور فقرات پر سوز و گداز اس کتاب مذکور کے بسبب لغات فارسی ان کو نہ رلاتے تھے۔ اکثر اوقات بعد کتاب خوانی سب یہ مذکور کرتیں کہ صد حیف و صد ہزار افسوس جو ہم کم نصیب عبارت فارسی نہیں سمجھتے اور رونے کے ثواب سے بے نصیب رہتے ہیں۔ ایسا کوئی صاحب شعور ہووے کہ کسی طرح من وعن ہمیں سمجھا دے اور ہم سی نے سمجھوں کو سمجھا کر رلا وے۔ مجھ احقر الفقر کی خاطر میں گذرا کہ اگر ترجمہ اس کتاب کا برنگینی عبارات اور حسن استعارات ہندی قریب الفہم عامہ مومنین و مومنات کیجئے تو بڑا ثواب لیجئے"

دہ مجلس کی تالیف کے ایک مدت بعد سودا نے اپنے دیوان مرثیہ کا دیباچہ اردو نثر میں لکھا جو ان کے کلیات میں موجود ہے۔ یہ دیباچہ غالباً ۱۱۶۶ھ میں لکھا گیا ہے۔ اس کی عبارت بہت مشکل اور پیچیدہ ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

ضمیر منیر پر آئینہ داران معنی کے مبرہن ہو کہ محض عنایت حق تعالےٰ کی ہے جو طوطی سخن ناطقہ شیریں سخن ہو لیکن یہ جب مصرع کہ از قبیل ریختہ بدر ریختہ خامہ دو زبان اپنی سے صفحہ کاغذ پر تحریر پائے۔ لازم ہے کہ تحویل سخن سامعہ سنجان نکتہ کار کروں تا زبانی ان اشخاص کی ہمیشہ مورد تحسین و آفرین رہوں مطلع

قیمت و قدر شناسی شے بیجے ہے بہم
ورنہ دریا میں حرف بھی نہیں گوہر سے کم

مضمون پیلے ہیں یعنی ازمرع اسد ہنس کہ ہو نہیچ عکس کے جسوف زبان پر آنا فریاد بلبل ہے واسطے گوش دادرس کے غرض جس اہل سخن کا در مصفیٰ زینت لب ہے۔ سر رشتہ حُسنِ معانی کا اس کلام کے۔ اس سے انصاف طلب ہے۔ اگر حق تعالےٰ نے صبح کاغذ سفید کی با سیدشام سیاہ کرنے کو یہ خاکسار خلق کیا ہے تو ہر انسان کے فانوس دماغ میں چراغ ہوش دیا ہے۔ چاہئے کہ دیکھ کر نکتہ چینی کرے ورنہ گزند زہر آلود سے بے اجل کاہے کو مرے۔ "

سوداؔ کے مندرجہ بالا دیباچہ سے بائیس سال بعد یعنی ۱۷۸۶ء میں شاہ مولوی رفیع الدین صاحب دہلوی نے قرآن شریف کا ترجمہ کیا۔ اور دو سال بعد یعنی ۱۷۹۰ء میں مولانا شاہ عبدالقادر صاحب دہلوی نے بھی قرآن پاک کا ترجمہ کیا۔ ان دونوں ترجموں کی عبارت اگرچہ آسان ہے۔ الفاظ آسان اور عام فہم ہیں۔ لیکن چونکہ لفظی ترجمہ کیا گیا ہے۔ اس لئے الفاظ میں بے ربطی اور نشست الفاظ میں ڈھیلا پن پایا جاتا ہے۔ اور ان عیوب سے عبارت قریب الفہم نہیں رہتی۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

ترجمہ از شاہ عبدالقادر صاحب ؒ۔ اے جماعت جنوں اور انسانوں کی! کیا تم کو نہیں پہنچے تھے رسول تمہارے اندر کے۔ سناتے تم کو میرے حکم اور ڈراتے اس دن کے سامنے آنے سے۔ بولے ہم نے مانے اپنے گناہ۔ اور ان کو بہکایا زندگی

نے اور قائل ہوئے اپنے گناہ پر کہ وہ تھے منکر۔ پس واسطے کہ تیرا رب ہلاک کرنے والا نہیں بستیوں کو ظلم سے۔ "

تبصرہ

اردو نثر کا ابتدائی دور چار سو برس کی طویل مدت میں پھیلا ہوا ہے اس مدت میں تقریباً ساڑھے تین سو برس دکن کے حصے میں آئے ہیں اور پچاس بچپن برس شمالی ہند کے حصے میں۔ اس دور کو مذہبی دور کہا گیا ہے۔ کیونکہ اس دور کا تمام و کمال کارنامہ مذہبی رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ لطف یہ کہ سودا کا دیباچہ جو نہایت مختصر ہے اور کوئی مستقل تصنیف نہیں ہے بلکہ مرانی کے دیوان کا دیباچہ ہے جسے بھی کچھ نہ کچھ مذہبی حیثیت حاصل ہے۔

زبان اس دور میں ابتدائی منازل طے کر رہی ہے۔ اگرچہ اس وقت تک اردو نظم کافی ترقی کر چکی ہے۔ اس میں میر و سودا جیسے شعرا بے اپنے کمالات دکھا رہے ہیں۔ لیکن نثر ابھی عالم طفلی میں ہے۔ دکنی تصانیف میں سب رس کو چھوڑ کر باقی تمام تصانیف سادہ اور بے تکلف عبارت میں لکھی گئی ہیں۔ لیکن اس میں دکنی، مرہٹی، تامل وغیرہ الفاظ کی آمیزش اس حد تک ہے کہ آج کل زمانے میں اس کا سمجھنا دشوار ہے۔ سب رس کی زبان کا بھی یہی حال ہے لیکن اس کی عبارت میں رنگینی ہے۔ قافیہ اور سجع کا التزام کیا گیا ہے۔ ان تکلفات سے زبان کی قدامت کے ساتھ ساتھ قدرے پیچیدگی بھی پیدا ہو گئی ہے۔ اب

شمالی ہند میں آیئے۔ یہاں تین نمونے ملتے ہیں فضلی کے ہاں دکنی او قدیم الفاظ کے عوض فارسی اور عربی الفاظ کی کثرت ہے۔ سودا کے یہاں اس کثرت میں اور ترقی ہے لیکن مترجمین قرآن کے یہاں نہ قدیم الفاظ ہیں نہ عربی و فارسی الفاظ لیکن زبان خلاف روزمرہ اور بے ترتیب ہے۔

طرزبیان | اس دور میں نثر عاری بھی لکھی گئی اور نثر مقفی و مسجع بھی۔ لیکن طرز بیان بہر حالت میں اکھڑا اکھڑا سا ہے۔ دکنی اور شمالی ہند کی تصانیف کے انداز بیان میں کافی فرق محسوس ہوتا ہے قدیم الفاظ سے قطع نظر کرلی جائے تو "سب رس" کا انداز "دہ مجلس" کے انداز سے صاف اور سلیس ہے۔ یعنی شمالی ہند کا انداز الجھا ہوا اور دشوار ہے۔

نتیجہ | اس ابتدائی دور کو کوئی خاص ادبی اہمیت حاصل نہیں۔

باب ۱۴

اردو نثر کا دوسرا یعنی افسانوی دور

۱۸۰۰ء سے ۱۸۳۶ء تک

تمہید | دور اول ۱۷۹۰ء میں ختم ہوتا ہے۔ اور دوسرے دور کی ابتدا ۱۸۰۰ء سے ہوتی ہے۔ اس دس سال کی مدت میں ایک ایسی کتاب کا حال معلوم ہوتا ہے جس کو نہ دور اول سے کوئی تعلق ہے، نہ دور دوم سے۔ اس لئے

خاکسار اس کا تذکرہ تمہید میں کئے دیتا ہے۔

مذکورہ بالا کتاب کا نام "نوطرز مرصع" ہے۔ یہ کتاب حضرت امیر خسرو کی کتاب "چہار درویش" کا ترجمہ ہے مترجم میر محمد عطا حسین خاں تحسین اٹاوہ کے رہنے والے ہیں۔ "نوطرز مرصع" مقبول عام نہ ہو سکی۔ اس لئے اب اس کا نام ہی نام رہ گیا ہے۔

فورٹ ولیم کالج

انگریزوں کو جب ہندوستان کا مستقبل امید افزا اور شاندار نظر آنے لگا تو انھوں نے اپنی تجارت وسلطنت کو استحکام دینے کے لئے متعدد ذرائع اختیار کئے۔ منجملہ ایک ذریعہ یہ بھی تھا کہ انگریز تجار وحکام کو دیسی زبان سکھانے کے لئے فورٹ ولیم میں ایک کالج قائم کیا گیا۔ چونکہ ہندوستانی اور خصوصاً شمالی ہند اور پایہ تحت دہلی کی زبان اردو تھی لہذا اردو کی تعلیم وتعلم پر زیادہ زور تھا۔ اردو کی تعلیم کے لئے کتابوں کی ضرورت تھی۔ مگر یہاں تحریری دواوین کے اور کیا تھا جا بجہ اسی کالج میں تصنیف وتالیف کا ایک شعبہ قائم کیا گیا۔ اس شعبہ کے صدر ڈاکٹر جان گلکرائسٹ تھے۔ فورٹ ولیم کالج اور ڈاکٹر صاحب موصوف نے اردو زبان پر جو احسانات کئے ہیں۔ اردو نثر ان سے سبکدوش نہیں ہو سکتی۔ علاوہ متعدد تصانیف وتالیفات کے ان ہی ڈاکٹر صاحب کی اظہار لفات کی وساطت سے اردو دربار سرکار میں رسائی پاکر عدالتی زبان قرار پائی۔

ڈاکٹر جان گلکرائسٹ

آپ نے شعبہ تصنیف وتالیف کے

سدر ہونے کی حیثیت سے محض مختلف مشہور نثاروں سے کتابیں ہی نہیں لکھوائیں۔ بلکہ خود بھی چند کتابیں لکھیں۔ یوں تو آپ نے متعدد کتابیں تصنیف کیں لیکن حسب ذیل زیادہ مشہور اور عمدہ ہیں۔

۱۔ انگریزی ہندوستانی لغت
۲۔ ہندوستانی علم اللسان (فرہنگ)
۳۔ ہندوستانی کی صرف و نحو
۴۔ اتالیق ہندی
۵۔ مکالمہ (یہ کتاب انگریزوں کے لیے تھی تاکہ عام مضامین پر بول چال میں انہیں مہارت حاصل ہو)
۶۔ قصص مشرقی (متفرق انگریزی قصوں کا اردو ترجمہ ہے) وغیرہ

اس دور کے مشہور نثار اور ان کی تصانیف

میر شیر علی افسوس آپ میر مظفر خاں کے بیٹے تھے۔ جو میر قاسم نواب بنگالہ کے داروغہ توپ خانہ تھے۔ افسوس دہلی میں پیدا ہوئے۔ ابتداءً آپ کے والد نواب عمدۃ الملک امیر خاں کی سرکار میں ملازم تھے۔ لیکن نواب موصوف کی وفات کے بعد وہ لکھنؤ چلے گئے۔ اس وقت افسوس کی عمر گیارہ برس کی تھی۔ لکھنؤ کی فضا نے بچپن ہی میں شعر و سخن کا شوق پیدا کر دیا۔ میر حیدر علی حیران دہلوی کو اپنا کلام دکھانے لگے۔ عربی اور علم حکمت کی تحصیل عالمانہ تھی۔

مرافسوس ابتدا میں نواب سالار جنگ اوران کے لڑکے نوازش علی خاں کے پاس گیارہ برس تک رہے پھر مرزا جوان بخت ولی عہد نے جو ان دنوں لکھنؤ میں رونق افروز تھے۔ کلام سن کر ازراہ قدر دانی طلب فرمایا اور اپنے مصاحبوں میں داخل کر لیا جب جواں بخت کچھ عرصے کے بعد دہلی جانے لگے تو یہ ہمراہ نہ جا سکے اور نواب سرفراز الدولہ حسن رضا خاں نائب آصف الدولہ کے پاس چلے گئے۔

چند سال بعد کرنیل اسکاٹ نے آپ کو کلکتہ بلایا۔ پانسو روپے زاد راہ بھیجے اور دو سو روپے ماہوار تنخواہ مقرر کر دی۔ آپ فورٹ ولیم کالج کے سربرآوردہ لوگوں میں شمار ہونے لگے۔ آخر ۱۸۰۹ء میں انتقال ہوا۔

دو کتابیں آپ نے یادگار چھوڑیں۔ ایک "باغ اردو" جو سعدی کی گلستاں کا ترجمہ ہے۔ اور دوسری "آرائش محفل" جس میں ہندوستان کے تاریخی حالات درج ہیں۔ افسوس کہ آجکل دونوں کتابیں نایاب ہیں۔

"باغ اردو" کی زبان سلیس اور سادہ ہے۔ ترجمہ میں اصلی فارسی کی خوبی کو بڑی حد تک قائم رکھا ہے۔ استعار کا ترجمہ بھی استعار ہی میں کیا ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

(باب دوم گلستاں) ایک بزرگ نے کسی پرہیزگار سے پوچھا کہ فلانے عابد کے حق میں آپ کیا کہتے ہیں کہ اکثر اشخاص اس کے حق میں طعنہ آمیز باتیں کہتے ہیں کہا اس لئے کہ ظاہر اس میں کچھ عیب نہیں دیکھتا اور باطن سے آگاہ اللہ ہے۔

جس کو ظاہر میں متقی دیکھے — اس کے تقوی کا تو نہ کر انکار

کھوج مت کر کسی کے باطن کا — محتسب را درون خانہ چہ کار

مرزا لطف علی لطف مرزا لطف علی نام۔ اور لطف تخلص تھا۔ آپ کے والد ناظم بیگ خاں استر آباد کے رہنے والے تھے۔ نادر شاہ کے ساتھ شاہجہان آباد آئے۔ فارسی کے شاعر تھے اور ہجری تخلص کرتے تھے۔

مرزا لطف کو ڈاکٹر گلکرائسٹ نے کلکتہ بلا کر شعبہ تصنیف و تالیف میں جگہ دی اور تذکرہ شعراء لکھنے کی فرمائش کی۔ چنانچہ آپ نے تذکرہ گلشن ہند" نامی تذکرہ ۱۸۰۱ء میں مرتب کیا۔

تذکرہ کی زبان صاف اور سادہ ہے۔ تاہم قافیئے کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ بعض باتیں اس تذکرہ میں ایسی درج ہیں جن کا ذکر کسی اور جگہ نہیں پایا جاتا۔ تاریخی حالات بھی خوب درج کئے ہیں۔ مولوی عبدالحق صاحب نے اس تذکرہ کو شائع کردیا ہے۔ یہ تذکرہ اردو شعراء کا پہلا تذکرہ ہے جس میں شعراء کے حالات اردو زبان میں لکھے گئے ہیں۔

میر امّن دہلوی میر امان نام اور امّن تخلص تھا۔ دہلی کے رہنے والے۔ تھے نامور اور خاندانی شخص تھے۔ شعر میں کسی سے اصلاح نہیں لی۔ خود فرمایا کرتے تھے کہ شاعری میرا پیشہ نہیں ہے۔ "میں کسی شاعر کا بھائی نہیں۔ میری اردو ٹکسالی اردو ہے کیونکہ میں دلی کا روڑا ہوں اور وہیں کا پروردہ یافتہ ہوں"۔

میر امّن اور ان کے بزرگوں کے حالات خود ان ہی کی زبانی سنئے اور اسی بیان کو ان کی عبارت کا نمونہ سمجھئے۔

"پہلے اپنا حال یہ عاصی میر امن دلی والا بیان کرتا ہے کہ میرے بزرگ ہمایوں
بادشاہ کے عہد سے ہر ایک بادشاہ کی رکاب میں پشت بہ پشت جانفشانی بجا
لاتے رہے۔ اور وہ بھی پرورش کی نظر سے قدردانی جتنی چاہیئے فرماتے رہے۔
جاگیر، منصب اور خدمات کی عنایت سے مالامال اور نہال کر دیا۔ اور خانہ زاد
موروثی اور منصب دار قدیمی زبان مبارک سے فرمایا۔ چنانچہ یہ لقب بادشاہی
دفتر میں داخل ہوا۔ جب ایسے گھر کی کہ سارے گھر اس کے سبب سے آباد تھے یہ
نوبت پہنچی ظاہر ہے عیاں راچہ بیاں۔ تب سورج مل جاٹ نے جاگیر کو ضبط کر
لیا۔ اور احمد شاہ دُرانی نے گھربار تاراج کیا۔ ایسی تباہی اٹھا کر ایسے شہر سے کہ جنم
بھوم میرا ہے اور آنول نال وہیں گڑا ہے جلاوطن ہوا اور ایسا جہاز کہ جس کا ناخدا
خدا تھا۔ غارت ہوا۔ میں بے کسی کے سمندر میں غوطے کھانے لگا۔ ڈوبتے کو تنکے
کا سہارا بہت ہوتا ہے۔ کئی برس بلدۂ عظیم آباد میں دم لیا کچھ بنی کچھ بگڑی آخر
وہاں سے بھی پاؤں اکھڑے روزگار نے موافقت نہ کی۔ عیال و اطفال کو چھوڑ کر تن
تنہا کشتی پر سوار ہوا۔ اشرف البلاد کلکتہ میں آب و دانہ کے زور سے آ پہنچا۔ چندے
بیکاری میں گذرے۔ اتفاقاً نواب دلاور جنگ نے بلوا کر اپنے چھوٹے بھائی میر محمد
کاظم کی اتالیقی کے لئے مقرر کیا قریب دو سال کے وہاں رہا جب وہاں اپنا نباہ نہ
دیکھا تب منشی میر بہادر علی کے وسیلہ سے حضور جان گلکرسٹ صاحب بہادر
سے رسائی ہوئی۔ بارے طالع کی مدد سے ایسے جواں مرد کا دامن ہاتھ لگا۔ چاہئے
کہ دن کچھ بھلے آویں، نہیں تو یہی غنیمت ہے کہ ایک ٹکڑا کھا کر پاؤں پھیلا کر سو رہتا
ہوں اور گھر میں دس آدمی بڑے چھوٹے پرورش پا کر دعا اس قدردان کو کرتے

ہیں۔ خدا قبول کرے۔"

میر امن نے چہار درویش کا قصہ اردو میں ترجمہ کیا اور "باغ و بہار" اس کا نام رکھا۔ یہ کتاب ۱۸۰۱ء میں شروع ہوئی اور دو سال کی مدت میں پایۂ اختتام کو پہنچی۔ اس کے علاوہ "اخلاق محسنی" کا بھی اردو ترجمہ کیا تھا اور "گنج خوبی" نام رکھا تھا۔ لیکن یہ کمیاب ہے۔

میر امن کی نثر کو وہی رتبہ حاصل ہے۔ جو میر تقی میر کی نظم کو۔ "باغ و بہار" کی تصنیف کو آج ایک سو پچاس برس کی مدت گزری لیکن اب بھی اس کی وہی قدر ہے جو اس زمانے میں تھی۔ روانی اور سلاست اور محاورے کی خوبی۔ اور روزمرہ کی صفائی اس کی خصوصیت ہیں۔ طرزِ بیاں بے تکلف اور رواں ہے ہندی الفاظ نہایت خوبی سے استعمال ہوئے ہیں۔ کہیں کہیں غلط الفاظ بھی ملتے ہیں۔ لیکن یہ معلوم ہوتا ہے کہ عوام کی زبان پر یہ الفاظ اسی طرح رائج تھے۔ عام طور پر عبارت کا رنگ ایسا ہے۔ جیسے کوئی باتیں کرتا ہے۔ جذبات کو حفظ مراتب کے ساتھ بڑی خوبی سے ادا کیا ہے۔ کردار نویسی کی بھی کہیں کہیں جھلک موجود ہے۔

سید حیدر بخش حیدری

دہلی میں پیدا ہوئے اور یہیں نشو ونما پائی۔ سلطنت کی تباہی پر وطن کو خیرباد کہا۔ چندے ادھر ادھر سرگرداں و پریشاں پھرے۔ آخر قسمت نے انہیں کلکتہ پہنچایا۔ وہاں انہوں نے فورٹ ولیم کالج کے شعبہ تصنیف و تالیف میں ملازمت کرلی۔ آپ نے متعدد کتابیں تصنیف

وترجمہ کیں۔ جن کی فہرست حسب ذیل ہے۔

۱۔ آرائش محفل۔ ترجمہ حاتم طائی فارسی۔ ترجمہ لفظ بلفظ نہیں ہے بلکہ جہاں کہیں موقع پایا ہے قصے کو طول دے دیا ہے۔

۲۔ طوطا کہانی۔ اس میں چھوٹے چھوٹے قصے ہیں۔ یہ کتاب پہلے سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ ہوئی۔ اور فارسی سے حیدری نے اردو میں ترجمہ کی۔

۳۔ قصہ لیلیٰ مجنوں۔ امیر خسرو کی مثنوی کا اردو ترجمہ ہے۔

۴۔ تاریخ نادری۔ فارسی "نادرنامہ" کا ترجمہ ہے۔

۵۔ گلزار دانش۔ ترجمہ بہار دانش فارسی۔ اس کتاب میں عورتوں کے مکر و فریب کے قصے درج ہیں۔

۶۔ گل مغفرت۔ اولیائے کرام اور شہدائے پاک کے حالات درج ہیں سنہ طباعت ۱۸۱۲ء ہے۔

ان سب کتابوں میں "آرائش محفل" یعنی "حاتم طائی" بہت مقبول ہوئی قصے کے حسن و قبح کا انحصار پڑھنے والے کی پسند یا عدم پسند پر ہے لیکن اس کی عبارت میر امن دہلوی کی عبارت کی طرح صاف، شستہ اور با محاورہ ہے زبان آجکل کے مذاق کے مطابق ہے۔ البتہ کہیں کہیں قدامت کی جھلک ہے اور ہونی بھی چاہیے کہ آج سے سوا سو برس پہلے کی زبان ہے۔

نہال چند لاہوری اگرچہ دہلی کے رہنے والے تھے۔ مگر ایک عرصہ تک لاہور میں رہنے کا اتفاق ہوا اس وجہ سے لاہوری مشہور

ہیں۔ افسوس کہ ان کے متعلق اور کچھ دریافت نہیں ہوتا۔ آپ بھی شعبۂ تصنیف وتالیف سے متعلق تھے۔ آپ کی ایک کتاب "مذہب عشق" جس کا دوسرا نام "قصہ گل بکاولی" ہے۔ بہت مشہور ہے۔ یہ قصہ پہلے فارسی میں تھا۔ آپ نے اردو میں اس کا ترجمہ کیا۔ سن تصنیف ۱۸۰۳ء ہے۔

مندرجہ بالا مصنفین کے علاوہ چند مصنفین اور بھی ہیں۔ مثلاً مرزا کاظم علی جوان۔ مظہر علی خاں ولا وغیرہم۔ لیکن نہ تو ان کے حالات معلوم ہیں کہ درج ہوں، نہ ان کی تصانیف و تراجم کا سراغ ملتا ہے کہ نمونہ پیش ہو یہاں تک جن مصنفین کا تذکرہ ہوا۔ ان کا تعلق براہ راست فورٹ ولیم کالج کے شعبہ تصنیف و تالیف سے تھا۔ اس کالج اور ان مصنفین کی خدمات زبان قابل قدر ہیں۔ ان کی کوششوں سے ملک میں عام طور پر تصنیف و تالیف کا ذوق پیدا ہو گیا۔ اور اہل زبان کو نثر نگاری کا سلیقہ آگیا۔ چنانچہ اسی عہد میں سید انشاء اللہ خاں انشا نے (حالات ملاحظہ ہوں حصہ نظم) بھی نثر نگاری کی طرف توجہ کی۔ اگرچہ آپ کو فورٹ ولیم کالج سے کوئی تعلق نہ تھا۔ لیکن شعبہ تصنیف و تالیف نے جو ایک عام مذاق پیدا کر دیا تھا۔ کچھ اس کا اثر کچھ سید صاحب کی انوکھی طبیعت۔ غرض آپ نے "دریائے لطافت" میں لطافت کے دریا بہائے اس کتاب میں اردو صرف و نحو، منطق، عروض، و قافیہ، معانی و بیان وغیرہ کی بحث ہے۔ پہلا حصہ یعنی اردو صرف و نحو تو سید صاحب کی تصنیف ہے۔ دوسرا حصہ جس میں باقی مضامین ہیں۔ مرزا محمد حسن قتیل کا تالیف کیا ہوا ہے

لیکن کتاب کی جان پہلا ہی حصہ ہے۔ یہ پہلی کتاب ہے جسے اردو اہل زبان نے صرف ونحو پر لکھا ہے۔ اس کی زبان اگرچہ فارسی ہے لیکن اس میں جابجا اردو عبارت کے نمونے درج ہیں اور چونکہ اردو صرف ونحو کے متعلق ہے لہذا خاکسار نے اس جگہ اس کا ذکر کر دیا ہے۔

دریائے لطافت کے علاوہ ایک داستان بھی سید صاحب کی یادگار ہے۔ اس میں عربی اور فارسی کا ایک لفظ بھی نہیں آنے پایا ہے۔ باوجود اس کے اردو کے رتبہ سے کلام نہیں گرا ہے۔ یہ داستان کوئی پچاس صفحوں پر مشتمل ہے۔ اور جابجا ظرافت اور بذلہ سنجی کے پھول کھلے نظر آتے ہیں۔
سنہ تصنیف ۱۸۰۳ء ہے۔

تبصرہ

اردو نثر نگاری کا دوسرا دور جس قدر مختصر ہے۔ اسی قدر اس کے کارنامے وقیع ہیں۔ اگرچہ تمام کتابیں جو اس دور میں تصنیف و تالیف ہوئیں، قصے کہانیوں پر مشتمل ہیں۔ لیکن نثر نگاری کا ذوق پھیلانے میں یہ قصے کہانیاں بے حد مفید ثابت ہوئیں۔ علاوہ بریں چونکہ یہ کتابیں زیادہ تر انگریزوں کے پڑھانے کے لئے لکھوائی گئی تھیں، اس لئے ان کا انداز بیان نہایت صاف اور سادہ رکھا گیا۔ اور پھر اسی رنگ کو لوگ پسند کرنے لگے، ورنہ سودا اور فضلی کا رنگ عام ہو کر مدت تک جاری رہتا۔

باب ۱۵

اُردو نثر کا تیسرا یعنی مقفّٰے و مسجّع دَور

۱۸۳۶ء سے ۱۹۰۰ء تک

نقیر محمد خاں گویا — فقیر محمد خاں نام، گویا تخلص حضرت ناسخ کے ارشد تلامذہ میں شمار کئے جاتے تھے، دربار شاہی میں آپ رسالہ دار اور مسلم الدولہ کے خطاب سے مخاطب تھے،

آپ نے حضرت ناسخ اور خواجہ وزیر کے مشورہ سے "انوارِ سہیلی" کا ترجمہ اردو میں کیا اور اس کا نام "بستانِ حکمت" رکھا، یہ کتاب ۱۸۳۶ء میں اختتام کو پہنچی،

اس عہد کی تحریر کے مطابق ترجمہ اچھا ہے لیکن عربی فارسی الفاظ بکثرت استعمال کئے ہیں، اکثر مقامات پر فارسی اشعار اور عربی ضرب الامثال کو جوں کا توں رہنے دیا ہے، جس کی وجہ سے عبارت آسان اور زود فہم نہیں رہی، علاوہ ازیں بعض الفاظ ثقیل بھی ہیں۔

مرزا رجب علی بیگ سرور — مرزا رجب علی بیگ نام، سرور تخلص، مرزا اصغر علی لکھنوی کے بیٹے ۱۷۸۶ء میں بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے، اور لکھنؤ ہی میں تعلیم و تربیت پائی، عربی و فارسی میں کافی مہارت تھی، خطاطی اور موسیقی میں بھی دخل تھا، شاعری میں آغا نوازش حسین نوازش کے شاگرد ہوئے، مذاقِ سخن ستھرا تھا اور صاحبِ دیوان بھی تھے لیکن شہرت نثر نگاری کی وجہ سے

ہوئی، واجد علی شاہ نے ازراہ قدردانی پچاس روپیہ ماہوار مقرر کر کے درباری شعراء میں شامل کیا لیکن زوال سلطنت کے بعد بنارس چلے گئے، جہاں مہاراجہ الیشری پرشاد نرائن سنگھ کی بہت خاطر و مدارات سے پیش آئے۔ آپ نے دہلی، میرٹھ، اور راجپوتانہ کی بھی سیاحت کی۔ آخر ۱۸۶۷ء میں بنارس میں انتقال ہوا۔

سرور زندہ دل، شگفتہ مزاج اور یارباش آدمی تھے۔ مرزا غالب سے دوستانہ تعلقات تھے۔

متعدد تصانیف آپ کی یادگار ہیں۔

۱۔ فسانہ عجائب

۲۔ سرور سلطانی (شمشیر خانی کا ترجمہ ہے جو واجد علی شاہ کی فرمائش سے کیا گیا تھا)

۳۔ گلزار سرور (حدائق العشاق کا ترجمہ ہے، مہاراجہ الیشری پرشاد نرائن سنگھ کی فرمائش سے کیا گیا تھا)

۴۔ شگوفہ محبت۔ ایک قصہ ہے

۵۔ انشائے سرور

جملہ تصانیف میں فسانہ عجائب اپنے رنگ کی بہترین کتاب ہے۔ یہ افسانہ ۱۸۲۴ء میں لکھا گیا تھا۔ سرور کی جملہ تصانیف کی عبارت کا ایک ہی رنگ ہے، یعنی مقفی و مسجع۔ یہ رنگینی و روانیہ پہلی فارسی کا رنگ تھا لیکن اردو میں اس رنگ کے سرور ہی موجد ہیں۔ اس قسم کی نثر کی بنا تصنع اور بناوٹ پر ہوتی ہے اور اس کی دلآویزی کا مدار مصنوعی حسن پر ہوتا ہے۔ اس میں تو شک نہیں کہ یہ

رنگ پرلطف اور دلکش ہوتا ہے، جو کیف و سرور اشعار سے حاصل ہوتا ہے وہی اس قسم کی عبارت سے ملتا ہے لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس طرز کا میدان بہت تنگ ہوتا ہے، اس زبان میں بحر افسانہ گوئی کسی اور علمی اور ادبی مبحث کی قدرت نہیں ہوتی، اور یہی وجہ ہے کہ سرور کا طرز نگارش ایک خاص زمانہ تک ہی مقبول رہا، اور اس وقت قطعی متروک ہے، یہاں تک کہ قصہ کہانی میں بھی اس طرز کو کوئی اختیار نہیں کرتا۔

مرزا اسد اللہ خاں غالب بحیثیت تقریظ نگار

حالات زندگی کے لئے ملاحظہ ہو باب ۸

غالب نے بعض اردو خطوط اور خاص کر اردو تقریظوں میں مقفے اور مسجع عبارت لکھنے کا التزام کیا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ خاکسار آپ کا شمار اس دور میں بھی کرتا ہے اور آئندہ دور میں بھی آپ کا شمار کرے گا (ملاحظہ ہو باب ۱۶)

آپ کی تقریظوں اور دیباچوں کا وہی رنگ ہے، جو مرزا رجب علی بیگ سرور کی تصانیف کا لیکن غالب کی عبارت میں تصنع اور آورد نسبتاً کم پائی جاتی ہے۔ عام طور پر دوسرے فقرے میں ویسی ہی بے تکلفی ہوتی ہے جیسی کہ پہلے فقرے میں اور اس سے آپ کی خوش سلیقگی کا پتہ چلتا ہے

مولانا غلام امام شہید

غلام امام نام شہید تخلص، شاہ غلام محمد کے بیٹے اور قصبہ امیٹھی ضلع لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔

شہید اچھے شاعر اور مداح نبی اور عاشق رسول کے لقب سے مشہور تھے تمیل مصحفی کے شاگرد تھے اور علوم متداولہ کی تحصیل مولوی حیدر علی صاحب کی خدمت

میں کی تھی، فارسی میں کامل دستگاہ تھی، اور فارسی نظم و نثر میں آغا سید اسمٰعیل اشتیاقی کے شاگرد تھے، سرکار نظام سے چار سو تیس روپئے سال بلا شرط خدمت مقرر تھے جو آخر وقت تک آپ کو ملتے رہے، نواب کلب علی خاں والیٔ رامپور بھی آپ کی بہت قدر و منزلت کرتے تھے۔

شہید نے اپنا کلام کبھی جمع نہیں کیا، لیکن جو کچھ محفوظ رہا، وہ شائع ہو چکا ہے مجموعہ میلاد شریف "اور اشاعت بہار سخن" اور قصائد و غزلیات کا ایک مجموعہ آپ کی یادگار ہے،

نثر میں آپ کا وہی رنگ ہے، جو اس دور کے دیگر انشا پرداز حضرات کا یعنی مقفیٰ و مسجع لفظ لفظ میں تصنع اور بات بات میں آورد، تاج گنج کے روضے کی تعریف میں جو کچھ لکھا ہے وہ آپ کی طرز نگارش کا بہترین نمونہ ہے

منشی غلام غوث بیخبر

غلام غوث نام اور بیخبر تخلص تھا آپ کے والد کا نام خواجہ حضور اللہ اور بزرگوں کا وطن کشمیر تھا خواجہ حضور اللہ ترک وطن کر کے تبت چلے گئے، وہاں سے ریاست نیپال میں آ گئے، اور وہیں اقامت گزین ہوئے، چنانچہ بیخبر وہیں ۱۸۲۴ء میں پیدا ہوئے بیخبر ابھی چار پانچ برس ہی کے تھے کہ آپ کے والد نے مجبوراً ترک وطن کیا اور بنارس میں بود و باش اختیار کی، آپ نے یہیں تعلیم و تربیت پائی، سنہ ۱۸۴۰ء میں سلسلہ ملازمت شروع ہوا، اور اپنے خالو خاں بہادر مولوی سید محمد خاں میر منشی نواب لفٹننٹ گورنر ممالک مغربی و شمالی کے نائب مقرر ہوئے، اور ان کے انتقال کے بعد خود میر منشی ہو گئے ۱۸۷۴ء میں پنشن لی، اور خان بہادر ذوالقدر

کے خطاب سے سرفراز ہوئے، ۱۹۰۵ء میں رحلت فرمائی،

بیخبر اور غالب میں دوستانہ تعلقات تھے، چنانچہ خطوط غالب میں دو خط بیخبر کے نام بھی موجود ہیں، آپ کی دو تصنیفیں یادگار ہیں، ایک "نمونہ جگر" اور دوسری "فغان بیخبر"

بیخبر کا شمار اس عہد کے نامور انشا پردازوں میں تھا، آپ کی عبارت میں رنگینی و تصنع تو ضرور ہے لیکن قوافی اور سجع کا التزام نہیں، رعایت لفظی اور مبالغہ کا بہت شوق ہے، تشبیہ و استعارہ سے بھی نثر کو مزین کرتے ہیں، بطور نمونہ ملاحظہ ہو،

خط مولانا غلام امام شہید کے نام: "قبلہ میری شوخی دیکھیے یوسف کو آئینہ دکھاتا ہوں، خورشید کو روشنی کی حکایت سناتا ہوں، گلزار میں پھول بسجاتا ہوں، ختن میں مشک تحفہ بھیجتا ہوں، دریا کے سامنے روانی کے معانی بیان کر رہا ہوں، چاند کے روبرو نور افشانی کا معاملہ کرتا ہوں، لعل کے حضور میں رنگ کی دکان کھولتا ہوں، قند کے مواجہ میں شیرینی تولتا ہوں، مسیحا سے کہتا ہوں، جان بخشی کی روایت سنیے، موتی سے تمنا کرتا ہوں، کہ بیدِ بسیار کی چمک دیکھیے یعنی حضرت کا دیوان مرتب کر کے آپ کے حضور میں پیش کرتا ہوں....."

امیر مینائی لکھنوی

حالات زندگی کے لئے ملاحظہ ہو باب ۹

امیر مینائی نے یوں تو اپنی شاعری سے نظم اردو کی کافی خدمت کی ہے۔ "انتخاب یادگار" کی تالیف سے نثر کی بزم میں بھی آپ کو شرکت کا استحقاق ہے۔ انتخاب یادگار ان شاعروں کا تذکرہ ہے، جو ریاست

رامپور کے متوسل رہے، یہ تذکرہ ۱۸۷۳ء میں طبع ہوا تھا، اس میں چار سو دس شاعروں کا حال قلمبند ہے اور کل ۱۴۷ صفحات ہیں۔

• "انتخاب یادگار" کا طرزِ نگارش "فسانہ عجائب" کی طرح مقفیٰ و مسجع ہے نمونہ ملاحظہ ہو،

"سمندِ قلم پر شہسوارِ سخن کی تاکید ہے، کہ میدانِ حمدِ الٰہی میں قدم اٹھا، اور تیغِ زبان پر قوتِ ناطقہ کی تہدید ہے کہ اس معرکہ میں جوہر دکھا، مگر یہ منزل ایسی کڑی ہے کہ دونوں کو مشکل پڑی ہے، نہ اس کا پاؤں نہ اس کا ہاتھ اٹھ سکتا ہے، اس عجز کو دیکھ کر عقل حیران ہے اور عقل کو سکتہ ہے . . . . "

تبصرہ و کیفیت

دورِ اول میں سادگی تھی، اس دور میں تصنع و آورد ہے، دورِ دوم میں بول چال کا لطف اور روزمرہ کی صفائی تھی، اس دور میں قافیہ بندی، تلاش خراش عبارت کی رنگینی اور فارسی کے تتبع کا زور ہے، اس دور کے مصنفین اعلیٰ قابلیت کے لوگ ہیں اور فارسی و عربی سے بہرہ وافر رکھتے ہیں، نظم کی طرح نثر کو بھی سادگی کے بعد تصنع کے دور سے گذرنا پڑا ہے، نثر میں بھی نظم کی طرح دہلی اور لکھنؤ کا فرق موجود ہے، یہ عجیب بات ہے، کہ سادگی کے بعد تصنع پیدا ہوتا ہے، اور تصنع کے بعد پھر سادگی کی طرف رجحان ہوتا ہے،

پہلے دور کی سادگی مفید تھی، لیکن اس دور کا تکلف کسی اہم کام کے لئے موزوں نہیں، اور یہی وجہ ہے، کہ رنگ عام نہیں ہو سکا، خاکسار نے ایک خاص رنگ

کے مصنفین چن کر ایک دور قائم کر دیا ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے، کہ دور دوم کی سادگی دور سوم میں کیا موجودہ زمانے تک کارفرما ہے، یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ دور دوم مفید اور کارآمد تصانیف و تالیفات سے قطعی خالی ہے، جون ۱۹۱۸ء کے معارف میں مولانا سید سلیمان صاحب ندوی کا ایک مضمون شائع ہوا ہے، جس میں آپ نے ان کتابوں کی فہرست دی ہے، جو انڈیا آفس لندن میں آپ کی نظر سے گزری، یہ فہرست ۱۹۰۰ء میں چھپی ہے، اس لئے موجودہ بیسویں صدی کی کتابیں اس میں شامل نہیں، اس فہرست سے معلوم ہوتا ہے کہ زبان اردو عہد کے پہلے ہی سے علمی زبان بن رہی تھی، کتابوں کی کثرت کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے، کہ فہرست کتب تین سو صفحات میں ختم ہوئی ہے، اس فہرست میں علوم و فنون، تاریخ و جغرافیہ، ادبیات، کتب مذہبی، الٰہیات وغیرہ کی بے شمار کتب درج ہیں،

باب - ۱۶

اردو نثر کا چوتھا یعنی ادبی، تاریخی اور تنقیدی دور
۱۸۵۰ء سے ۱۹۳۶ء تک

تمہید اس سے قبل اردو نثر تین ادوار سے گذر چکی ہے، ابتدائی دور محض تمہید کی حیثیت رکھتا ہے، تیسرا دور نثری ترقی کی زنجیر کی کوئی اہم کڑی

نہیں، البتہ دوسرا دور ایسا ہے جس نے چوتھے دور کے لئے میدان صاف و ہموار کر کے سہولتیں مہیا کر دی تھیں، واضح ہو کہ تیسرے دور کا درمیانی زمانہ اور چوتھے دور کا ابتدائی زمانہ دوش بدوش چلتا نظر آتا ہے، تیسرے دور میں جہاں مقفٰے اور مسجع عبارتیں لکھی جا رہی ہیں، وہاں چوتھے دور میں غالبؔ کے خطوط اور سر سید احمد خاں کے علمی مضامین دنیائے ادب میں گلکاریاں کر رہے تھے مقصد عرض کرنے کا یہ ہے، کہ چوتھے دور کی تدریجی ترقی کا تعلق تیسرے نہیں، بلکہ دوسرے دور سے ہے۔

چوتھے دور کی ابتدا میں غالبؔ کے خطوط ملتے ہیں، ان کا تعلق نہ دوسرے دور سے ہے اور نہ چوتھے دور سے، اس لئے مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان کا تذکرہ یہاں تمہید میں کر دیا جائے۔

غالبؔ کے خطوط

غالبؔ کے حالات زندگی اور ان کی تقاریظ کے لئے ملاحظہ ہوں ابواب ۸ اور ۱۵

مرزا غالبؔ ۱۸۵۰ء تک خط و کتابت ہمیشہ فارسی میں کرتے تھے، ان کے فارسی خطوط کے مطالعہ سے ثابت ہوتا ہے، کہ ان کا ادبی پایہ بہت بلند ہے، غالبؔ ان خطوط کو نہایت کاوش سے لکھتے تھے، اور اپنی پوری شاعرانہ قوتیں ان کی نگارش میں صرف کر دیتے تھے، لیکن ایک طرف تو مہر نیم روز کی ترتیب و انشا میں مصروف ہوگئے، دوسری طرف عمر کے تقاضے سے مجبور ہو کر آپ نے فارسی ترک اور اردو خط و کتابت شروع کی، چنانچہ فرماتے ہیں

"زبان فارسی میں خطوط کا لکھنا پہلے سے متروک ہے، پیرانہ سری اور ضعف

کے صدموں سے محنت پژمردہ ہی اور جگر کاوی کی قوت مجھ میں نہیں رہی، حرارت غریزی کو زوال ہے اور یہ حال ہے :-

مضمحل ہو گئے قویٰ غالبؔ   اب عناصر میں اعتدال کہاں!

آپ کے خطوط کے دو مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ ایک "اردوئے معلیٰ" اور دوسرا "عود ہندی"۔

خطوط غالبؔ کی عبارت صاف، سادہ، سلیس، رواں اور بے تکلف ہے۔ یہ ایک زبردست اجتہاد ہے، جو غالبؔ نے خطوط نویسی میں کیا۔ لیکن اس سے بھی بڑھ کر اجتہاد یہ کیا، کہ القاب و آداب اور دیگر امور جن کو لوازم نامہ نگاری قرار دیا جاتا تھا، سب کو یک قلم ترک کر دیا۔ وہ خط کو کبھی میاں، کبھی بھائی صاحب، کبھی مہاراج، کبھی برخوردار، کبھی قبلہ، کبھی کچھ اور مناسب لفظ سے شروع کرتے ہیں۔ بعض اوقات یہ الفاظ بھی نہیں لکھتے، سرے ہی سے مدعا لکھنا شروع کر دیتے ہیں، مثلاً منشی ہر گوپال تفتہ کے نام ایک خط اس طرح شروع کیا ہے۔

"دیکھو صاحب! یہ باتیں ہم کو پسند نہیں۔" میر مہدی مجروح کے نام ایک خط ان الفاظ سے شروع کیا گیا ہے :-

"مار ڈالا یار تیری جواب طلبی نے" ان ہی کے نام ایک اور خط کی ابتدا ان الفاظ سے ہوئی ہے:-

"آہا ہا ہا۔ میرا پیارا مہدی آیا۔ آؤ بھائی مزاج تو اچھا ہے۔ بیٹھو۔"

اس میں شک نہیں کہ زمانے کی عام روش کو چھوڑ کر سلیس اور سادہ عبارت لکھنا اور القاب و آداب کو جنہیں لوازم انشاپردازی اور معیار علم و فضل سمجھا جاتا

تھا۔ ترک کر دینا غالب کا کمال اجتہاد ہے۔ لیکن یہ امور وہ نہیں جنھوں نے غالب کی انشاپردازی کو زندہ جاوید بنایا۔ دراصل غالب نے اپنی نثر میں ایک نئی راہ نکالی، اور اس کی سادگی میں وہ شان پیدا کی کہ آج تک کسی کو نصیب نہ ہوئی، ان کی تحریر میں سلاست و متانت بھی ہے تو شوخی و ظرافت بھی، زبان میں دلکشی ہے، تو انداز بیان میں دلفریبی بھی۔ تحریر میں نہ تکلف معلوم ہوتا ہے، نہ تصنع، حالانکہ بقدر چاشنی تکلف بھی ہے، اور تصنع بھی۔ پڑھنے میں خط اور معلوم ہوتا ہے، کہ بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ دوران گفتگو میں کہیں تبسم زیر لب ہے کہیں قہقہہ، کہیں شوخی ہے کہیں دل لگی یہی وجہ ہے، کہ پڑھنے والا پڑھتا ہے اور سیر نہیں ہوتا اور یہی انشاپردازی کا کمال ہے۔

"یادگار غالب" میں حالی غالب کی خطوط نویسی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ادائے مطلب کا طریقہ بالکل ایسا ہے، جیسے دو آدمی بالمشافہ بات چیت یا سوال جواب کرتے ہیں۔ مثلاً ان کو یہ لکھنا تھا کہ محمد علی بیگ۔ میرے کوٹھے کے نیچے سے گزرا میں نے پوچھا کہ لوہارو کی سواریاں روانہ ہو گئیں؟ اس نے کہا ابھی نہیں ہوئیں، میں نے کہا کیا آج نہ جائیں گی؟ اس نے کہا آج ضرور جائیں گی تیاری ہو رہی ہے۔ اس مطلب کو اس طرح ادا کرتے ہیں :-

"محمد علی بیگ ادھر سے نکلا۔ بھئی محمد علی بیگ! لوہارو کی سواریاں روانہ ہو گئیں؟ حضرت ابھی نہیں، کیا آج نہ جائیں گی؟ آج ضرور جائیں گی، تیاری ہو رہی ہے"۔

ادائے مطلب کے اس انوکھے طریقے نے مرزا کے خطوط کو ناول اور ڈرامہ کی طرح دلچسپ بنا دیا ہے، لیکن اس سے بھی زیادہ غالب کی فطری شوخی، اور

زندہ دلی نے ان کے خطوط کو باغ و بہار بنایا ہے، حالی کا قول ہے کہ مرزا خط لکھتے
وقت ہمیشہ اس بات کو نصب العین رکھتے تھے، کہ خط میں کوئی ایسی بات
لکھی جائے، کہ مکتوب الیہ اس کو پڑھ کر محظوظ اور خوش ہو، پھر جس رتبہ کا مکتوب الیہ
ہوتا تھا اس کی سمجھ اور مذاق کے موافق خط میں شوخیاں کرتے تھے، مثلاً مرزا حاتم علی
بیگ مہر نے اپنی تصویر مرزا کو بھیجی، اس کی رسید اس طرح لکھتے ہیں: -

"حلیہ مبارک نظر افروز ہوا، تمہارا حلیہ دیکھ کر تمہارے کشیدہ قامت ہونے
پر مجھے رشک نہ آیا، کس واسطے کہ میرا قد بھی درازی میں انگشت نما ہے، تمہارے
گندمی رنگ پر رشک نہ آیا، کس واسطے کہ جب میں جیتا تھا، تو میرا رنگ چمپئی تھا
اور دیدہ ور لوگ اس کی ستائش کرتے تھے، اب جو کبھی مجھ کو وہ اپنا رنگ یاد آتا
ہے، تو چھاتی پر سانپ سا پھر جاتا ہے، ہاں مجھ کو رشک آیا، اور میں نے خون
جگر کھایا، تو اس بات پر کہ داڑھی گھٹی ہوئی ہے، وہ مزے یاد آ گئے، کیا کہوں جی
پر کیا گذری، بقول علی حزیں

تا دسترسم بود زدم چاک گریباں   شرمندگی از خرقۂ پشمینہ ندارم

جب داڑھی مونچھ میں بال سفید آ گئے، تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر
آنے لگے، اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے، ناچاری بھی
چھوڑ دی اور داڑھی بھی، مگر یاد رکھیے کہ اس بھونڈے شہر میں ایک وردی ہے عام
ملا، حافظ، بساطی، نیچہ بند، دھوبی، سقہ، بھٹیارہ، منہ پر داڑھی، سر پر بال، فقیر نے
جس دن داڑھی رکھی، اسی دن سر منڈایا"

ایام غدر میں مرزا نہایت تنگی و عسرت سے گذر اوقات کرتے تھے، اس

حالت کو ایک خط میں اس طرح بیان کرتے ہیں :-

"اس ناداری کے زمانے میں جس قدر کپڑا اوڑھنا بچھونا گھر میں تھا سب بیچ بیچ کر کھا گیا گویا اور لوگ روٹی کھاتے تھے اور میں کپڑا کھاتا تھا۔"

ایک خط نواب انوار الدولہ سعد الدین خاں بہادر شفق کے نام ہے۔

"کیوں کر کہوں میں دیوانہ نہیں ہوں، ہاں اتنے ہوش باقی ہیں، کہ اپنے کو دیوانہ سمجھتا ہوں، یہ کیا ہوشمندی ہے! قبلہ ارباب ہوش کو خط لکھتا ہوں، نہ القاب نہ آداب، نہ بندگی نہ تسلیم، سن غالب ہم تجھ سے کہتے ہیں، بہت مصاحب نہ بن، ایاز قدر خود بشناس۔ مانا کہ تو نے کئی برس بعد رات کو نوبت کی غزل لکھی ہے، اور آپ اپنے کلام پر وجد کرتا ہے، مگر یہ تحریر کی کیا روش ہے، پہلے القاب لکھو، پھر بندگی عرض کرو، پھر ہاتھ جوڑ کر مزاج کی خبر پوچھو، پھر عنایت نامہ کے آنے کا شکر ادا کر . . . "

مرزا کی شگفتگی تحریر معمولی روزمرہ کے معاملوں تک ہی محدود نہیں ہے، بلکہ تعزیت ناموں تک میں بجائے افسردگی کے ندرت بیان سے لطف کلام پیدا ہوتے ہیں، مثلاً یوسف مرزا کو لکھتے ہیں:۔

"یوسف مرزا! کیوں کر تجھ کو لکھوں، کہ تیرا باپ مر گیا اور لکھوں تو آگے کیا لکھوں، کہ اب کیا کرو، مگر صبر یہ ایک شیوۂ فرسودہ ابنائے روزگار کا ہے تعزیت یوں ہی کیا کرتے ہیں، کہ صبر کرو، ہائے ایک کا کلیجہ کٹ گیا، اور لوگ اسے کہتے ہیں کہ تو نہ تڑپ، بھلا کیوں نہ تڑپے گا . . . "

اس جبلی شوخی اور زندہ دلی کے باوجود مرزا کو یاس و حسرت اور غم و اندوہ کی

مرقع کشی میں بھی کمال حاصل ہے، ایک خط میں لکھتے ہیں

"ناتوانی زور پر ہے، بڑھاپے نے نکما کر دیا ہے، ضعف، سستی، کاہلی، گرانجانی
رکاب میں پاؤں ہے، بگ پر ہاتھ ہے، بڑا سفر دور و دراز درپیش ہے، زاد راہ موجود نہیں
خالی ہاتھ جاتا ہوں، اگر ناپرسیدہ بخش دیا تو خیر، اور اگر بازپرس ہوئی تو سقر مقر ہے
اور ہاویہ زاویہ ہے، دوزخ جاوید ہے اور ہم ہیں، ہائے کسی کا کیا اچھا شعر ہے

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے　　مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

حصہ اوّل

بانیٔ تہذیب الاخلاق اور تہذیب الاخلاق کا اثر

سرسید احمد خاں

حالی نے سرسید کے سوانح حیات پر ایک ضخیم کتاب موسومہ "حیات جاوید" تصنیف کی ہے جو بڑی دلچسپ اور پُر از معلومات ہے۔ یہاں نہایت اختصار کے ساتھ سرسید کے حالات زندگی پیش کئے جاتے ہیں۔

سید احمد خاں ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دلی میں پیدا ہوئے۔ آپ حسینی سید تھے۔ آپ کے آباء و اجداد شاہجہان کے عہد میں ہرات سے ہندوستان آئے اور اس وقت سے اکبر شاہ ثانی کے زمانہ تک شاہان مغلیہ کی مختلف خدمات انجام دیتے رہے۔ اکبر شاہ ثانی نے سرسید کے والد میر تقی کو عہدہ وزارت کے

لئے نامزد کیا، مگر انہوں نے اپنی قناعت پسندی کی وجہ سے انکار کر دیا۔
سرسید کی ابتدائی تعلیم و تربیت ان کی والدہ کی زیر نگرانی ہوئی۔ ۱۸۳۶ء میں میر تقی کا انتقال ہو گیا، تو سرسید کو ملازمت کا خیال پیدا ہوا، کچھ دنوں تک عدالتی کارروائی سے واقفیت حاصل کرنے کے بعد صدر امینی میں سررشتہ داری مل گئی لیکن اپنی ذاتی قابلیت و صلاحیت کی بدولت ترقی کرتے کرتے صدر امین کے عہدے تک پہنچ گئے۔

دوران ملازمت میں علم کا ذوق برابر کام کرتا رہا۔ چنانچہ دہلی کی منصفی کے زمانے میں آپ نے دہلی کی عمارات کے متعلق تحقیقات کی، اور اپنی کاوش اور جستجو کے نتیجہ کو "آثار الصنادید" نامی کتاب کی شکل میں پیش کیا، جو بڑی مفید اور کارآمد کتاب ہے۔ دوران قیام دہلی ہی میں اور بھی چند رسالے آپ نے تصنیف کئے، جو زیادہ تر مذہبی مبحث پر ہیں۔
۱۸۵۸ء میں آپ مرادآباد تبدیل ہوئے، وہاں آپ نے تاریخ "سرکشی بجنور" شائع کی، اس میں مئی ۱۸۵۷ء سے لے کر اپریل ۱۸۵۸ء تک کے حالات و واقعات غدر جو ضلع بجنور میں گذرے تفصیل کے ساتھ بیان کئے ہیں۔
آپ نے ایک انگریزی اسکول مرادآباد میں اور دوسرا غازی پور میں کھولا اور غازی پور میں ایک سائنٹفک سوسائٹی قائم کی جس کا مقصد مسلمانوں میں مغربی علوم و فنون سے بیداری پیدا کرنا تھا۔ اس کے علاوہ ایک اور انجمن انہوں نے قائم کی جس کا نام برٹش انڈیا ایسوسی ایشن تھا۔
۱۸۶۴ء میں آپ غازی پور سے تبدیل ہو کر علی گڑھ آئے اور سائنٹیفک

سوسائٹی کو بھی وہیں منتقل کر دیا۔ ۱۸۶۶ء میں آپ نے سائنٹیفک سوسائٹی سے اخبار نکالا جو آخر کو علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ کے نام سے آخر دم تک جاری رہا۔ اس اخبار میں سماجی، اخلاقی، علمی اور سیاسی مضامین چھپتے تھے، اور یہ مضامین زیادہ تر سر سید ہی کے ہوتے تھے۔

سر سید کو ابتدا ہی سے مسلمانوں کی اصلاح کی دھن تھی، اور ان میں تعلیم پھیلانے کا شوق تھا، لہٰذا آپ اصول و طرز تعلیم سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے انگلستان تشریف لے گئے، سال بھر کے بعد واپس آئے، انہوں نے سب سے پہلے مسلمانوں کے مذہبی خیالات کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا، چنانچہ رسالہ "تہذیب الاخلاق" جاری کیا۔ ۲۴ر دسمبر ۱۸۷۰ء کو اس کا پہلا نمبر شائع ہوا، اور پورے چھ برس تک برابر نکلتا رہا۔

جولائی ۱۸۷۶ء میں آپ نے پنشن لی، اور ملازمت سے کنارہ کش ہو کر علی گڑھ چلے آئے، اور علی گڑھ کالج کے کام میں ہمہ تن مصروف ہو گئے، آخر ۱۸۷۷ء میں کالج کا سنگ بنیاد رکھا گیا، یہ کالج ترقی کرتا کرتا آج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام سے موسوم ہے۔

سر سید کو آخر وقت تک قومی خدمات کی دھن اور کالج کی بہبودی کا خیال رہا، آخر ۱۸۹۸ء میں اس محسن قوم نے جہان فانی سے کوچ کیا۔ سر سید نے قوم کی بہبودی کے لئے جو جو کام کئے، ان کے تذکرہ کا یہ موقع نہیں، البتہ جو احسانات آپ نے اردو زبان پر کئے، ہمیں ان سے سروکار ہے، آپ کی تصانیف کی فہرست کافی لمبی چوڑی ہے، جن میں سے دو چار کے نام اوپر گذر چکے ہیں،

لیکن مہتم بالشان خدمت جو آپ نے اردو زبان کی کی، اس کا ذریعہ تہذیب الاخلاق
ہے، آپ خود اس کے اڈیٹر اور منیجر تھے، اور زیادہ تر خود ہی مضامین لکھا کرتے
تھے، دیگر مضمون نگاروں میں مولوی سید مہدی علی خاں اور مولوی چراغ علی
خاص طور پر قابل ذکر ہیں،

سر سید کی عبارت صنائع و بدائع اور تکلفات بارده سے یکسر پاک ہوتی
ہے، جس بات کو لکھتے ہیں قلم بر داشتہ، لیکن اسے دلائل و براہین سے مضبوط
کرتے جاتے ہیں، مشکل سے مشکل اور دقیق سے دقیق مبحث پر جب قلم اٹھاتے
ہیں تو اسے سادگی اور صفائی سے اس طرح بیان کرتے ہیں، کہ فوراً ذہن نشین
ہو جاتا ہے، الفاظ سیدھے سادے مگر زوردار، اگر کوئی غلط یا متروک لفظ
ن کے مفہوم کو بہتر طریقہ پر ادا کرتا ہے، تو اسے بے تکلف استعمال کرتے ہیں،
صول اور قواعد کی پابندی اگر ادائے مطالب میں مانع آتی ہے، تو اس سے
سبکدوش ہونے میں تنگی نہیں سمجھتے، بعض اصحاب اس خصوصیت کو عیب
سمجھتے ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ بجز اس کے چارہ ہی کیا تھا، زبان اظہار
مطالب کے لئے ہے، اگر اصول و قواعد اس مقصد کے حصول میں مانع ہوں
تو ان کی پابندی کیونکر کی جا سکتی ہے، بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں، کہ سر سید
کا طرز کہیں کہیں خشک اور بے لطف ہو گیا ہے، لیکن اس خشکی اور بے لطفی
کی ذمہ دار زیادہ تر نوعیت مطالب ہے، ناول یا افسانہ میں اس قسم کی
خشکی ناقابل عفو سہی لیکن علمی اور فلسفیانہ مضامین میں یہ خشکی اکثر ناگزیر ہوتی ہے
آخر میں یہ بھی عرض کر دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ تہذیب الاخلاق نے اردو

زبان کی خدمات کیونکر انجام دیں، اول تو اس نے اردو میں علمی، ادبی، اور مذہبی وغیرہ مضامین کا ایک وافر ذخیرہ جمع کر دیا، دوسرے اس کے مضمون نگاروں نے بھی اسی رنگ کے مضامین لکھے، اور اس طرح ملک میں ایک جماعت علمی مذہبی، سماجی وغیرہ مضامین لکھنے والوں کی پیدا ہوگئی تیسری اور سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے، کہ چونکہ "تہذیب الاخلاق" کے مضامین بھی اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل انوکھے ہوتے تھے اس لئے ملک میں ایک بڑی جماعت اس کے خلاف ہوگئی تھی، یہ لوگ "تہذیب الاخلاق" کے مضامین کا رد لکھتے تھے، اور اپنے جواب کو ہر صورت سے اصل مضمون کا جواب بنانے کی کوشش کرتے تھے، اس طرح ان جوابی مضامین میں سرسید کا طرز نگارش بھی اختیار کیا جاتا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا، کہ سلیس اور عام فہم اردو نثر کا ملک میں چرچا ہوگیا

نواب اعظم یار جنگ مولوی چراغ علی

آپ کے آبا و اجداد کشمیر کے رہنے والے تھے، آپ کے جد امجد کشمیر سے پنجاب اور پھر پنجاب سے میرٹھ آکر آباد ہو گئے تھے، آپ کے والد مولوی محمد بخش سہارنپور میں کلکٹر کے دفتر میں ہیڈ کلرک تھے، لیکن جب انگریزوں کا تسلط پنجاب پر ہوگیا، تو آپ محکمہ بندوبست میں منتقل ہو کر ترقی کرتے کرتے مہتمم بندوبست ہو گئے، افسوس کہ آپ اپنی اولاد کو خاطر خواہ تعلیم نہ دلا سکے اور عین عالم جوانی میں سنہ ۱۸۵۶ء میں انتقال فرمایا، اس وقت مولوی چراغ علی کی عمر بارہ برس کی تھی،

مولوی چراغ علی نے اپنی دادی اور والدہ کے زیر سایہ میرٹھ میں تعلیم پائی،

لیکن یہ تعلیم بالکل معمولی تھی، اور سوائے معمولی اردو فارسی، انگریزی کے نہ کسی اور علم کی تحصیل کی تھی، اور نہ کوئی امتحان پاس کرنے پائے تھے، کہ ضلع بستی ڈسٹری گورکھپور میں خزانے کی منشی گری پر جس کی تنخواہ بیس روپے تھی، آپ کا تقرر ہو گیا مطالعہ کتب اور لکھنے پڑھنے کا شوق ابتدا سے تھا، سرکاری کام کے بعد باقی تمام وقت لکھنے پڑھنے میں صرف ہوتا تھا، چنانچہ پادری عماد الدین کی کتاب "تاریخ محمدی" کے جواب میں آپ کا رسالہ "تعلیقات" اسی زمانہ کا لکھا ہوا ہے، اس کے علاوہ "منشور محمدی"، "مخبر صادق"، "الکھنو" وغیرہ میں بھی آپ کے اکثر مضامین شائع ہوئے،

مولوی صاحب اپنی ذاتی قابلیت کی مدد سے منشی گری سے ترقی کر کے ڈپٹی منصری تک پہنچے، اور پھر تحصیلدار ہو گئے مذہبی مباحث اور مضمون نویسی کی وجہ سے سر سید احمد خاں سے تعارف ہو گیا تھا، چنانچہ ان کی سعی سے آپ حیدرآباد میں مددگار معتمد مالگذاری کے عہدے پر مقرر ہوئے اور چار سو روپیہ ماہوار آپ کی تنخواہ مقرر ہوئی، وہاں بھی آپ نے نہایت خوش اسلوبی سے فرائض کو انجام دیا اور ترقی کر کے معتمد مال کے عہدہ پر فائز ہوئے، آخر ۱۸۹۵ء میں آپ نے انتقال فرمایا،

مولوی چراغ علی متعدد علوم اور متعدد زبانوں کے عالم تھے، سر سید ان کی وفات کے حال میں لکھتے ہیں "متعدد علوم میں نہایت اچھی دستگاہ رکھتے تھے، عربی زبان اور عربی علوم کے عالم تھے، فارسی نہایت عمدہ جانتے تھے، اور بولتے تھے، عبری و کالڈی میں نہایت اچھی دستگاہ رکھتے تھے لیٹن اور

گر یک بقدر کارروائی جانتے تھے، اعلیٰ درجے کے مصنف تھے، انگریزی زبان میں بھی انہوں نے کتابیں تصنیف کی ہیں۔

آپ اپنے ہم عصروں میں سب سے زیادہ محقق اور وسیع النظر اور ایک زبردست مصنف تھے، ان کی تمام تصانیف اسلام کی حمایت میں ہیں، ان کی عبارت میں لفاظی اور عبارت آرائی مطلق نہیں ہوتی، اور نہ انہیں فصاحت و بلاغت کے قواعد کی پروا ہوتی ہے، مضامین کو دلائل سے مضبوط کرتے ہیں اور مطلب سے مطلب رکھتے ہیں، جو کچھ کہنا چاہتے ہیں وہی کہتے ہیں، ادھر ادھر کی باتوں سے نہ اپنا وقت صائع کرتے ہیں نہ پڑھنے والے کا۔ "تہذیب الاخلاق" میں اکثر آپ کے مضامین شائع ہوئے ہیں۔

نواب محسن الملک مولوی سید مہدی علی خاں

میر مہدی علی خلف الرشید میر ضامن علی

۹ دسمبر ۱۸۳۷ء کو پیدا ہوئے، آپ کا تعلق سادات بارہہ کے ایک خاندان سے تھا جو اٹاوہ میں سکونت پذیر ہو گیا تھا۔

میر مہدی علی نے عربی و فارسی کی ابتدائی تعلیم اٹاوہ ہی میں حاصل کی، اور دس روپے ماہوار پر کلکٹری میں ملازم ہو گئے، رفتہ رفتہ ترقی کر کے اہلمدی اور سررشتہ داری کے مدارج طے کرتے ہوئے ۱۸۶۱ء میں تحصیلدار ہو گئے، اور ۱۸۶۳ء میں منشی کلکٹری کے عہدہ پر فائز ہوئے۔

دوران ملازمت میں لکھنے پڑھنے کا شوق دامن گیر تھا، چنانچہ "آیات بینات" نامی ایک مذہبی کتاب لکھ کر شائع کی، اسی زمانہ میں سرسید سے شناسائی ہوئی

اور یہ شناسائی آگے چل کر دوستی کے تعلقات میں نمودار ہوئی،

۱۸۶۷ء میں ریاست حیدرآباد نے آپ کو طلب کیا، اور انسپکٹر جنرل مالیات کے عہدے پر مقرر کر دیا۔ رفتہ رفتہ ترقی کر کے آپ معتمد مال ہو گئے، اور تین ہزار روپے آپ کی تنخواہ ہو گئی۔ حسن خدمات پر ریاست کی طرف سے محسن الدولہ محسن الملک منیر نواز جنگ کے خطابات عطا ہوئے، ۱۸۹۳ء میں پنشن لے کر آپ علی گڑھ چلے آئے۔ اور بقیہ عمر قومی خدمت اور کالج کے انتظام میں صرف کی، چنانچہ سرسید کے بعد علی گڑھ کالج کے سیکرٹری بھی ہو گئے، آخر ۱۹۰۷ء میں آپ کا انتقال ہوا

آپ کی تصانیف حسب ذیل ہیں،

۱۔ مضامین تہذیب الاخلاق ۲۔ مکمل مجموعہ لکچر

۳۔ تقلید و عمل بالحدیث ۴۔ مکاتیب

۵۔ مسلمانوں کی تہذیب ۶۔ آیات بینات

۷۔ کتاب المحبت والشوق

نواب محسن الملک اعلیٰ درجہ کے مقرر اور شیریں زبان تھے، برجستہ تقریر کرتے تھے، تہذیب الاخلاق میں اکثر آپ کے مضامین شائع ہوئے ہیں، آپ کو زبان پر حیرت انگیز قدرت حاصل تھی، چنانچہ آپ کی عبارت صاف اور سلجھی ہوئی ہوتی ہے انداز تحریر قابل تعریف ہے، منطقی استدلال اور تحقیق و تدقیق کا مادہ پایا جاتا ہے اگرچہ آپ سرسید کے مقلد ہیں لیکن پھر بھی آپ کی عبارت میں جدت پسندی پائی جاتی ہے، صفائی اور سلاست پر کہیں کہیں صنائع و بدائع کی رنگینی، عبارت میں دلکشی و شگفتگی پیدا کر دیتی ہے، عام طور پر انداز بیان میں زور اور عبارت میں

توازن پایا جاتا ہے،

حصہ دوم
شموس ستّہ

شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد

حالات زندگی کے لئے ملاحظہ ہو باب ۱۰
مولانا آزاد کی انشاپردازی مسلم الثبوت ہے آپ نے اپنی بیش بہا تصانیف اور بے مثل طرز نگارش سے جو احسانات زبان اردو پر کئے ہیں ان کا کما حقہ اظہار بہت دشوار ہے حقیقت یہ ہے کہ آپ کا مرتبہ محسنین زبان اردو میں بہت بلند ہے۔

آپ کے تبحر علمی اور طبیعت کی ہمہ گیری نے مختلف موضوع پر قلم اٹھایا، تاریخ ادب سے اردو کو روشناس کیا، تنقید کی بھی ابتدا کی، علم اللسان سے متعلق تحقیقات کی تاریخ لکھی، انگریزی تمثیلی افسانوں سے اردو کو مالا مال کیا، غرض یہ کہ اردو کو وسعت دینے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔

اردو قاعدے، قواعد اردو، قصص ہند وغیرہ کے علاوہ مولانا کی مندرجہ ذیل تصنیفات پر اردو زبان وادب کو فخر ہے:۔

۱۔ آب حیات، (اردو شعر و سخن کی تاریخ ہے اشعراء کے کلام پر تنقید بھی کی گئی ہے)

۲۔ نیرنگ خیال (انگریزی تمثیلی افسانوں کی جنہیں ایلی گری ALLEGARY

کہتے ہیں تقلید میں لکھی گئی ہے۔ اس میں متعدد مضامین ہیں)

۳۔ دربار اکبری (شہنشاہ اکبر کے عہد کی تاریخ ہے)

۴۔ سخندانِ پارس (علم السنہ یعنی فیلالوجی پر ہے)

۵۔ دیوان ذوق (حضرت ذوق کے منتشر کلام کو یکجا کر کے جستہ جستہ حالات کے ساتھ مرتب کیا ہے)

مولانا آزاد کا طرز تحریر دورِ سوم اور دورِ چہارم کے مصنفین کے طرز تحریر کے درمیان ایک اعتدال کی مثال ہے۔ نہ تو وہ اس قدر رنگین ہے، کہ تصنع اور آورد کا عیب آنے پائے، اور نہ اس قدر عاری کہ خشکی اور بے لطفی کی شکایت ہونے پائے مولانا کے طرز تحریر کی بنیاد ٹھیٹھ زبان، صحت محاورہ، اور دلکشی تشبیہ و استعارہ پر ہے، عبارت میں سادگی، اور بے تکلفی سے ایک حسن پیدا ہو جاتا ہے، مولانا کے قلم میں وہ جادو ہے، کہ جس چیز کو بیان کرتے ہیں، اس کی تصویر آنکھوں میں پھرنے لگتی ہے، جذبات نگاری پر وہ قدرت ہے کہ جب چاہیں پڑھنے والوں کو ہنسا دیں، جب چاہیں رلا دیں، بیان میں وہ زور ہے کہ جو بات پڑھنے والوں کے دلوں میں پیدا کرنا چاہتے ہیں، پیدا کر دیتے ہیں، آپ کی نثر میں نظم کا لطف ہے، اور آپ کے جملوں میں شعر کا سا اثر ہے۔

"آبِ حیات" اور "دربار اکبری" انشاء پردازی کے لحاظ سے آپ کی بہترین تصانیف ہیں، جن میں ناول سے زیادہ لطف اور ڈرامہ سے زیادہ دلچسپی ہے، لیکن بعض لوگوں کا خیال ہے، کہ دونوں کتابوں میں تحقیق سے کام نہیں لیا گیا ہے، بلکہ بعض اَن ہونی باتوں کو محض طرزِ ادا کے جادو سے چمکا دیا ہے۔ اس

اعتراض میں ایک حد تک صداقت بھی ہے لیکن ان دونوں کتابوں کے مفید اور کارآمد ہونے میں کوئی شک نہیں، یقین ہے، کہ یہی دو کارنامے مولانا کی حیات جاودان کے سبب بنیں گے،

مولانا محمد حسین آزاد کا طرز جس قدر دلچسپ ہے، اسی قدر نا قابل تقلید بھی ہے، اکثر ان کے طرز کی تقلید کی گئی لیکن بجز ناکامی کچھ حاصل نہیں ہوا لیکن اس طرز میں ایک خامی بھی ہے، اور وہ یہ کہ یہ طرز محض قصہ کہانیوں اور افسانوں ہی کے لئے موزوں ہو سکتا ہے علمی فلسفی و تاریخی مطالب کے لئے یہ طرز اختیار نہیں کیا جا سکتا، اس میں اتنی گنجائش نہیں ہے، کہ اس قسم کے مطالب اس میں ادا کئے جا سکیں،

مولوی ذکاء اللہ خاں

۲۔ شمس العلماء خان بہادر مولوی ذکاء اللہ خاں

۱۸۳۲ء میں دہلی میں پیدا ہوئے، آپ کے والد حافظ ثناء اللہ نہایت دیندار اور پابند صوم و صلوٰۃ بزرگ تھے، مولوی ذکاء اللہ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد بارہ برس کی عمر میں دہلی کالج میں داخل ہوئے، تعلیم سے فارغ ہو کر آپ اسی کالج میں معلم ریاضی مقرر ہو گئے، اس کے بعد آپ آگرہ کالج میں معلم اردو ہو گئے، اس کے بعد ۱۸۵۵ء میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس مقرر ہو کر اضلاع بلند شہر و مراد آباد میں رہے، اور گیارہ سال تک اس عہدہ پر عمدگی سے کام کرتے رہے،

۱۸۶۹ء میں آپ میور کالج الہ آباد کے پروفیسر مقرر ہوئے جہاں پندرہ سال تک ایم اے تک کی کلاسوں کو عربی و فارسی پڑھاتے رہے آخر ۷۶

سال کی سرکاری ملازمت کے بعد آپ نے پنشن لی، اور چوبیس سال تک آپ بفراغت تمام تصنیف و تالیف میں منہمک رہے، آخر ۱۹۲۰ء میں راہیٔ ملک بقا ہوئے۔

مولوی ذکا اللہ نے اردو زبان کی جو خدمات کی ہیں وہ ہمیشہ قابل تحسین و تشکر رہیں گی، ریاضیات تاریخ و جغرافیہ علم ادب علم اخلاق طبیعیات ہیئت اور سیاست مدن وغیرہ علوم پر آپ کی تصانیف کی تعداد ۱۴۳ تک پہنچی ہے۔ ان مستقل تصانیف کے علاوہ وقتاً فوقتاً مختلف موضوعوں پر مضامین لکھتے رہتے تھے، جو ملکی رسائل و اخبارات میں شائع ہوتے رہتے تھے، اگر ان تمام مضامین کو یکجا کیا جائے تو یہ مجموعہ کئی ضخیم جلدوں کے برابر نکلے گا، ان مضامین میں تاریخ فلسفہ، سائنس کیمیا، طرز معاشرت، علم المعیشت، سیاست غرض مشکل سے کوئی مضمون رہا ہوگا، جس پر آپ نے طبع آزمائی نہ فرمائی ہو، کثرت تصانیف کے لحاظ سے اردو کا کوئی مصنف آپ کے مقابلہ میں پیش نہیں کیا جا سکتا۔

آپ کا طرز نگارش سلیس، رواں اور بے تکلف ہے، بڑے سے بڑے حال کو نہایت مختصر عبارت میں لکھ دیتے ہیں اور مشکل سے مشکل بات کو چند الفاظ میں سلجھا دیتے ہیں، آپ کی تصانیف ملک میں بہت مقبول ہوئیں، گورنمنٹ نے بھی حسن خدمات کے صلے میں خان بہادر اور شمس العلماء کے خطابات عطا فرمائے، اور پندرہ سو کا ایک انعام بھی دیا۔

آپ کا طرز تحریر کسی قدر روکھا پھیکا ہے یعنی اس میں شگفتگی اور دلکشی نہیں، لیکن بات یہ ہے، کہ جن موضوعوں پر آپ نے طبع آزمائی کی ہے، ان میں شگفتگی

اور دلکشی کا زیادہ امکان بھی نہیں،

۳۔ شمس العلماء ڈاکٹر مولوی سید علی بلگرامی

مولوی سید علی قصبہ بلگرام کے ایک شریف خاندان سے تھے، آپ کے والد زین الدین خاں بنگال اور بہار کے مختلف اضلاع میں ڈپٹی کلکٹری کے عہدہ پر مامور رہے ۱۸۷۵ء میں پنشن لینے کے بعد حیدر آباد میں ایک معزز عہدے پر ممتاز ہو گئے تھے۔ مولوی سید علی اپنے باپ کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے، آپ ۱۸۵۱ء میں پیدا ہوئے چودہ پندرہ سال کی عمر تک عربی و فارسی کی تعلیم حاصل کی، ۱۸۶۶ء میں انگریزی مدرسہ میں داخل ہوئے اور ۱۸۷۶ء میں بی، اے کی ڈگری حاصل کی، بی، اے میں ان کی اختیاری زبان سنسکرت تھی، آپ کا حافظہ بہت قوی تھا، کالج کے پروفیسر آپ کی ذہانت، قابلیت اور حافظے کے قائل تھے،

مولوی صاحب کی قابلیت اور روز افزوں ترقی کو دیکھ کر سر سالار جنگ بہادر نے آپ کو حیدر آباد طلب فرمایا، اور اپنے خاص عملے میں داخل کیا، حیدر آباد پہنچ کر آپ نے علم طبقات الارض، کیمیا، طبیعیات، نقشہ کشی، معدنیات، علم الحیات وغیرہ علوم میں دستگاہ حاصل کی، تکمیل علوم کے لئے آپ ولایت بھی تشریف لے گئے، چنانچہ فرانس، اسپین اور جرمنی کا سفر کیا

مولوی صاحب مختلف زبانیں، لاطینی، انگریزی، جرمنی، فرانسیسی، عربی، فارسی، اردو، سنسکرت، بنگالی، ہندی، مرہٹی، تلنگی اور گجراتی خوب جانتے تھے ۱۸۹۳ء میں گورنمنٹ نے انہیں شمس العلماء کا خطاب عطا فرمایا، ۱۹۰۱ء

میں آپ انگلستان جاکر مقیم ہوئے، اور ۱۹۰۲ء میں کیمبرج یونیورسٹی میں مرہٹی زبان کے لکچرار مقرر ہوئے،

آخر عمر میں ہردوئی میں قیام کر لیا تھا، اور قوم کی خدمت میں وقت صرف کرنے لگے تھے، آخر ۱۹۱۱ء میں اس دنیا سے کنارہ کش ہوئے،

مولوی صاحب کے کارنامے زیادہ تر ترجمے ہیں، جن میں تمدن ہند اور تمدن عرب نے آپ کے نام نامی کو خوب روشن کیا، یہ دونوں کتابیں موسیو لیبان کی تصنیف کردہ اور فرانسیسی زبان میں ہیں، آپ نے ان کا اردو ترجمہ کیا، اور اس قابلیت سے کیا، کہ خاص آپ ہی کی تصانیف معلوم ہوتی ہیں، آپ نے اردو ترجمے میں شاذونادر ہی کہیں انگریزی یا دیگر یورپی زبانوں کا لفظ استعمال کیا ہے اصطلاحات کا ترجمہ نہایت خوبی سے کیا گیا ہے، زبان پر آپ کو قدرت کامل حاصل ہے، روز مرہ محاورہ کا جائز صرف خوبی سے ہوتا ہے، عبارت میں سلاست اور روانی بدرجہ احسن موجود ہے،

شمس العلماء مولوی نذیر احمد — حالات زندگی اور ادبی خدمات کے لئے آئندہ باب ملاحظہ ہو۔

نوٹ:۔ اگرچہ مولوی نذیر احمد صاحب کا تذکرہ یہیں ہونا چاہئے تھا لیکن خاکسار نے اپنے ذہن میں جو تاریخ ادب کا خاکہ بنا رکھا ہے، اس کی رو سے آپ کا شمار ناول نگار حضرات کی انجمن میں بہ حیثیت صدر کے ہوگا، ناچیز نے آپ کے نام نامی کو اس دور کے شموس میں شمار تو کر ہی لیا ہے، اب تذکرہ خواہ کہیں منتقل مقام سے خدانخواستہ رتبہ میں کچھ کمی واقع نہ ہوگی،

شمس العلماء مولانا الطاف حسین حالی | حالات زندگی اور آپ کی شاعری کے متعلق ملاحظہ ہو باب ۱۰

مندرجہ ذیل تصنیفات نثر آپ کی زندۂ جاوید ہیں:۔

۱۔ حیات سعدی (شیخ سعدی کی سوانح عمری اور ان کی نظم و نثر پر تبصرہ ہے)

۲۔ مقدمہ شعر و شاعری (شاعری پر ایک مبسوط مضمون ہے جو دیوان حالی کے مقدمے کے طور پر شائع ہوا)

۳۔ یادگار غالب (اسد اللہ خاں غالب کی سوانح عمری اور ان کی فارسی اور اردو نظم و نثر پر تنقید ہے)

۴۔ حیات جاوید (سر سید احمد خاں کی سوانح عمری ہے)

ان کے علاوہ متفرق مضامین ہیں جو تہذیب الاخلاق وغیرہ رسائل میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے، مولوی سید وحید الدین صاحب سلیم نے ان مضامین کو یکجا کر کے ۱۹۰۴ء میں کتاب کی شکل میں شائع کیا تھا،

"مکتوبات حالی" دو جلدوں میں ان کے صاحبزادہ خواجہ سجاد حسین صاحب نے ۱۹۲۵ء میں ترتیب دے کر چھپوائے،

مولانا حالی نے اردو کو سوانح عمری سے روشناس کیا، آپ کی تصانیف حیات سعدی، حیات جاوید وغیرہ سے قبل اردو میں کوئی سوانح عمری موجود نہیں تھی، علاوہ ازیں "مقدمہ شعر و شاعری" اور "یادگار غالب" کے بعض مقامات سے اردو میں حقیقی اور بے لوث تنقید کا اضافہ کیا،

مولانا کی سوانح نگاری پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے، کہ آپ نے تصویر کا ایک

رنگ دکھایا ہے، معائب سے یا تو چشم پوشی کی گئی ہے، یا توجیہ کردی گئی ہے اگرچہ یہ اعتراض ایک حد تک صحیح ہے، لیکن اول تو جو محبت اور عقیدتمندی مولانا کو سرسید اور غالب سے تھی، اس کا تقاضا یہی تھا، کہ ان کے عیب ہنر نظر آئیں، یا عیب سرے سے نظر ہی نہ آئیں، دوسرے سوانح عمری کا کوئی نمونہ زبان اردو میں موجود نہیں تھا، جو مولانا کے لئے چراغ ہدایت بنتا،

مولانا کی انشاپردازی مسلم ہے، آپ کی نثر میں سادگی، سلاست اور صفائی بدرجہ احسن موجود ہے، تصنع اور آورد کا کہیں نام نہیں، بلکہ ہر مقام پر برجستگی اور بےتکلفی پائی جاتی ہے، جس مضمون کو ادا کرتے ہیں، نہایت سادہ عبارت میں تحریر کرتے ہیں، خیالات کا تسلسل اور زبان کی پختگی خود بخود دل پر اثر کرتی ہے، زبان ٹکسالی ہے، اور محاورات کا صحیح استعمال کرتے ہیں، یہ سب باتیں ہیں، لیکن عبارت میں شگفتگی نہیں، انگریزی الفاظ بھی استعمال کرتے ہیں، لیکن بعض اوقات ایسے لفظ بھی استعمال کئے ہیں، جن کا مترادف اردو پیش کرسکتی تھی،

۶ شمس العلماء مولوی شبلی نعمانی

مولانا شبلی ۱۸۵۷ء میں بمقام بندول ضلع اعظم گڈھ پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم مولوی شکراللہ صاحب سے حاصل کی، اور پھر مولوی محمد فاروق صاحب چریاکوٹی سے عربی کی تحصیل کی، اور معقولات و منقولات کی تعلیم کے لئے رامپور، سہارنپور، لکھنو، لاہور وغیرہ مقامات کی سیاحت کرتے رہے، انیس سال کی عمر میں یعنی ۱۸۷۶ء میں حجاز کا سفر کیا، اور فریضہ حج ادا کیا، اور مدینہ

منورہ کے کتب خانہ سے فیض اٹھایا،

مولانا فطری شاعر تھے، اس فن میں کسی کی شاگردی نہیں کی، فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے، اور خوب کہتے تھے، قیام اعظم گڈھ کے زمانے میں وہاں جو مشاعرے ہوتے تھے، تو آپ میر مشاعرہ بنائے جاتے تھے،

گھر والوں نے زمیداری کا جوا آپ کے کندھوں پر رکھنا چاہا، لیکن مولانا اس بے کیف شغل سے عہدہ برآنہ ہوسکے، آخر میں یہ رائے ہوئی کہ آپ وکالت کریں، چنانچہ آپ نے وکالت کا امتحان پاس کیا، اور چندماہ اعظم گڈھ میں وکالت کی، لیکن یہ پیشہ بھی آپ کی افتاد طبع کے خلاف تھا، وکالت ترک کرکے آپ امین دیوانی ہوگئے، لیکن یہاں بھی جی نہ لگا، آخر مستعفی ہوکر مطالعہ و تدریس میں مشغول ہوگئے،

مولانا کے ایک نوجوان بھائی مہدی علی گڈھ کالج میں تعلیم پاتے تھے، ۱۸۸۲ء میں آپ ان سے ملنے گئے، وہاں سرسید سے ملاقات ہوئی، سرسید نے اس جوہر قابل کو پرکھا، اور اسی کالج میں فارسی و عربی کا پروفیسر مقرر کردیا، اس زمانے میں آپ نے سرسید کے کتب خانہ سے بہت فائدہ اٹھایا اور اسی زمانے میں آپ نے تصنیف و تالیف کی طرف توجہ فرمائی، اور سب سے پہلے "المامون" تصنیف کی، اس کے بعد "سیرۃ النعمان" لکھی، اور مصر و شام و روم کا سفر کیا، اس سفر میں آپ نے "الفاروق" کے لئے کافی مسالا جمع کیا، سرسید کے انتقال کے بعد ۱۸۹۸ء میں سولہ سال کی خدمت کے

بعد کالج کی پروفیسری سے استعفا دے دیا، اور اعظم گڈھ میں مستقل قیام کر کے تصنیف و تالیف میں مصروف ہو گئے،

ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ مولوی سید علی بلگرامی نے آپ کو حیدرآباد بلایا، وہاں آپ کو نظامت علوم و فنون کا عہدہ مل گیا، حیدرآباد ہی کے قیام میں آپ نے "الغزالی" "سوانح رومی" "علم الکلام" "الکلام" اور "موازنہ انیس و دبیر" بالترتیب تصنیف فرما کر شائع کیں۔

ندوۃ العلماء ۱۸۹۴ء میں قائم ہوا تھا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کی بہبودی اور فلاح کی تدابیر کی جائیں، لیکن چونکہ مسلمانوں کی اصلاح علماء کی اصلاح پر مبنی ہے، لہذا علماء کی اصلاح اور صحیح طریقہ پر تعلیم دینے کے لئے یہ دارالعلوم قائم کیا گیا، مولوی محمد علی کانپوری اس کے روح رواں تھے، ان کے استعفار دینے پر اس کی حالت خراب ہونے لگی، مولانا شبلی خود لکھنؤ پہنچے، اور ۱۹۰۵ء میں اس دارالعلوم کو اپنے ہاتھ میں لے لیا، ۱۹۱۳ء تک نہایت خیر و خوبی کے ساتھ اسے چلاتے رہے، آخر حاسدین کی رخنہ اندازیوں سے بددل ہو کر اس کی خدمات سے سبکدوش ہو گئے۔

لکھنؤ سے واپس آکر آپ نے اعظم گڈھ میں دارالمصنفین قائم کیا جس کا مقصد یہ تھا، کہ قوم میں اچھے مصنفین کی ایک جماعت پیدا ہو جائے،

یہ دارالمصنفین نہایت آب و تاب کے ساتھ مذہب و علم کی خدمت کر رہا ہے،

مولانا کی جو شہرت ہندوستان اور ممالک غیر میں ہوئی، اس کا اندازہ

اس سے ہوتا ہے، کہ ۱۸۹۲ء میں سلطان ٹرکی نے تمغۂ مجیدی آپ کو عنایت کیا
۱۸۹۴ء میں شمس العلماء کا خطاب گورنمنٹ نے دیا، الہ آباد یونیورسٹی کے فیلو مقرر
ہوئے، رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے ممبر بھی اسی زمانے میں ہوئے، نظام دکن
نے سو روپے ماہوار مقرر کئے، پھر ۱۹۱۲ء میں تین سو روپے ماہوار کر دیئے انگلستان
کے مشہور مشرق شناس پروفیسر براؤن نے اپنی تاریخ "ادبیات فارسی" کی چوتھی
جلد میں مولانا کی شعر العجم سے مستفید و مستفیض ہونا فخر کے ساتھ بیان کیا ہے،

سب سے آخری اور اہم تصنیف سیرت النبی زیر تالیف تھی، کچھ اجزاء تیار
ہو چکے تھے، کچھ باقی تھے، کہ پندرہ روز کی علالت کے بعد ۱۸ر نومبر ۱۹۱۴ء کو وفات
پائی، اور ملک اور قوم اس محسن علم و ادب سے ساری عمر کے لئے محروم ہو گئی۔

تصانیف کی تعداد کے لحاظ سے مولانا شبلی، مولانا ذکاء اللہ کو چھوڑ کر بقیہ
اپنے ہم عصروں سے بہت بڑھے ہوئے ہیں، یوں تو آپ کی تصنیفات بہت
سی ہیں، لیکن زیادہ مشہور یہ ہیں،

المامون، سیرۃ النعمان، الفاروق، سفرنامہ، الغزالی، علم الکلام، سوانح مولانا
روم، موازنہ انیس و دبیر، شعر العجم، سیرۃ النبی، الکلام

مولانا کی جملہ تصنیفات پانچ مستقل شاخوں پر تقسیم ہو سکتی ہیں

(۱) علم الکلام (علم الکلام، الکلام)
(۲) تاریخ (المامون، الفاروق وغیرہ)
(۳) تنقید (موازنہ انیس و دبیر، شعر العجم)
(۴) شعر و شاعری (مجموعہ کلام اردو، دیوان شبلی فارسی وغیرہ)

(۵) متفرق مضامین۔

آپ کی جملہ تصنیفات میں عالمانہ استدلال کا انداز پایا جاتا ہے، آپ کی تاریخی اور تنقیدی کتابوں کی بڑی خصوصیت تحقیق و تدقیق، استحکام رائے اور جانچ پڑتال ہے، طرز ادا میں جدت کے ساتھ دل آویزی اور عام فہمی کا خیال ہر جگہ ملحوظ رکھا گیا ہے۔ فن تنقید کو آپ نے اردو میں رائج کیا۔ آپ کی زبان مستند ہے، طرز تحریر میں صفائی اور سادگی کے علاوہ ایک قسم کا روز ہے، تشبیہ و استعارہ کی چاشنی بھی کہیں کہیں لطف پیدا کر دیتی ہے، پیچیدہ سے پیچیدہ مضامین کو سیدھی سادی عبارت میں سلجھا کر رکھ دیتے ہیں۔ آپ کا اسلوب بیان علمی اور تحقیقی ہے لیکن یہی اسلوب بیان ناول اور افسانہ وغیرہ میں بھی اختیار کیا جا سکتا ہے۔

آخر میں یہ بھی عرض کر دینا مناسب ہے، کہ فی زمانہ علم انسانی میں اضافہ ہو جانے کی وجہ سے آپ کی تاریخی تحقیقات میں کسی کسی مقام پر خامیاں دریافت ہوئی ہیں، لیکن ان چند خامیوں سے مولانا شبلی کی عظمت میں کسی قسم کا فرق نہیں آتا۔

تبصرہ

اردو نثر کا چوتھا دور حقیقت یہ ہے، کہ زرین دور ہے، اگر تاریخ ادب اردو سے اس دور کو خارج کر دیا جائے، تو غریب اردو قطعی تہی دست و فرومایہ رہ جائے اس دور کے مصنفین کا جواب تاریخ ادب پیش کرنے سے قاصر ہے اور امید

نہیں کہ آئندہ اس پایہ کے انشا پرداز پیدا ہو سکیں گے۔ ممالک غیر کے ذی علم حضرات کی اگر نظر پڑتی ہے تو اسی دور کے مصنفین پر پڑتی ہے، اور اگر وہ اردو کی تصنیف سے استفادہ کرتے ہیں، تو وہ اسی دور کی تصنیف ہوتی ہے۔

زبان اس دور کی زبان کے متعلق کچھ لکھنا تحصیل حاصل ہے۔ مختصر یہ کہ نہایت مستند اور مکمل زبان ہے۔

اسلوب بیان اسلوب بیان کے لحاظ سے یہ دور خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس دور کے خاص خاص اسلوب چار ہیں :-

(۱) صاف، سادہ، بے تکلف اور مدلل (سرسید وغیرہ)
(۲) صاف مگر تشبیہ و استعارہ کی گل کاری سے رنگین، (محمد حسین آزاد)
(۳) صاف، بے تکلف، زور دار اور علمی (حالی شبلی وغیرہ)
(۴) عام بول چال، محاوروں کی کثرت، سادہ بے تکلف مگر عربی الفاظ کی کثرت (نذیر احمد)

موضوع گذشتہ تمام ادوار کے خاص خاص موضوع مذہب اور شاعری تھے لیکن اس دور میں اردو علم و ادب کا شعبہ وسیع ہو گیا اور اس کے موضوعات میں ایسا تنوع پیدا ہوا، کہ اس کا شمار بھی ناممکن سا ہو گیا۔ موضوع یوں تو بے شمار ہیں لیکن چند خاص یہ ہیں :-

مذہب اسلام، مذہب اخلاق، تاریخ، سوانح حیات، تحقیق زبان، اصول تنقید، ادبی تنقید، ناول، ڈرامہ، افسانہ۔ ان میں سے ہر موضوع پر شاندار کتابیں لکھی گئیں۔

باب - ۱۷

مابعد دور چہارم

حصہ اول و - ناول نگاران اردو

تمہید

ناول "ناول" انگریزی زبان کا لفظ ہے جس کے لفظی معنی تو ہیں عجیب اور انوکھی چیز کے۔ لیکن اصطلاح میں افسانوں کی ایک خاص صنف کو کہتے ہیں، دور سوم کے اختتام تک اردو میں ناول کا پتہ نہیں، یہ دراصل انگریزی چیز ہے، اور انگریزوں ہی کے ساتھ ہندوستان میں آئی۔ چوتھے دور میں جہاں انگریزی علوم و فنون کا اثر قبول کیا گیا، وہاں "ناول" کو بھی لے لیا گیا، اگرچہ مکمل ناول، دور چہارم کے بعد ہی لکھے گئے،

افسانے افسانہ اردو میں نہایت قدیم چیز ہے، ابتدائی افسانے یا تو فارسی سے ترجمہ کئے گئے یا فارسی افسانوں کی تقلید میں لکھے گئے بڑے بڑے افسانوں میں ذیل کے افسانے خاص طور پر شہرت رکھتے ہیں:-

۱- الف لیلہ ۲- داستان امیر حمزہ ۳- بوستان خیال
۴- طلسم ہوشربا ۵- قصہ حاتم طائی ۶- باغ و بہار

یہ سب افسانے فارسی سے ترجمہ کئے گئے۔ ان کے علاوہ بیتال پچیسی، سنگھاسن بتیسی، گل بکاؤلی، طوطا کہانی، کلیلہ و دمنہ خاص ہندوستانی

پیداوار ہیں، اگرچہ ان میں سے اکثر فارسی ہی سے ترجمہ کئے گئے ہیں، فسانۂ عجائب
خاص اردو کی پیداوار ہے۔

ناول اور افسانہ کا فرق | افسانہ کی بنیاد تمام تر فوق الفطرت عناصر پر ہوتی ہے، ان میں جذبات انسانی اور واقعات
زندگی سے کچھ سروکار نہیں ہوتا، کوئی خاص پلاٹ نہیں ہوتا، البتہ کردار نویسی
ہوتی ہے، واقعات و حادثات خود بخود بلا اسباب کے رونما ہو جاتے ہیں
اور اگر وہ ہیرو کے خلاف پڑیں، تو فوق العادت اسباب ہی سے ان کا تدارک
بھی ہو جاتا ہے، افسانہ کا انجام ہمیشہ ہیرو کی کامیابی پر ہوتا ہے، اور پڑھنے
والے کو اس کامیابی کا اس قدر یقین ہوتا ہے، کہ اگر کسی مقام پر ہیرو مر بھی جائے
تو پڑھنے والے کے اطمینان میں فرق نہیں آنے پاتا، جانتا ہے کہ کہیں نہ کہیں
جیتا جاگتا نظر آجائے گا۔

اس کے خلاف ناول کی بنیاد "عادت اور فطرت" پر ہوتی ہے "ذات
انسانی" اس کا خاص موضوع ہوتا ہے، ناول نگار انسان کا مطالعہ گہری
نظر سے کرتا ہے، ناول کو تعلق انسان کے افعال، خیالات، اغلاط اور
خامکاریوں سے ہے، روزانہ زندگی کے واقعات، انسان کی فطرت، اس
کی تلون مزاجی، خوف، احساسات، جوش، جذبات غرض یہ سب ناول کے موضوع
ہیں۔

اُردو کا پہلا ناول نگار

شمس العلماء مولانا نذیر احمد دہلوی

مولوی نذیر احمد ضلع بجنور میں ۶ دسمبر ۱۸۳۶ء کو پیدا ہوئے مولوی صاحب کے والد مولوی سعادت علی صاحب بجنور میں رہتے تھے چنانچہ مولوی نذیر احمد بھی چار سال کی عمر میں وہیں پہنچے،

ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی پھر مولوی نصر اللہ خاں سے تعلیم پائی اس کے بعد فارغ التحصیل ہونے کے لئے دہلی آئے، اور مولوی عبدالخالق اورنگ آبادی کے شاگرد ہو گئے لیکن مکتبی تعلیم سے مولوی نذیر احمد دل برداشتہ تھے، چنانچہ ۱۸۴۲ء میں آپ دہلی کالج میں داخل ہو گئے اور کالج میں ان کا وظیفہ بھی مقرر ہو گیا، مولوی صاحب کی عمر چودہ سال کی تھی، کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا، چار برس بعد یعنی ۱۸۵۴ء میں کنجاہ ضلع گجرات میں چالیس روپیہ ماہوار پر مدرس ہو گئے، دو برس بعد ڈپٹی انسپکٹر ہو کر کانپور پہنچے لیکن انسپکٹر مدارس سے کچھ بگاڑ ہو جانے پر استعفا دے کر دہلی چلے آئے،

غدر ۱۸۵۷ء کے بعد آپ ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہو کر الہ آباد پہنچے، وہاں آپ نے انگریزی زبان سیکھی، اور رفتہ رفتہ نہایت اچھی استعداد پیدا کر لی اسی زمانہ میں گورنمنٹ تعزیرات ہند کا ترجمہ کرانا چاہتی تھی، چنانچہ یہ کام مولانا کے سپرد ہوا، آپ نے اس کام کو اس خوبی سے کیا، کہ لفٹنٹ گورنر سر ولیم میور نے خوش ہو کر آپ کو کانپور کا تحصیلدار کر دیا، اور بعد میں ضابطہ فوجداری کا ترجمہ ختم

کرنے پر یعنی ۱۸۶۳ء میں ڈپٹی کلکٹر ہو گئے۔

مولانا کی قابلیت کا شہرہ شدہ شدہ حیدرآباد پہنچا، اور آپ کو وہاں طلب کیا گیا، آپ ۱۸۷۷ء میں ساڑھے آٹھ سو روپیہ ماہوار تنخواہ پر حیدرآباد گئے اور اپنے حسن عمل کے صلے میں برابر ترقی پاتے رہے، یہاں تک کہ آخر میں آپ کو سترہ سو روپیہ ماہوار تنخواہ ملنے لگی، اور بورڈ آف ریونیو کے ممبر ہو گئے، لیکن سر سالار جنگ اول کی وفات کے بعد آپ پنشن لے کر دہلی چلے آئے، یہاں آتے ہی آپ تصنیف و تالیف میں نہایت سرگرمی سے منہمک ہو گئے۔

علمی خدمات کے صلے میں آپ نے گورنمنٹ سے متعدد انعام حاصل کئے۔ نقدی انعامات کے علاوہ ۱۸۹۷ء میں شمس العلماء کا خطاب ملا، اور ۱۹۰۲ء میں ایڈنبرا یونیورسٹی سے ایل، ایل، ڈی کی ڈگری عطا کی۔

آخر عمر میں صحت بے حواس دے رہا رہا منتاثی جاتی رہی تھی، ہاتھوں میں رعشہ آ گیا تھا لیکن لکھنے پڑھنے کا شغل جاری رہتا تھا، آخر ۱۹۱۱ء میں اس زبردست انشاپرداز اور محسن زبان اردو نے وفات پائی۔

آپ کی چیدہ مشہور تصانیف کی فہرست یہ ہے :-

قانون :- تعزیرات ہند، قانون شہادت۔

اخلاق و مذہب :- ترجمہ قرآن شریف، ادعیۃ القرآن، دو سورہ، مطالب القرآن، الحقوق والفرائض، امہات الامہ، موعظہ حسنہ۔

ناول :- مراۃ العروس، بنات النعش، توبۃ النصوح، ابن الوقت،

محصنات، ایامیٰ، رویائے صادقہ۔

مولانا نذیر احمد اپنی تصانیف کی نوعیت اور اپنی انشا پردازی کے لحاظ سے دور چہارم کے مستحق ہیں، چنانچہ اسی خیال سے ان کے نام نامی کو رونق دہ بزم چہارم کیا گیا ہے، اور حالات یہاں درج ہوئے ہیں، اس لئے کہ آپ اس بزم کی کرسی صدارت پر رونق افروز نظر آتے ہیں،

مولانا کی زبان خاص دہلی کی ٹکسالی زبان ہے، نہایت صاف، سادہ رواں اور شیریں، تحریر میں بے تکلفی اور بے ساختہ پن ہے، تشبیہ و استعارہ سے بھی دلکشی پیدا کرتے ہیں، اور برجستہ محاورات کا تو اس قدر شوق ہے کہ کوئی بات ان کی لطف محاورہ سے خالی نہیں ہوتی، متانت اور سنجیدگی کا سررشتہ ہاتھ سے نہیں چھوٹنے، کہیں کہیں سنجیدہ ظرافت سے بھی شگفتگی پیدا کر دیتے ہیں،

آپ کی عبارت میں کہیں کہیں نقائص بھی نظر آتے ہیں، بعض اوقات عوام کی زبان لکھ جاتے ہیں، محاورات بھی رکیک اور عامیانہ استعمال کر لیتے ہیں، کبھی کبھی عربی کے مغلق اور غیر مانوس لغت لے آتے ہیں، ترجمۃ القرآن اور دیگر مذہبی کتابوں میں آپ کا لب و لہجہ اور انداز بیان کچھ زیب نہیں دیتا، بعض مقامات پر آپ نے حفظ مراتب کا خیال نہیں رکھا، اور اللہ تعالیٰ اور رسول کا ذکر کرتے ہوئے ایسی زبان اور ایسے محاورے استعمال کر دیئے، جو مناسب نہ تھے

مولوی نذیر احمد پہلے انشا پرداز ہیں جنہوں نے اردو کو ناول سے

روشناس کیا، آپ کے ناولوں کے نام اوپر درج کئے جا چکے ہیں، اگرچہ آپ کے ناول حقیقی معنوں میں ناول نہیں، تاہم انہیں محض ناول اور کسی نام سے موسوم کیا بھی نہیں جا سکتا، آپ کے ناولوں میں اخلاقی پہلو بہت ابھرا ہوا ہے، آپ کے پیش نظر زیادہ تر اصلاح معاشرت اور تعلیم نسواں ہے اور ان ہی بنیادوں پر آپ ناولوں کی عمارتیں کھڑی کرتے ہیں

آپ کے ناولوں میں ناول کے جملہ عناصر مکمل یا نامکمل حالت میں پائے جاتے ہیں، اشخاص قصہ پلاٹ، مکالمہ، مقصد، اسلوب بیان، زمان و مکان ان کے علاوہ کردار نویسی، سوشل و معاشرتی تصویریں، روزمرہ کے واقعات کے نقشے ہماری آنکھوں کے سامنے پیش کر دیئے ہیں تو بہ النصوح کی ایک شخصیت مرزا ظاہر دار بیگ تو تازہ جاوید ہے -

صاحب "دریائے لطافت" مولانا نذیر احمد صاحب کے ناولوں کو ناول نہیں کہتے، حالانکہ انہوں نے ناول کے جو عناصر اور جو خصوصیات بیان کی ہیں، وہ سب ان ناولوں میں پائی جاتی ہیں، بہرحال، وجہ معلوم نہیں ہوتی، کہ انہیں ناول کیوں نہ کہا جائے، ناول تو وہ ضرور ہیں لیکن نامکمل نمونے ہیں، اور یہ اس لئے کہ ابتدائی کارنامے ہیں،

پنڈت رتن ناتھ سرشار لکھنوی

پنڈت صاحب لکھنؤ میں پیدا ہوئے سن ولادت غالباً ۱۸۴۶ء ہے آپ کی عمر چار سال کی تھی کہ آپ کے والد پنڈت بیج ناتھ صاحب در کا سایۂ شفقت سر سے اٹھ گیا،

بیان کیا جاتا ہے کہ جس مکان میں حضرت سرشار نے اپنے لڑکپن کے ایام کھیل کود میں بسر کر رہے تھے اس کے پڑوس میں اہل اسلام کے مکانات تھے آپ ان کے زنان خانوں میں بچوں کے ساتھ کھیلا کرتے تھے، چنانچہ شریف خاتونوں سے آپ نے مستورات کی زبان اور طرز معاشرت سے بہت کچھ آگاہی حاصل کی، جو آئندہ چل کر آپ کی شہرت کا باعث بنی، آپ نے ابتداً عربی و فارسی کی تعلیم حاصل کی، اس کے بعد کیننگ کالج میں داخل ہوئے لیکن کوئی ڈگری حاصل نہ کر سکے حصول معاش کے لئے کھیری کے ضلع اسکول میں مدرس ہو گئے۔

اس زمانے میں "مراسلۂ کشمیر" نامی ایک رسالہ نکلتا تھا جس میں اصلاحی مضامین نکلا کرتے تھے اسی زمانے میں "اودھ پنچ" بھی اپنا رنگ جما رہا تھا، حضرت سرشار کی انشا پردازی کی ابتدا ان ہی رسائل سے ہوئی، آپ برابر مضامین لکھ کر ان رسائل میں شائع کرایا کرتے تھے، آپ کے ابتدائی مضامین میں مرزا رجب علی بیگ سرور کا رنگ صاف نمایاں ہوتا تھا لیکن شوخی اور شگفتگی ان سے زیادہ تھی، اسی زمانے میں سررشتۂ تعلیم کی جانب سے ایک اخبار نکلتا تھا اس میں اکثر علمی اور اخلاقی مضامین کے ترجمے شائع ہوتے تھے آپ بھی اس اخبار میں مضامین بھیجتے تھے ۱۸۷۶ء میں ایک علم طبعی کی کتاب کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا، اور شمس الضحیٰ اس کا نام رکھا، یہ ترجمہ بہت مقبول ہوا، اور اس نے آپ کی شہرت کا سنگ بنیاد رکھ دیا،

منشی نول کشور اودھ اخبار نکالا کرتے تھے، چنانچہ اس کی ایڈیٹری حضرت

سرشار کو تفویض ہوئی، آپ کا مایہ ناز کارنامہ "فسانہ آزاد" اسی اخبار میں بالاقساط نکلا کرتا تھا۔ اسی اشاعت نے آپ کی شہرت کو چار چاند لگائے اور ملک کے گوشے گوشے میں آپ کا طوطی بولنے لگا۔ چنانچہ ۱۸۹۵ء میں آپ کو حیدرآباد طلب کیا گیا، جہاں مہاراجہ سرکشن پرشاد نے آپ کی خاطر خواہ قدر افزائی کی لیکن افسوس کہ آپ نے خود اپنی قدر نہ پہچانی، آپ کی بے اعتدالیوں سے آپ کے قویٰ میں ضعف آ گیا۔ "فسانہ آزاد" میں دختِ رز کی مذمت نئے نئے انداز سے کی ہے لیکن یہی دخترِ رز اپنے ہجو اور مذمت کرنے والے کے لیے تپ دق بن گئی، اور اس کو گھلا گھلا کر فنا کر دیا۔ آخر ۱۹۰۲ء میں حضرت سرشار نے رحلت فرمائی

یوں تو حضرت سرشار نے متعدد تصانیف یادگار چھوڑیں لیکن مندرجہ ذیل بہت مشہور ہیں:-

"فسانہ آزاد" "سیر کوہسار" "جامِ سرشار" "خدائی فوجدار" "طوفانِ بے تمیزی" "کامنی" وغیرہ ان میں سے "فسانہ آزاد" کو جو شہرت اور ہر دلعزیزی حاصل ہے، وہ اب تک کسی اور فسانہ اور ناول کو حاصل نہ ہو سکی، حقیقت یہ ہے کہ یہ افسانہ اپنے مصنف کو زندہ جاوید رکھنے کے لئے کافی ہے۔

"فسانہ آزاد" بڑی تقطیع کی چار ضخیم جلدوں کا ناول ہے۔ اور اردو میں ابتدائی اور نامکمل ناول کا عمدہ نمونہ ہے لکھنؤ کی مٹتی ہوئی تہذیب اور گری ہوئی حالت کی سچی تصویریں جیسی اس افسانہ میں ملتی ہیں ان کا عشر عشیر

بھی کہیں اور نظر سے نہیں گزرتا، ان تصویروں نے اس افسانے کو ناول کے
مرتبہ پر پہنچایا، اور کتاب کی دلچسپی میں چار چاند لگا دیے۔ لیکن "فسانہ آزاد" کی
کامیابی کا اصلی راز حضرت سرشار کی جادو طرازی ہے۔ حضرت سرشار
کی زبان لکھنؤ کی ٹکسالی زبان ہے، محاورہ اور روزمرہ کی شوخی آپ کا خاص
رنگ ہے، بیان میں شگفتگی اور طرز ادا میں رنگینی ہے، آپ نے مکالمہ میں
کمال دکھایا ہے، اگرچہ آپ کا ذاتی طرز ادا مقفی اور رنگین ہے لیکن مکالموں
میں آپ نے مختلف رنگ اختیار کئے ہیں، مگر برجستگی کا سررشتہ کہیں ہاتھ
سے چھوٹنے نہیں پایا، سوشل زندگی کی مصوری، منظر نگاری اور مکالمہ میں
آپ خاص طور پر کامیاب ہیں، اور اس کامیابی کا راز آپ کی شوخی اور زندہ
دلی میں مضمر ہے، یہی وجہ ہے کہ جب سنجیدگی پر اترتے ہیں، اور ناصحانہ انداز
اختیار کرتے ہیں، تو آپ کی عبارت میں سستی اور پھیکا پن پیدا ہو جاتا ہے،

اگرچہ آپ کے ناول پلاٹ سے اور آپ کے اشخاص قصہ یک رنگی
سے بے نیاز ہوتے ہیں لیکن ان کی دلچسپی اور دلکشی کا یہ عالم ہے، کہ یہ خامیاں
محسوس نہیں ہونے پاتیں،

منشی سجاد حسین

منشی سجاد حسین، اودھ پنچ کے شہرہ آفاق ایڈیٹر خلف الرشید
منشی منصور علی ڈپٹی کلکٹر قصبہ کاکوری میں ۱۸۵۶ء میں پیدا
ہوئے، اور لکھنؤ میں نشوونما اور ابتدائی تعلیم پائی، ۱۸۷۳ء میں انٹرنس کا امتحان
پاس کرنے کے بعد آپ فیض آباد چلے گئے، اور وہاں محکمہ فوج میں اردو ٹیچر کی
حیثیت سے ملازم ہو گئے لیکن افتاد طبع نے مدرسی کو پسند نہ کیا، ایک سال

ملازمت کرنے کے بعد مستعفی ہوکر آپ لکھنؤ واپس چلے آئے،

لکھنؤ پہنچ کر علمی زندگی بسر کرنے کا ارادہ کیا۔ چنانچہ ۱۸۷۷ء میں "اودھ پنچ" جاری کیا، جو ان کی اصلی شہرت کا باعث بنا۔ اودھ پنچ کانگرس کا حامی تھا اور آخر وقت تک اسی کی حمایت میں زعفران زار بنا رہا

منشی صاحب فالج کی وجہ سے ۱۹۰۴ء کے بعد مجبور اور معذور ہو گئے تھے قوت گویائی بھی قریب سلب ہو چکی تھی مگر اودھ پنچ برابر نکلتے رہے۔ آخر مالی دشواریوں اور کچھ جسمانی معذوریوں سے دق آکر ۱۹۱۲ء میں اودھ پنچ کو بند کرنا پڑا۔ خود بھی زیادہ زندہ نہ رہ سکے اور دو سال بعد اوائل ۱۹۱۵ء میں راہی ملکِ بقا ہوئے۔

منشی صاحب کا مزاج عجیب صفات کا مجموعہ تھا۔ خلقی ذہانت اور طباعی کے علاوہ زندہ دلی ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔ زباندانی اور انشا پردازی آپ کی مسلم ہے آپ کے بیان میں ندرت، تحریر میں شگفتگی، نتائج میں دلنشینی اور انداز میں ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری تھی، خیالات میں بےباکی اور آزادی اس بلا کی تھی، کہ جو کچھ چاہتے تھے، کہہ گذرتے تھے، گورنمنٹ تک پر فقرے چست کرتے تھے، اور کسی کی تو ہستی ہی کیا ہے، ظرافت چونکہ آپ کی تحریر کا جوہر ہے، لہٰذا تشبیہ و استعارہ بھی ظرافت آمیز استعمال کرتے تھے،

"اودھ پنچ" کے علاوہ چند مزاحیہ ناول بھی آپ کے مشہور و معروف کارنامے ہیں جن میں "حاجی بغلول"، "طرحدار لونڈی"، "احمق الدین" کا پلٹ" زیادہ شہرت رکھتے ہیں۔

آپ کے ناولوں کو پلاٹ اور کردار نگاری کے لحاظ سے گزشتہ تمام ناولوں پر فوقیت حاصل ہے، اور ارتقائے ناول میں آپ کے کارنامے خاص اہمیت رکھتے ہیں، "حاجی بغلول" زندہ جاوید کارنامہ ہے۔

مولانا عبدالحلیم شرر

مولانا شرر لکھنؤ میں سنہ ۱۸۶۰ء میں پیدا ہوئے، پانچ سال کی عمر میں بسم اللہ ہوئی، لیکن مکتبی تعلیم میں کچھ کامیابی نہ ہوئی، آپ کے والد حکیم تفضل حسین صاحب واجد علی شاہ کی ملازمت میں مٹیا برج کلکتہ میں مقیم تھے، انہوں نے مولانا شرر کو سنہ ۱۸۶۹ء میں اپنے پاس بلا لیا وہاں آپ نے فارسی عربی اور قدرے انگریزی پڑھی، مٹیا برج کے قیام کی بدولت شہزادوں سے خصوصیت تھی، اور تعلقات اس قدر بڑھ گئے تھے کہ شہزادوں کو بغیر آپ کے اور آپ کو بغیر شہزادوں کے چین نہ پڑتا تھا، اس وقت آپ کی عمر تیرہ چودہ برس سے زیادہ نہ تھی، شہزادوں کے ساتھ آپ کی رسائی زنانخانے تک تھی، اور مولانا کی زبان دانی کا راز اسی میں مضمر ہے۔

مولانا سنہ ۱۸۷۰ء میں کلکتہ چھوڑ کر لکھنؤ تشریف لائے، یہاں بھی تحصیل علم برابر جاری رہا، شوق علم آپ کو سنہ ۱۸۷۹ء میں دلی لایا، جہاں آپ نے مولوی نذیر حسین سے حدیث پڑھی، اور ڈیڑھ سال کے بعد واپس لکھنؤ پہنچے، قیام دہلی کے دوران میں آپ نے محمد بن الوہاب نجدی کے رسالۃ التوحید کا ترجمہ کر کے شائع کیا، یہ آپ کی پہلی ادبی کوشش تھی۔

لکھنؤ واپس پہنچ کر آپ اودھ اخبار کے اسسٹنٹ ایڈیٹر بمشاہرہ ۳۰ روپیہ مقرر ہوئے، یہاں سے آپ کی ادبی شہرت کا آغاز ہوتا ہے، آپ مسلسل دو سال

تک علمی، خیالی اور فلسفیانہ مضامین لکھتے اور اخبار میں شائع کرتے رہے اور ملک میں ہر طرف آپ کے مضامین کی دھوم مچ گئی۔

کچھ عرصے بعد آپ نے اودھ اخبار سے قطع تعلق کر کے خود اپنا ایک ماہوار رسالہ "دلگداز" نکالنا شروع کیا، یہ رسالہ جنوری ۱۸۸۷ء سے جاری ہوا اور ختم سال تک اس کے دو ہزار خریدار ہو گئے۔ اس رسالہ میں زیادہ تر شاعرانہ و عاشقانہ خیالی مضامین ہوتے تھے، یا کبھی کبھی کوئی تاریخی مضمون بھی چھپ جاتا تھا ۱۸۸۹ء میں ایک جزو ناول کا بھی اس میں اضافہ کیا، اور "ملک العزیز ورجنا" اس میں بالاقساط شائع ہوا اور پھر متعدد ناول اسی طرح شائع ہوئے لیکن مالی دشواریوں کی وجہ سے آپ کو ۱۸۹۱ء میں حیدر آباد کا سفر کرنا پڑا۔

حیدر آباد میں نواب وقار الامراء نے آپ کی قدر دانی کی اور اپنے بیٹے کے ساتھ آپ کو ۱۸۹۳ء میں انگلستان بھیج دیا تین سال آپ وہاں رہے اور اس مدت میں آپ نے فرانسیسی زبان سیکھی۔

انگلستان سے واپس آکر آپ حیدر آباد پہنچے اور "دلگداز" کا دفتر بھی یہیں اٹھا لے گئے۔ ۱۹۰۹ء تک آپ کئی بار لکھنؤ آئے گئے لیکن ۱۹۰۹ء میں حضور نظام کے حکم سے آپ کو حیدر آباد ہمیشہ کے لئے چھوڑ دینا پڑا۔ آپ نے اپنے وطن میں مستقل سکونت اختیار کر لی، اور ادبی خدمات میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ آخر ۱۹۲۶ء میں راہی ملک بقا ہوئے "دلگداز" آخر وقت تک شائع ہوتا رہا۔

مولانا شرر کی جملہ تصنیفات کو ہم چار موضوع پر تقسیم کر سکتے ہیں (۱) ناول (۲) تاریخ (۳) لکچر (۴) متفرق مضامین۔ چونکہ اس باب میں ہمیں ناول ہی سے سروکار

ہے لہذا باقی موضوعوں کو نظر انداز کرتے ہیں۔

مولانا کی زبان لکھنؤ کی ٹکسالی زبان ہے، نہایت سلیس، صاف سلیس اور رواں ہے۔ طرز بیان نہایت شگفتہ اور بے تکلف ہے، تشبیہ و استعارہ کا بہت شوق ہے، لیکن یہ زیادہ تر ناولوں میں ہے، تاریخی کتابوں میں آپ کا انداز بنا تلا ہے، عبارت آرائی نہیں پائی جاتی، منظر نگاری میں آپ کو خاص ملکہ حاصل ہے، لیکن اکثر اوقات جذبات کی شدت اس میں شامل ہو کر تصاویر کو دھندلا کر دیتی ہے،

مولانا کے ناول دو حصوں پر تقسیم کئے جا سکتے ہیں، ایک معاشرتی، دوسرے تاریخی، دوسری قسم کے ناول یعنی تاریخی ان کی حقیقی شہرت کے باعث ہیں ان تاریخی ناولوں کا مقصد قدیم اسلامی حالات کو منظر عام پر لانا، اور انکی اہمیت کا احساس دلانا ہے، اسلامی تاریخ کے ہر انقلاب کن واقعہ پر ایک ایک ناول لکھا گیا ہے، اور اسلامی حکومتوں کے عروج و زوال کے نہایت عمدہ نقشے دکھائے گئے ہیں۔

آپ نے ناول کو ہر دلعزیز بنانے اور اسے معیار بلندی تک پہنچانے کی بے دریغ کوشش کی ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ آپ نے ناول کو انگریزی ناول کے ہم پلہ کر دکھایا ہے، آپ کے بعض ناول مثلاً فردوس بریں، ملک العزیز ورجنا، فلورا فلورنڈا وغیرہ بڑے پایہ کے ناول اور ہر لحاظ سے قابل ستائش ہیں،

آپ کی ناول نگاری میں بعض خامیاں بھی ہیں، اول تو یہ کہ تاریخی واقعات

میں صداقت کا سررشتہ کہیں کہیں ہاتھ سے چھوٹ گیا ہے۔ دوسرے اشخاص قصہ میں جذبات خیالات، احساسات وغیرہ کے لحاظ سے یکسانیت پائی جاتی ہے بعض اوقات یہ یکسانیت اس قدر اجاگر ہو جاتی ہے، کہ بجز ناموں کے اشخاص میں کوئی فرق نہیں رہتا، لیکن ان خامیوں کے باوجود مولانا شرر کا مرتبہ بحیثیت ناول نگار بہت بلند ہے، اور اگر تاریخی چہان بین اور ہسٹوریکل پہلو سے قطع نظر کر لی جائے، تو آپ اردو کے پہلے ناول نگار ہیں جنہوں نے انگریزی اصول پر ناول لکھے،

مرزا محمد ہادی رسوا لکھنوی

مرزا محمد ہادی نام، رسوا تخلص، خلف آغا محمد تقی لکھنؤ میں پیدا ہوئے، سنہ ولادت ۱۸۵۸ء ہے، سولہ برس کی عمر میں والدین کے سایہ سے محروم ہو گئے،

ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی پھر انگریزی پڑھنی شروع کی، اور انٹرنس پاس کیا، رڑکی جاکر اوورسیری کا امتحان دیا، اور کوئٹہ اور بلوچستان کی ریلوے میں ملازم ہو گئے لیکن افتاد طبع اس قسم کی ملازمت کے خلاف تھی چنانچہ ملازمت چھوڑ کر لکھنؤ چلے آئے، اور کیمسٹری (کیمسٹری) کی تحصیل میں منہمک ہو گئے، لکھنؤ مشن اسکول میں فارسی کے مدرس بھی ہو گئے تھے لیکن کیمسٹری کا شغل برابر جاری تھا،

پنجاب یونیورسٹی سے منشی عالم کا امتحان آپ نے پاس کر لیا تھا اس کے بعد اسی یونیورسٹی سے بی اے بھی پرائیویٹ طور پر پاس کیا، اور امریکہ کی اورینٹل یونیورسٹی سے پی، ایچ، ڈی کی ڈگری بھی حاصل کی، آپ

متعدد زبانیں جانتے تھے، چنانچہ عربی، یونانی، انگریزی، فارسی، ہندی اور سنسکرت پر عبور حاصل تھا۔ ان زبانوں کے علاوہ منطق، فلسفہ اور ریاضی میں دستگاہ کامل رکھتے تھے، شاعر بھی اچھے تھے، اور مرزا اوج کی شاگردی پر فخر کرتے تھے۔ ناول نگاری میں خاص نام پیدا کیا تھا۔ منجملہ دیگر ناولوں کے "امراؤ جان ادا" شہرہ آفاق اور زندہ جاوید ناول ہے۔

بڑھاپے میں آپ کا تقرر دارالترجمہ عثمانیہ میں ہو گیا تھا لیکن گاہے گاہے لکھنؤ آتے رہتے تھے۔ خاکسار نے ۱۹۲۵ء یا ۱۹۲۶ء میں مسلم ہوسٹل الہ آباد کے سالانہ مشاعرے میں آپ کی زیارت کی تھی، اور غزل بھی سنی تھی، جیسے خود مغنی تھے، ویسی ہی آواز بھی مغنی تھی، پڑھنے کا انداز بھی نرالا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا، گویا باتیں کر رہے ہیں۔ ایک شعر کوشش کے بعد سن کر یاد کیا تھا، تبرک کے طور پر پیش کرتا ہوں (اس غزل کے چند اشعار "امراؤ جان ادا" ناول میں درج ہیں)

چارہ گر زہر منگا دے، تھوڑا — لے مجھے اپنی دوا یاد آئی!

آخر یہ مجموعہ کمالات ۲۱ اکتوبر ۱۹۳۱ء کو دنیائے فانی سے کوچ کر گیا۔

مرزا صاحب کا منظوم کلام نہ کہیں شائع ہوا اور نہ غالباً کہیں محفوظ ہے آپ کی چند غزلیں "امراؤ جان ادا" میں نظر سے گذریں، دو چار شعر مسلم ہوسٹل الہ آباد کے مشاعرے میں سنے۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ زبان کی سلاست اور ندرت اور طرز ادا کی برجستگی اور جذبات و خیالات کی سادگی آپ کے کلام

کی خصوصیات ہیں ۔

آج کل مرزا صاحب کی شہرت زیادہ تر ان کی نثر نگاری کی وجہ سے ہے آپ کی زبان لکھنؤ کی ٹکسالی اور ستھری زبان ہے، لکھنؤ کے روز مرہ اور محاورات پر پوری قدرت حاصل ہے، طرز بیان میں سادگی، صفائی اور برجستگی کے جوہر موجود ہیں، عبارت کا انداز ایسا ہے، گویا بات چیت کر رہے ہیں شگفتگی بھی آپ کی عبارت میں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے ۔

مرزا صاحب اپنے ناولوں کے متعلق فرماتے ہیں، کہ "ہمارے ناول نہ ٹریجڈی ہیں نہ کامیڈی، نہ ہمارے ہیرو تلوار سے قتل ہوتے ہیں اور نہ ان میں سے کسی نے خودکشی کی ہے، نہ ہجر ہوا نہ وصل، ہمارے ناولوں کو موجودہ زمانے کی تاریخ سمجھنا چاہیئے" اور یہ حقیقت ہے، کہ آپ کے ناولوں کا زماں عصر حاضرہ ہے اور مکان لکھنؤ، اشخاص قصہ لکھنؤ یا قرب و جوار کے باشندے ہیں، اور ان کے پلاٹ روزانہ زندگی کے واقعات سے لئے گئے ہیں، فطرت و حیات انسانی کا گہرا مطالعہ کیا گیا ہے۔ ہر سوسائٹی کے آدمی کو لیا ہے، اور اس کے عیب و ہنر کو طشت از بام کر دیا ہے اور یہی وجہ ہے، کہ مرزا صاحب کے ناولوں میں دلچسپی کا بے انتہا سامان موجود ہے،

مولانا راشد الخیری مولانا راشد الخیری شمس العلماء مولوی نذیر احمد کی پوتی کے سگے بھتیجے تھے، اور دلی کے ایک معزز و عالی خاندان کے چشم و چراغ تھے، آپ ۱۸۶۸ء میں پیدا ہوئے آپ کے والد

نظام گورنمنٹ میں محکمہ بندوبست کے افسر اعلیٰ تھے۔

عربی و فارسی کی ابتدائی تعلیم گھر کے افراد سے حاصل کرنے کے بعد عربک اسکول میں داخل ہوئے، اور یہیں سے انٹرنس کا امتحان پاس کیا اس کے بعد محکمہ بندوبست میں کچھ عرصہ تک خدمات انجام دیں، ۱۹۰۵ء میں آپ نے مستورات کے لئے ماہنامہ "عصمت" جاری کیا جو اب تک خواتین ہندو پاکستان خصوصاً مخدرات اسلام کی فلاح و بہبود میں مصروف ہے اور مولانا مرحوم کی زبردست کوششوں کی زندہ جاوید یادگار ہے،

مولانا نے ابتداً تحریر میں مولوی نذیر احمد کی پیروی اختیار کی تھی لیکن کچھ مدت بعد ان کا اپنا رنگ ابھر آیا، شروع سے آپ کو مسلمان لڑکیوں کی تعلیم و تربیت سے دلچسپی تھی جو عمر بھر باقی رہی، ان کی تمام تصنیفات میں یہ دلچسپی موجود ہے، بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اس دلچسپی نے آپ کو مصنف بنایا تو بے جا نہ ہوگا، عورتوں کی جہالت اور پستی کو دور کرنے اور مردوں کو ان پر رحم دلانے میں مولانا نے پورا حصہ لیا، آپ شاعر بھی تھے لیکن آپ کی تمام نظمیں عورتوں ہی کے حقوق کی حمایت اور عورتوں کی اصلاح کے متعلق ہیں اگرچہ اب سے اٹھاسی برس قبل آپ پیدا ہوئے یعنی ہنگامہ غدر کے بعد، مگر آپ کے دل و دماغ میں دو سو برس پہلے کے سے جذبے تھے، وہ موجودہ مسلمان لڑکیوں کو دو سو برس پہلے کی لڑکی کی صورت میں دیکھنے کے آرزومند تھے،

مولانا کی مشہور تصانیف میں "صبح زندگی" اور "شام زندگی" کو جو

عالمگیر مقبولیت حاصل ہوئی، وہ محتاج بیان نہیں، آپ کی تصنیفات کی تعداد ساٹھ تک پہنچتی ہے، جن میں زیادہ تر ناول ہیں جن کا تعلق مستورات کی اصلاح سے ہے۔

افسوس کہ یہ زبردست انشاپرداز، ناول نگار، اور عورتوں کا ہمدرد ورہونس دہنگ ۴ر فروری ۱۹۳۶ء کو اس جہان فانی سے عالم جاودانی کی طرف کوچ کر گیا۔

مولانا کی زبان خاص دہلی کی اردو سے متعلق ہے، آپ کا روزمرہ عمدہ ماضو کے انگریزی اثر سے قطعی پاک اور درست ٹکسالی ہے، عورتوں کی زبان اور بیگمات کے محاوروں پر عبور حاصل ہے اور ان کو نہایت لطف کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ الفاظ ملائم اور شیریں، زبان سادہ اور شگفتہ، طرز بیان ایسا جیسے کوئی باتیں کرتا ہے، چھوٹے چھوٹے جملوں سے تاثر کا طلسم باندھتے ہیں۔ آپ حزن و ملال کے بادشاہ ہیں، ہر تصنیف میں بےکسی کے مرقعے اور یاس کی تصویریں پڑھنے والوں کو بےچین کر دیتی ہیں، غم و الم کے مناظر کو الفاظ میں جس طرح آپ بیان کرتے ہیں، وہ آپ ہی کا حصہ ہے، اور یہی وجہ ہے کہ ملک میں آپ کا لقب "مصور غم" مشہور ہے۔

آپ کے ناول ایک مخصوص و محدود طبقے کے لئے لکھے گئے ہیں، اس کے علاوہ ان کے اشخاص اور واقعات اور طرز ادا میں طبیعت کو اکتا دینے والی یکسانیت و یک رنگی ہے، چونکہ مولانا ہر شے کو صنف لطیف کے نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں، اور انداز بیان بھی یکسانی ہی ہوتا ہے، اس لئے آپ کے ناولوں

میں مصنوعیت سی محسوس ہونے لگتی ہے، حزن و ملال کے غلبہ کی وجہ سے بھی طبیعت
پراگندہ اور مضمحل ہو کر رہ جاتی ہے،

ظفر عمر آپ کے حالات باوجود سعی بلیغ دستیاب نہیں ہوئے، چونکہ
آپ اردو میں ناول نگاری کے ایک خاص صنف کے موجد ہیں
اور ایک مدت تک پنجاب میں آپ کی ایجاد کی تقلید ہوتی رہی، لہذا آپ
کے نام نامی کو زیب داستان بناتا ہوں، آپ کے متعلق صرف اس قدر
دریافت ہوا، کہ آپ علی گڈھ یونیورسٹی کے گریجویٹ اور محکمہ پولیس میں کسی ممتاز
عہدے پر مامور تھے،

آپ نے اردو ناول نگاری میں سراغ رسانی کے قصوں کا اضافہ کیا
اور اس رنگ کے آپ موجد ہوئے، آپ کی دو کتابیں "نیلی چھتری" اور
"بہرام کی گرفتاری" خاص شہرت رکھتی ہیں، دونوں کتابیں ایک ہی سلسلہ
کی دو کڑیاں ہیں، ہنوز یہ سلسلہ ختم نہیں ہوا تھا، کہ مصنف کو ایک حادثہ پیش
آیا، جس کی وجہ سے آپ کی ٹانگ میں ضرب شدید آئی، اور سلسلہ
نامکمل رہ گیا،

مدت ہوئی میں نے ایک انگریزی ناول پڑھا تھا، اس کا نام اعداد میں
ہے، یہ تو یاد نہیں رہا، کہ عدد کیا تھا، لیکن یہ خیال ہے، کہ یا تو ۵۰۴ تھا یا
۴۱۳ یا پھر ۵۰۴ ان ایام میں خاکسار نے بہت کوشش کی لیکن وہ کتاب
دستیاب نہیں ہوئی۔ "نیلی چھتری" اور "بہرام کی گرفتاری" حقیقت میں اس
انگریزی ناول کا ترجمہ ہے، لیکن اس سلیقے سے کیا گیا ہے، کہ کہیں سے ترجمہ کا

گمان نہیں ہوتا کتابوں کو ہر لحاظ سے ہندوستانی رنگ میں اس طرح رنگ دیا ہے کہ قطعی ہندوستان کی پیداوار معلوم ہوتی ہیں، زبان اور طرزِ بیان بھی نہایت صاف، رواں اور شگفتہ ہے۔

ایم اسلم آپ مغربی پاکستان کے نہایت مقبول اور ہر دلعزیز ناول نگار ہیں، اور حقیقت یہ ہے کہ آپ نے اردو میں ناول نگاری کے فن کو زندہ رکھنے کی کامیاب کوشش کی ہے، ایم اسلم سچے مسلمان اور بادۂ اخلاق و مذہب سے سرشار ہیں اس لئے آپ کا ہر ناول کوئی نہ کوئی اصلاحی مقصد لئے ہوئے ہوتا ہے، آپ خود پنجابی ہیں، اور پنجاب کی دیہاتی زندگی کی پر کیف اور دلکش داستانیں پیش کرتے ہیں زبان صاف، سادہ اور برجستہ لکھتے ہیں اور جابجا اور خصوصاً ابواب کے شروع میں برجستہ اشعار کے استعمال سے لطفِ بیان کو دوبالا کر دینے میں، بہت زود نویس، اور پر نویس ہیں، آپ کے افسانوں اور ناولوں کی مجموعی تعداد انتالیس کے قریب ہے۔

نسیم حجازی آپ بھی پاکستان کے مشہور و مقبول ناول نگار ہیں، اخبار "تعمیر" راولپنڈی کے حلقۂ ادارت میں ممتاز حیثیت کے مالک ہیں، اور فی الحال راولپنڈی ہی کو آپ کے مستقل قیام کا شرف حاصل ہے، ناول نگاری میں مولانا شرر لکھنوی کے نقشِ قدم پر چلتے ہیں اور تاریخی ناول نگاری میں یدِطولیٰ رکھتے ہیں زبان و طرزِ بیان صاف سادہ اور سلجھا ہوا ہوتا ہے، متعدد ضخیم ناول زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر قبولِ عام کی سند حاصل کر چکے ہیں، اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

تبصرہ و کیفیت

اس دور میں بڑے بڑے قابل بزرگ نظر آتے ہیں جنہوں نے اپنی انشا پردازی سے اردو کو باغ و بہار کیا، لیکن توجہ زیادہ تر ناول کی طرف مبذول رکھی، ناول کے موجد ڈاکٹر نذیر احمد دہلوی نے ناول کو ناول کی حیثیت سے نہیں لکھا، بلکہ لڑکیوں کی تعلیم کے لئے ایک دلچسپ سلسلہ کتابوں کا مرتب کیا ہے یہی وجہ ہے، کہ ان کے ناولوں میں اخلاقی پہلو بہت ابھرا ہوا ہے، ان کے اشخاص قصہ عموماً روشن خیال اور مذہب پرست ہوتے ہیں ان کے ناول حسن و عشق سے بھی مبرا ہیں ان میں شعریت بالکل نہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہم انہیں مکمل ناول نہیں کہہ سکتے

بالکل یہی حال علامہ راشد الخیری کے ناولوں کا ہے، مندرجہ بالا باتوں کے علاوہ آپ کے ناولوں میں حزن و ملال کا عنصر غالب ہے، ظاہر ہے کہ پڑھنے والا ہر وقت حزن و ملال، یاس و غم وغیرہ کے لئے تیار نہیں رہتا خوشی و مسرت اور ظرافت و زندہ دلی کی بھی اسے تلاش ہوتی ہے، وہ تنوع چاہتا ہے اور یہ باتیں ان ناولوں میں مفقود ہیں۔

حضرت تمسر شار کے افسانوں کو ایک محدود معنوں میں ناول کہہ سکتے ہیں ان میں سب سے بڑی خرابی پلاٹ اور ترتیب کی کمزوری ہے، تسلسل واقعات اور اشخاص قصہ کے کردار میں استقلال بھی آپ کے افسانوں میں مفقود ہیں محض مکالمہ کی خوش اسلوبی اور لکھنو کی طرز معاشرت کے صداقت آمیز

بیان کے اعتبار سے ہم ان افسانوں کو ناول کہہ سکتے ہیں۔
لے دے کے سرشار، منشی سجاد حسین، مرزا رسوا، اور ظفر عمر صاحب کے
ناولوں پر نظر جمتی ہے۔ منشی صاحب کے ناولوں میں ظرافت ہی ظرافت ہے
اور ظفر صاحب کے ناول محض سراغ رسانی سے متعلق ہیں۔ سرشار نے البتہ
مختلف قسم کے ناول لکھے جن میں تاریخی ناول خاص طور پر قابل قدر ہیں لیکن
ان میں بھی واقعات کے عدم صداقت اور اشخاص قصہ کی یکسانیت کے
عیوب پائے جاتے ہیں۔ حضرت رسوا کے ناول اچھے ہیں لیکن انگریزی ناولوں
سے ان کے ناولوں کا مقابلہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ ان میں بھی کہیں کہیں فنی
نقص موجود ہیں۔
اگرچہ ان مشہور ناول نگاروں کے علاوہ منشی عبدالغفور اور احمد حسین خاں
اور حکیم محمد علی خاں وغیرہ نے بھی بعض اچھے ناول لکھے جو ایک حد تک مقبول
بھی ہوئے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اردو اب تک فنی اعتبار سے عمدہ اور مستند
ناول پیش کرنے سے قاصر رہی۔
فی زمانہ ناول نگاری سے لوگوں کی توجہ ہٹ گئی ہے۔ البتہ ایم اسلم
اور نسیم حجازی نے اردو کو از سر نو ناول نگاری کی طرف مائل کرنے کی کوشش کی
ہے۔ لیکن ان کوششوں کا نتیجہ زمانہ مستقبل کے ہاتھ ہے۔

باب ۱۸

مابعد دورِ چہارم

حصۂ دوم، متفرقات

مختصر افسانہ نگاران اردو

تمہید

مختصر افسانہ — مختصر افسانہ انیسویں صدی کی ایجادات میں سے ہے یہ ناول کی طرح حیات انسانی کا مکمل چربہ نہیں ہوتا بلکہ حیات انسانی کے کسی خاص رخ یا کسی خاص واقعہ کا موثر اور دلچسپ بیان ہوتا ہے۔

قدیم مختصر افسانہ — مختصر افسانہ یوں تو اردو میں بہت قدیم ہے، فورٹ ولیم کالج کے عہد میں مختصر افسانے بہت لکھے گئے لیکن ان مختصر افسانوں اور موجودہ مختصر افسانوں میں وہی فرق ہے جو افسانہ اور ناول میں (ملاحظہ ہو باب ۱۰) اردو میں مختصر فنی افسانوں کی پیدائش براہ راست مغربی قصوں کے اثر کے ماتحت ہوئی اور منشی پریم چند سب سے پہلے قصہ نگار ہوئے،

منشی پریم چند آپ کے مختصر افسانوں کے دو مجموعے "پریم پچیسی" اور "پریم بتیسی" شائع ہو چکے ہیں، آپ کے قصوں کی خصوصیات یہ ہیں

عمیق مطالعہ فطرت واقعات روزمرہ کا بیان، جذبات انسانی کی صحیح مصوری، دیہاتی زندگی کے مرقعے، کردار اور منظر نگاری، آپ کے قصوں میں حزنیہ اور طربیہ دونوں طرح کے قصے موجود ہیں لیکن آپ کے حزنیہ قصے طربیہ قصوں سے زیادہ موثر ہوتے ہیں۔

زبان اور طرز بیان بھی قابل ستائش ہے، شستہ اور سلیس زبان اور اس پر بے تکلف انداز بیان سے آپ کی عبارت عام طور پر شگفتہ اور پرلطف ہوتی ہے۔

آخر میں یہ بات بھی عرض کر دینی نامناسب نہ ہوگی، کہ اگرچہ منشی صاحب مختصر افسانوں کے بانی ہیں، لیکن ابتدا ہی سے آپ نے اس فن میں وہ کمال حاصل کر لیا، کہ اب تک کوئی اور افسانہ نگار آپ کے مقابلے پر پیش نہیں کیا جا سکتا، آپ کا مرتبہ بحیثیت افسانہ نگار بہت بلند ہے،

سدرشن پنڈت بدری ناتھ سدرشن نے بھی مختصر افسانہ نگاری میں خاص شہرت اور ہردلعزیزی حاصل کی ہے، آپ کے افسانے جذبات کو ابھارتے ہیں، ہر ایک قصے میں کوئی نہ کوئی حقیقت ضرور ہوتی ہے جذبات انسانی کے کسی نہ کسی پہلو پر ضرور روشنی پڑتی ہے، قصہ کا پلاٹ ڈرامائک ہوتا ہے، خوبی زبان اور لطافت بیان کا بھی خاص خیال

رکھا گیا ہے

منشی پریم چند کی طرح آپ کے افسانوں میں بھی مقامی رنگ بڑی حد تک جلوہ فرما ہوتا ہے، کردار نویسی آپ کا خاص جوہر ہے، ہر درجہ اور ہر سوسائٹی کے لوگوں کے کردار کو فطری انداز میں پیش کرتے ہیں۔

نیاز فتحپوری نیاز فتحپوری مشہور و معروف رسالہ "نگار" کے ایڈیٹر و مالک، نثر میں ایک خاص طرز اور اسلوب کے موجد اور مالک ہیں، آپ الفاظ اور تراکیب کے حسن اور زور بیان سے اپنی عبارت میں ایک مخصوص رنگ آمیزی کرتے ہیں، بندش الفاظ نہایت چست ہوتی ہے، جس سے خود بخود ایک موسیقیت پیدا ہو جاتی ہے، اور عبارت کی دلکشی بہت بڑھ جاتی ہے۔

یوں تو حضرت نیاز نے مختلف موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے، اور ہر جگہ اپنی ادبی شان کو برقرار رکھا ہے، لیکن مختصر افسانہ نویسی میں آپ کو خاص مقبولیت حاصل ہے، آپ کے افسانوں کے دو مجموعے "نگارستان" اور "جمالستان" شائع ہو کر شہرت عام حاصل کر چکے ہیں، ان افسانوں میں بعض ترجمے ہیں اور باقی ان ہی کی دماغی تخلیق ہیں،

حضرت نیاز کے قصوں میں تخیل کی بلندی سے زیادہ کام لیا گیا ہے اگرچہ ان میں صداقت کی کمی ہے، لیکن یہ کمی آپ کے اسلوب بیان کے جادو اور تخیل کی سحر طرازی کی وجہ سے محسوس نہیں ہوتی، اشخاص قصہ جیتے جاگتے انسان نہیں ہوتے بلکہ وہ چند کیفیات اور جذبات کا مجموعہ ہوتے

ہیں جن کو مصنف کا دماغ محض تخیل کے زور سے پیدا کر لیتا ہے، آپ کے افسانوں کا موضوع حسن و عشق ہے، نہ ان سے کسی قسم کی اصلاح مدنظر ہوتی ہے اور نہ وہ کوئی اخلاقی درس دیتے ہیں، وہ محض حسین خیالات ہیں، جن کو نیاز صاحب اپنی رنگینیٔ ادا سے حسین تر بنا دیتے ہیں،

سجاد حیدر یلدرم

آپ کے افسانوں کا مجموعہ "خیالستان" کے نام سے دنیائے ادب میں کافی شہرت حاصل کر چکا ہے اس میں کچھ افسانے تو ترکی افسانوں کے ترجمے ہیں، کچھ انگریزی کے اور کچھ طبع زاد ہیں ۔

حضرت نیاز کی طرح سجاد صاحب بھی خیالی پیکر بنانے میں خاص کمال رکھتے ہیں، جذبات نگاری میں بھی آپ کا مرتبہ کافی بلند ہے، وہ افسانے جو غیر زبانوں سے ترجمہ ہوئے ہیں وہ اپنی بلندی تخیل اور زور بیان کے لحاظ سے اکثر اصل افسانوں سے بھی بڑھ گئے ہیں، اور لطف یہ کہ ترجمہ اس سلیقے سے ہوا ہے، کہ کہیں ترجمہ کا گمان نہیں ہوتا،

آپ کی عبارت میں ایک خاص انداز کا بانکپن اور بندشوں میں جدت اور شگفتگی ہر جگہ موجود ہوتی ہے، طرز بیان میں برجستگی اور ندرت عجیب شعریت پیدا کر دیتی ہے، فارسی تراکیب سے بہت کام لیتے ہیں لیکن کہیں کہیں یہ تراکیب غیر مانوس بھی ہو جاتی ہیں ۔

خواجہ حسن نظامی

خواجہ صاحب موجودہ عہد کے اہل قلم حضرات میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں، ہندوستان کے گوشے گوشے

ہیں آپ کی زبان اور طرز بیان کی دھوم ہے، آپ کی زبان دہلی کی ٹکسالی زبان ہے، سادگی برجستگی، روانی، شیرینی اور عام فہمی آپ کی زبان کی خصوصیات ہیں، زبان میں نزاکت، اور رنگینی بھی بلا کی ہے، چھوٹے چھوٹے جملے اور ان میں صفائی اور چستی سے تحریر میں شگفتگی اور تاثیر پیدا ہو جاتی ہے، اسلوب بیان میں متانت و سنجیدگی پائی جاتی ہے، مگر کہیں خشکی اور روکھاپن نہیں آنے پاتا،

خواجہ صاحب کی پچاس ساٹھ تصنیفات شایع ہو کر شہرت عام، اور بقائے دوام حاصل کر چکی ہیں -

آپ کی اکثر تصنیفات مسلمانوں کی اندوہناک حالت سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہیں، غدر کے بعد خاندان مغلیہ کی بیگمات پر جو کچھ گذری، اس کا بیان نہایت سوز و گداز اور پر تاثیر انداز سے کرتے ہیں، غمناک مناظر کے بیان میں آپ کو ید طولیٰ حاصل ہے

آپ کے مختصر افسانے فطرت کی مصوری کے لحاظ سے خاص طور پر ممتاز ہیں، سوز و گداز کا عنصر بھی ان میں ایک مخصوص انداز رکھتا ہے، آپ نے تخیلی مضامین اور تخیلی افسانے لکھ کر موجودہ انشاپردازوں میں ایک امتیازی شان پیدا کر لی ہے، آپ کے مضامین میں روحانیت ہر جگہ جلوہ فرما ہے، آپ نے لالٹین، دیا سلائی، برف وغیرہ پر مضامین لکھے ہیں لیکن ان معمولی اور حقیر چیزوں کی آڑ میں آپ صوفیانہ اور اخلاقی نکات حل کرتے ہیں، آپ کو کائنات کے ذرے ذرے میں روحانیت نظر آتی ہے

اور جو اثر آپ کے دل پر مترتب ہوتا ہے، اس کو عام فہم اور پر تاثیر انداز میں پیش کر دیتے ہیں، اور پھر اس کا لفظ لفظ عام پڑھنے والوں کے لئے درس معرفت بن جاتا ہے۔ خواجہ حسن نظامی نے ۳۱ جولائی ۱۹۵۵ء کو لگ بھگ ۸۰ سال کی عمر میں انتقال فرمایا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

۲۔ صحیفہ نگاران اُردو

تمہید

آب حیات میں لکھا ہے، کہ ۱۸۳۵ء میں اخباروں کو آزادی حاصل ہوئی، چنانچہ ۱۸۳۶ء میں اردو کا اخبار دہلی سے جاری ہوا، یہ اس زبان کا پہلا اخبار تھا، کہ آزاد کے والد مرحوم کے قلم سے نکلا۔

۱۸۳۶ء کے بعد متعدد اخبار ملک کے متعدد گوشوں سے جاری ہوئے اور بند ہو گئے، لیکن ان اخباروں میں سے کسی نے بھی کوئی خاص امتیازی حیثیت حاصل نہیں کی، البتہ ۱۸۷۷ء میں منشی سجاد حسین نے لکھنؤ سے اودھ پنچ نکالا۔ اور اپنی ذاتی قابلیت اور مخصوص رنگ کی بدولت اسے زندہ جاوید کر دیا منشی صاحب صحیفہ نگاران اردو میں تمام مرتبہ رکھتے ہیں، چونکہ آپ کا ذکر باب ۱۴ (حصہ اول) میں گذر چکا ہے، لہٰذا اب اعادہ کی چنداں ضرورت نہیں،

اس وقت تک اردو میں سیکڑوں اخبار اور رسائل نکلے، کچھ بند ہو گئے کچھ جاری ہیں، آئے دن نئے اخبار اور رسائل نکلتے رہتے ہیں، اس وقت موجودہ اخبارات اور رسائل کی تعداد دو سو سے زیادہ ہے، لیکن ان اخبار اور رسائل میں بہت کم ایسے ہیں، جن کے ایڈیٹروں نے ملک میں صحیفہ نگار کی

حیثیت سے خاص شہرت حاصل کی ہو، خاکسار بعض مالکان اخبار و رسائل کی قابلیت و انشاپردازی کا قائل ہے، لیکن اس حقیقت سے ناچیز انکار نہیں کر سکتا، کہ ان میں بجز منشی سجاد حسین مرحوم، حضرت نیاز فتح پوری، مولانا ابوالکلام آزاد، اور مولانا ظفر علی خاں کے کسی اور بزرگ نے صحافت میں کوئی کمال حاصل نہیں کیا،

اس باب کا یہ حصہ صحیفہ نگاران اردو کے لئے وقف کیا گیا ہے، منشی سجاد حسین مرحوم کا ذکر ہو چکا، حضرت نیاز فتح پوری کا ذکر اسی باب کے حصہ اول میں گذر چکا یہاں مولانا ابوالکلام آزاد، اور مولانا ظفر علی خاں کا تذکرہ کرنا ہے،

ابوالکلام آزاد مولانا ابوالکلام آزاد کا شمار عہد حاضرہ کے بہترین انشاپردازوں میں ہوتا ہے "الہلال" نے آپ کے مخصوص انداز بیان کو اور آپ کے مخصوص انداز بیان نے "الہلال" کو شہرت عام اور بقائے دوام بخشی، اخباروں میں "الہلال" نے جو شہرت اور مقبولیت حاصل کی تھی، آج تک کسی اور اخبار کو حاصل نہیں ہوئی،

بجز تفسیر القرآن مولانا آزاد کی اور کوئی مستقل تصنیف نہیں ہے وہ مضامین جو "الہلال" میں نکلتے رہے، اور وہ متفرق خیالات، جذبات و احساسات جو "غبار خاطر" کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہوئے، آپ کی انشاپردازی کو مسلم کرتے ہیں، آپ کی زبان نہایت سلیس، صاف اور رواں ہوتی ہے آپ کے طولانی جملوں میں توازن اور سلسل لطف پیدا کر دیتا ہے، خیالات

چونکہ سلجھے ہوئے ہوتے ہیں، اس لئے عبارت بھی سلجھی ہوئی اور مربوط ہوتی ہے اور عام طور پر حشو و زوائد سے پاک،

مولانا کو عربی الفاظ اور فارسی تراکیب کا خاص شوق ہے، لیکن نرا شوق ہی نہیں، بلکہ آپ ان کو نہایت سلیقہ اور استادی کے ساتھ استعمال کرتے ہیں، آپ کی عبارت میں علمی اور فلسفیانہ عمق ہوتا ہے، بڑے بڑے مفہوم کو نہایت سہولت کے ساتھ ادا کرتے ہیں، اور پھر اس طرح کہ نہایت آسانی سے ذہن نشین ہو جاتے ہیں،

مولانا کی قوت گویائی آج کل ضرب المثل بنی ہوئی ہے، آپ کی تقریر عالمانہ اور ادیبانہ ہوتی ہے، فصیح و بلیغ زبان کے علاوہ بیان اس قدر سلجھا ہوا ہوتا ہے، کہ لفظ لفظ میں تاثیر ہوتی ہے اور مطلب و مدعا اس طرح واضح ہوتا چلا جاتا ہے، کہ گویا یہ بھی میرے دل میں تھا" یہی خطیبانہ انداز آپ کی تحریر میں بھی نمایاں ہے، جوش عمل آپ کے جملے جملے سے ٹپکتا ہے، آپ کے مضامین زیادہ تر سیاسی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں، جس کے لئے صداقت اور جوش نہایت ضروری ہے، اور یہ صفات ان کی تحریر میں بدرجہ اتم موجود ہیں،

مولانا آزاد کا مطالعہ قرآن بہت وسیع ہے، قرآن کی آیتیں نہایت بے تکلفی اور برجستگی کے ساتھ آپ تحریر و تقریر میں استعمال کرتے ہیں، تفسیر القرآن آپ کا مایۂ ناز کارنامہ ہے، یہاں ہمیں اس کی زبان اور طرز بیان سے تعلق ہے، تفسیر کے متعلق بحث کرنے کا یہ موقع نہیں، ورنہ اس میں بھی بہت خوبیاں ہیں، زبان اور طرز بیان میں جو مولانا نے کمال دکھایا ہے، وہ قابل

صد ہزار ستائش ہے، تفسیر کی زبان نسبتاً آسان اور عام فہم ہے، ربوبیت
جیسے وسیع اور پیچیدہ مسئلہ کو آپ نے اس استادی سے بیان کیا
ہے، کہ معمولی پڑھا لکھا آدمی بھی نہایت آسانی سے سمجھ سکتا ہے، باوجود اس
کے ادبیت میں فرق نہیں آنے پایا ہے،

اگرچہ "الہلال" نے اردو ادب کو بالواسطہ و بلاواسطہ بہت فائدہ پہنچایا
ہے تاہم خاکسار کی آرزو ہے، کہ کاش مولانا آزاد کوئی مستقل ادبی کارنامہ
تصنیف فرمائیں، اور دنیائے اردو کو زیر بار احسان کریں،

ظفر علی خاں

مولانا ظفر علی خان مشہور و معروف اخبار "زمیندار" کے
ایڈیٹر، مصنف، انشاء پرداز اور شاعر کی حیثیت سے بھی
شہرت حاصل کر چکے ہیں، آپ کے ترجمے "معرکہ مذہب و سائنس" کو قبولیت
عام حاصل ہو چکی ہے، اور آپ کی زباندانی اور انشاپردازی کے روبرو صاحب
الرائے اصحاب سر تسلیم خم کر چکے ہیں۔

مولانا موصوف کا قلم سیاسی، تمدنی، آئینی امور کے علاوہ سائنس و
مذہب اور شعر و شاعری میں بھی اسی بے باکی اور روانی سے تگ و دو کرتا ہے
معاشرتی اصلاح کے لئے آپ نے خود بھی مضامین لکھے ہیں اور مغربی مصنفین
کے خیالات کو بھی اردو میں منتقل کیا ہے، آپ کی تصنیف "معاشرت"
قابل قدر کارنامہ ہے، آپ کے ناول بھی بلند پایہ ہیں، جن سے آپ کی نظر کی
وسعت اور مطالعہ کی ہمہ گیری کا ثبوت ملتا ہے، یہ ناول خانگی زندگی کا نہایت
سچا مرقع پیش کرتے ہیں۔

مولانا کی زبان مستند ہے، روز مرہ محاورات پر آپ کو قدرت کامل حاصل ہے، عربی الفاظ اور فارسی تراکیب کو جا بجا دست صناع کی طرح برتتے ہیں، انداز بیان میں برجستگی اور روانی خاص طور پر نمایاں ہے، عبارت پر زور اور موثر ہوتی ہے،

آپ کی متفرق نظموں کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے، جو بہت مختصر ہے، اس میں زیادہ تر سیاسی نظمیں ہیں، جو ہر حیثیت سے قابل قدر ہیں -

۳۔ مزاح نگاران اردو

تمہید انسان محض حیوان ناطق ہی نہیں ہے، بلکہ ہنسنے ہنسانے والا جانور بھی ہے، جہاں متانت و سنجیدگی لوازم انسانیت ہیں، وہاں "خندۂ دندان نما" اور "تبسم زیر لب" بھی نہایت ضروری ہیں ان کے بغیر شاید کامیاب زندگی بسر ہی نہیں ہو سکتی،

ادب مرقع حیات ہوتا ہے، اس لئے اس میں بھی متانت و سنجیدگی کے دوش بدوش شوخی، ظرافت، طنز، مزاح کا عنصر موجود رہا ہے، بعض لوگوں نے دل کا بخار نکالنے کے لئے طنز کا پہلو اختیار کیا، بعض نے محض ہنسنے ہنسانے کے لئے زعفران زار تیار کیا، لیکن بعض نے شوخی اور مزاح نگاری کو اصلاح کا آلہ کار بنایا اور زندگی کے ہر شعبہ میں اس سے کام لیا

شاعری میں مرزا رفیع سودا کی ہجووں کا ذکر ہو چکا ہے، آپ دل کا بخار نکالنے والوں میں سے ہیں، انشا، رنگین، جان صاحب محض ہنسنے ہنسانے

لوں میں، اور حضرت اکبر الہ آبادی اور ظریف لکھنوی دو ایسے ہیں جو شوخی، طنز اور
مزاح سے اصلاحی کام لیتے ہیں۔

نثر میں مزاح نگاری کی ابتدا "اودھ پنچ" کے اجراء سے ہوئی، منشی سجاد حسین
کے ناولوں کا ذکر باب ۷ میں گذر چکا ہے۔ منشی صاحب اس انجمن کے
بھی صدر نشین ہیں اور ان کے حاشیہ نشینوں میں یعنی "اودھ پنچ" کے نامہ
نگاروں میں مرزا مچھو بیگ ستم ظریف، منشی احمد علی شوق، منشی جوالا پرشاد برق
پنڈت تربھون ناتھ ہجر، خاص طور پر قابل ذکر ہیں، حقیقت یہ ہے کہ آپ ہی
کی شوخیوں نے "اودھ پنچ" کو زعفران زار بنا رکھا تھا، لیکن یہ رنگ قدیم تھا
اب زمانہ نیا ہے، ہر چیز نئی ہے، یہاں تک کہ مزاح نگاری بھی نئے نئے سلوب
سے جلوہ گر ہے۔

مغربی علوم نے علم و ادب کا رنگ بدل دیا، ادب کے ہر شعبے میں ایک
نئے دور کا آغاز ہوا، مزاح نگاری نے بھی اپنی چولی بدلی، یہ رنگ علی گڑھ
سے شروع ہوا، اور شدہ شدہ ملک کے گوشے گوشے میں پھیل گیا،
چونکہ ہر کس و ناکس نے اس رنگ کو اختیار کرنے کی کوشش کی، اس لئے
اس میں ادبی شان پیدا نہ ہو سکی، گنے چنے اصحاب ایسے نظر آتے ہیں
جنہوں نے زبان اور ادب کو مزاح پر مقدم سمجھا، اور ظرافت کی بے باکیوں کو
مقتضیات انشا پردازی سے دبایا۔

رشید احمد صدیقی | آپ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر
ہیں، آپ نے مزاح نگاری کی تاریخ تصنیف فرمائی ہے

جو ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد کی طرف سے شایع ہو چکی ہے۔

آپ کے مضامین میں شستہ ظرافت ہوتی ہے، جو زیادہ تر رمز و کنایہ سے پیدا کی جاتی ہے "چشم ساقی" کی طرح آپ کے " اشارے بہت لطیف" ہوتے ہیں، جن سے پڑھنے والا نہ کبھی "ہوشیار" ہوتا ہے نہ "بے خود خبر" یہ تو محض اصغر صاحب کے ایک شعر کا تلازمہ تھا، واقعہ یہ ہے کہ آپ کے مضامین عام فہم نہیں ہوتے جس شخص کی تاریخی سیاسی اور اخباری معلومات وسیع نہیں ہوتیں، وہ آپ کے مضامین کا منہ دیکھتا رہ جاتا ہے۔

آپ کی مضامین کی طرح آپ کی زبان بھی مشکل اور خاص فہم ہے، عربی و فارسی الفاظ و تراکیب بکثرت استعمال کرتے ہیں لیکن اکثر ان ہی الفاظ و تراکیب میں "موج تبسم" پنہاں ہوتی ہے، ادبیت و صحت آپ کی عبارت کا جوہر ہے،

مرزا فرحت اللہ بیگ آپ کی مزاح نگاری لطیف تبسم پیدا کر سکتی ہے آپ کے مضامین میں ادبیت جھلکتی ہے زبان کی صحت کا پورا پورا خیال رکھتے ہیں، اور پستی اور عامیانہ پن سے گریز کرتے ہیں، آپ نے مزاح نگاری کے علاوہ ادبی مباحث پر بھی طبع آزمائی کی ہے مگر آپ اپنی شوخی طبیعت سے مجبور ہیں، کہ وہاں بھی گل کھلائے بغیر نہ رہ سکے، آپ کو دہلی کی عامیانہ زبان اور روزمرہ پر کامل عبور حاصل ہے، اور انہیں مضامین میں موقع موقع سے سجاتے جاتے ہیں جس سے عجب لطف پیدا ہو جاتا ہے،

عظیم بیگ چغتائی مزاحیہ افسانہ نگاری کے علاوہ آپ مصوری میں بھی کامل ہیں، آپ کے افسانوں میں پلاٹ کی دلکشی خاص چیز ہے، آپ کے اکثر افسانوں کا مقصد اصلاح رسوم ہوتا ہے، آپ شادی، بیاہ، نکاح، طلاق اور پردہ کی رسوم میں اصلاحیں کرنا چاہتے ہیں، اور یہی خواہش آپ کے افسانوں کی محرک ہوتی ہے، آپ کی مزاح نگاری کا دار و مدار پلاٹ پر ہوتا ہے زبان کے بارے میں آپ ذرا بے پروا واقع ہوئے ہیں، آپ کی متعدد تصنیفات شائع ہو کر مقبول ہو چکی ہیں،

ملا رموزی آپ کی گلابی اردو دلچسپی سے پڑھی جاتی ہے (گلابی اردو کو "بے ترتیب اردو" کا نام رکھ دیا گیا ہے، جیسے پرانے زمانے میں قرآن شریف کا لفظی ترجمہ ہوتا تھا۔ ملاحظہ ہو باب ۱۳۔ ترجمہ از شاہ عبدالقادر صاحب)

ملا رموزی صاحب کے دل میں مذہب و قوم کا درد ہے، آپ مذہب کو سر سبز اور قوم کو معراج ترقی پر دیکھنا چاہتے ہیں، آپ کے مضامین میں سیاسی واقعات کی طرف اشارے ہوتے ہیں، اور آپ کی مزاح نگاری کا دار و مدار معاشرتی اور اخلاقی معاملات کی نکتہ چینی پر ہوتا ہے،

شوکت تھانوی آپ عرصہ تک سرزمین ہندوستان کو مزاح نگاری سے زعفران زار بناتے رہے، آپ کے مضمون "سودیشی ریل" نے سب سے اول دنیائے ادب میں آپ کا تعارف کرایا، پھر کیا تھا قلیل

مدت میں آپ کی شہرت دنیائے اردو کے گوشے گوشے میں پھیل گئی، قیام پاکستان کے بعد آپ نے لاہور کو مستقل قیام کے لئے چنا جہاں ریڈیو پاکستان سے آپ کا تعلق استوار ہوا آپ کے مسلسل مضامین ہر ہفتہ ریڈیو لاہور سے نشر ہوتے ہیں، ان مضامین کے کردار "قاضی جی" سے نہ صرف اہل پاکستان بلکہ ہندوستان کے باشندے بھی اچھی طرح واقف ہیں،

شوکت شاعر بھی ہیں، چنانچہ ان کے کلام کا مجموعہ "کہرستان" شایع ہو چکا ہے لیکن شہرت مزاح نگاری کی بدولت ہوئی، مزاحیہ مضامین کے متعدد مجموعے زیور طبع سے آراستہ ہو چکے ہیں "موج تبسم" "سیلاب تبسم" "بحر تبسم" "طوفان تبسم" وغیرہ ان کے علاوہ ایک اور کتاب "شیش محل" نامی بھی شایع ہوئی ہے جو شوخیانہ اور مزاحیہ انداز بیان میں سیرت نگاری کا اچھا نمونہ پیش کرتی ہے، کچھ عرصہ ہوا کہ شرح دیوان غالب کے بعض اجزا شایع ہوئے تھے جو خاص شوکت کے رنگ میں پڑھنے اور لطف اندوز ہونے کی چیز ہے،

شوکت کے مضامین میں سبھی کچھ ہے، طنز بھی، تنقید بھی، رسم و رواج پر تبصرہ بھی، اور روزانہ زندگی کی معمولی معمولی باتیں بھی، سادگی بھی اور بے ساختہ پن بھی مگر ہر چیز میں مزاح، شوخی، اور موج تبسم پنہاں ہوتی ہے، زبان سادہ لکھتے ہیں اور درست، روزمرہ اور صحیح محاورہ پر قدرت رکھتے ہیں،

۴۔ محسنین ادب اُردو

تمہید

اردو ادب کے موجودہ دور کو اگر ادب لطیف کا دور کہا جائے تو کچھ زیادہ نامناسب نہ ہوگا، دنیا سے اردو کا رجحان زیادہ تر مختصر و مزاحیہ افسانہ کی طرف ہے۔ خصوصاً نوجوان اہل قلم تو اسی ادب لطیف کو میدان عمل بنائے ہوئے ہیں، اور بجز دو چار ادبی رسائل کے اور کوئی رسالہ ایسا نہیں، جو ادب لطیف سے گراں بار نہ ہو، لیکن اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ دور حاضر مسلم الثبوت انشاء پرداز حضرات سے قطعی خالی ہے، اس دور میں ناقدین کی بھی کثرت ہے، لیکن افسوس کہ ان میں معدودے چند اہل قلم حضرات تاریخ ادب میں نمایاں حیثیت کے مالک ہیں، خاکسار یہاں ان حضرات کا ذکر کرے گا، جنہوں نے اپنی بے دریغ کوششوں سے اردو ادب کو مالا مال ہی نہیں، بلکہ اردو زبان و ادب کی روایات کے دوش بدوش اسلاف کے نام کو بھی روشن کیا ہے،

مولانا سید سلیمان ندوی

آپ مولانا شبلی مرحوم کے شاگرد رشید اور جانشین ہیں، آپ نے مولانا موصوف کی وفات پر انکی وصیت کے مطابق دار المصنفین کو قائم و جاری رکھا، اور سیرت النبی ؐ کی تکمیل کی، فارسی و عربی کے عالم جید اور فاضل اجل ہیں، اور اردو کے مسلم الثبوت انشا پرداز۔

آپ نے سیکڑوں مضامین، ادبی، فلسفیانہ، مذہبی، تاریخی اور تنقیدی لکھے،

جو ملک کے مختلف رسائل خصوصاً "معارف" میں شائع ہوئے، علاوہ ازیں آپ کی مستقل تصانیف میں "سیرت عائشہ"، "حیات مالک" اور "خیام" خاص طور پر قابل قدر و ستائش ہیں، "سیرت النبی" کی تیسری جلد چھ سو صفحوں میں مستقل لکھی ہے، جس نے آپ کے نام نامی کو شہرت کے بلند ترین مدارج پر پہنچا دیا ہے،

آپ انشاء پردازی میں اپنے استاد مولانا شبلی کے نقش قدم پر چلتے ہیں، جو لوگ مولانا شبلی کی طرز تحریر کے گرویدہ ہیں، انہیں آپ کی تحریر میں خاص لطف آتا ہے، آپ کی تحریر میں پختگی اور ادبیت ہوتی ہے، جس میں رنگینی کے بجائے خیالات کی ترتیب اور بیان کا زور اور عالمانہ متانت شگفتگی اور لطف پیدا کر دیتی ہے، آپ کی عبارت فارسی و عربی ادق الفاظ اور نامانوس تراکیب سے پاک ہوتی ہے، کہیں کہیں شوخی بھی جھلک دکھاتی ہے، مگر نہایت لطیف، آپ مقرر بھی ہیں، اور اچھے مقرر ہیں، اسی لئے آپ کی تحریریں کہیں کہیں تقریر کا لطف آتا ہے، اور عبارت کا زور بڑھ جا ہے،

جن کو آپ کی ہمہ گیر طبیعت کے گوناگوں جلوے دیکھنے ہوں، وہ آپ کے رسالہ "معارف" کے شذرات ملاحظہ کریں، جن میں ادبی، تمدنی، تاریخی مذہبی وغیرہ سب قسم کے مضامین بہترین ادبی شان کے ساتھ پائے جاتے

۷۔ مولانا عبدالماجد دریاآبادی

یوں تو آپ کے مضامین مختلف موضوع مثلاً سوانح عمری، تنقید وغیرہ پر اکثر

نکلتے رہتے ہیں، لیکن آپ کا خاص میدان فلسفہ ہے اور حقیقت یہ ہے کہ فلسفہ میں آپ کا مرتبہ بہت بلند ہے، اردو ادب میں اب تک فلسفہ پر بہت کم لکھا گیا تھا لیکن مولانائے موصوف نے یہ کمی بڑی حد تک پوری کر دی ہے،

آپ کی مستقل کتابوں میں "فلسفہ جذبات" اور "فلسفہ اجتماع" اور ترجموں میں "مکالمات برکلے" نہایت مفید اور قابل قدر تصانیف ہیں۔

آپ کی زبان اور طرز بیان فلسفیانہ خیالات کے اظہار کے لئے خاص طور پر موزوں ہے، لیکن آپ کا انداز مختلف موضوعات کے لئے مختلف ہوتا ہے، مثلاً فلسفہ میں آپ کا انداز عالمانہ ہوگا، فارسی و عربی کے ادق الفاظ و اصطلاحات استعمال ہوں گے، مگر عبارت میں سلاست و روانی قائم رہے گی، سوانح عمری یا ادبی تنقید میں آپ کا انداز بالکل بدل جائے گا، صفائی، سلاست اور شگفتگی بہت بڑھ جائے گی، عربی و فارسی الفاظ و تراکیب کی کثرت بھی نہیں رہے گی، اسی طرح موضوع کے مطابق انداز بیان اختیار کرنے میں آپ کو کمال حاصل ہے، ہر رنگ میں زور ہوتا ہے اور ہر مقام پر آپ کی قدرت بیان کا ثبوت ملتا ہے،

ترجمے میں آپ نے کمال دکھایا ہے، ترجمے پر تصنیف کا دھوکا ہوتا ہے آپ کے ترجمے کی سب کی بڑی خوبی یہ ہے، کہ اردو اسلوب کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے، اردو روز مرہ و محاورہ کا پورا خیال رکھتے ہیں اور کہیں

انگریزی جملے آنے نہیں دیتے، یہ صفت جس قدر قابل ستائش ہے اسی قدر دشوار بھی ہے، لیکن مولانائے موصوف نے اسے اس خوبی سے نباہا ہے، کہ خاص و عام کو اپنی زباں دانی اور انشاپردازی کا قائل کر لیا ہے،

۳- مولوی عبدالحق

انجمن ترقی اردو کے سیکرٹری مولوی عبدالحق صاحب اردو زبان و ادب کی جو خدمات انجام دے رہے ہیں، وہ تاریخ ادب کے صفحات پر زریں حروف میں لکھنے کے لائق ہیں آپ کو قدیم دکنی ادبیات سے جو دلچسپی ہے اس کا اظہار اس طرح ہوتا ہے کہ آپ آئے دن قدیم تصانیف مع مقدمات و حواشی شائع کرتے رہتے ہیں، آپ کی کوئی مستقل تصنیف نہیں لیکن متفرق مقدمے دو جلدوں میں شائع ہوئے ہیں، جو نہایت مفید اور قابل قدر ہیں، آپ نے ایک قواعد اردو بھی لکھی ہے، جو اپنی جدت اور صحت کے لحاظ سے نہایت کامیاب کوشش ہے -

آپ کو ادب کے ہر شعبہ سے شغف ہے، اور آپ کی ہمہ گیر طبیعت کسی ادبی مسئلے پر بند نہیں، آپ رسالہ "اردو" کے مدیر ہیں، جو دنیائے ادب میں علمی و ادبی اضافہ کر رہا ہے،

آپ کی زبان مستند اور انداز بیان صاف، سادہ، پر زور اور پختہ ہے، تحریر میں شگفتگی بہت ہے، اور مطلب کو اختصار کے ساتھ واضح کر دینے کی خاص صلاحیت ہے، روزمرہ و محاورہ کی چاشنی سے عبارت کو پر

لطف پیدا دیتے ہیں، ہندی الفاظ کا استعمال نہایت برجستہ ہوتا ہے، چھوٹے چھوٹے جملوں میں فصاحت کا حق ادا ہو جاتا ہے، غرض آپ موجودہ عہد میں صاحب طرز انشا پرداز ہیں۔

۸۔ سید غلام محی الدین قادری زور: آپ جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد میں اردو زبان و ادب کے پروفیسر ہیں اور آپ نے اردو زبان و ادب کی ٹھوس خدمات انجام دی ہیں۔

ذیل کی تصانیف آپ کی خدمات کو مسلم کرتی ہیں:۔ "روح تنقید" "تنقیدی مقالات" "شہ پارے" "اردو کے اسالیب بیان" اور "ہندوستانی لسانیات"۔

آپ انگریزی تنقید و ادب کو اپنا نصب العین سمجھتے ہیں، اور انہی سرچشموں سے اردو کی آبیاری کرنا چاہتے ہیں، اصول تنقید پر اردو میں کوئی کتاب موجود نہیں تھی، چنانچہ آپ نے مغربی ماہرین فن کے نقش قدم پر چل کر روح تنقید تصنیف فرمائی، اور پھر ان اصولوں کو عملی طور پر برت کر دکھایا "تنقیدی مقالات" اسی عملی کوشش کا نتیجہ ہے۔

اردو زبان و ادب کی خدمات کے لحاظ سے زور صاحب کا جو مرتبہ ہے اس میں خاکسار کو کچھ کلام نہیں لیکن ان کی زبان اور طرز بیان میں شگفتگی نہیں پائی جاتی، حیدرآبادی زبان کا اثر آپ کی اردو پر کافی ہے، اور آپ کے طرز بیان سے انگریزیت بھی ٹپکتی ہے، سلاست اور ہمواری سے بھی آپ کی تحریر عاری ہو جاتی ہے، لیکن آپ کے ذوق تصنیف و تالیف سے توقع

ہے کہ بہت جلد یہ خامیاں رفع ہو جائیں گی۔

تبصرہ

اردو نثر نگاری کا آخری دور گلہائے رنگا رنگ کا گلدستہ ہے۔ اس انجمن نے ہمہ گیر طبیعت پائی ہے جہاں افسانہ نگار رونق افروز ہیں، وہاں شعرا بھی موجود ہیں۔ بڑے بڑے محسنین زبان ایک طرف بیٹھے ہیں، تو دوسری طرف ان کے کارناموں پر تنقید کرنے والے بھی مستعد ہیں۔ تحقیق و تجسس کرنے والوں کی بھی ایک جماعت حاضر ہے۔ غرض مغربی علوم و فنون کا پورا پورا اثر اس دور کے مصنفین نے قبول کر لیا ہے۔

اگرچہ ہم نے ڈراموں کا ذکر نہیں کیا، لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ اردو ڈرامہ سے محروم ہے۔ آغا حشر، منشی رحمت علی، منشی ابراہیم محشر وغیرہم نے بہت سے ڈرامے لکھے، کچھ خود تصنیف کئے، کچھ انگریزی سے ترجمہ کئے لیکن افسوس کہ ان ڈراموں کو اردو ادب میں کوئی امتیازی حیثیت حاصل نہ ہو سکی، اور اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ اب تک جتنے ڈرامے لکھے گئے وہ محض تجارتی اصول پر لکھے گئے، ان میں ادبیت پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی گئی بعض ڈرامے ادبی نقطہ نظر سے بھی لکھے گئے، لیکن وہ اسٹیج کے کام کے نہیں تھے، اس لئے شہرت و مقبولیت حاصل نہ ہوئی۔ غرض ناچیز کی رائے میں اردو نے ڈرامہ میں کوئی خاص کارنامہ پیدا نہیں کیا، اور اسی لئے فاکسار نے تاریخ ادب میں اس کے لئے کوئی گنجائش نہیں نکالی، فی زمانہ

سینما نے تھیٹر کے نعد کو توڑ دیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ڈرامہ نویسی کی طرف سے توجہ ہٹتی جاتی ہے

اس دور میں سب سے زیادہ کامیابی مختصر افسانہ کو حاصل ہوئی، اور ابتدا ہی سے اس نے کمال حاصل کر لیا لیکن ہمیں محسنین ادب کو فراموش نہیں کر دینا چاہیئے جن کی بے دریغ کوششوں سے ادب اردو ترقی کر رہا ہے یہاں ہی حضرات کی برکت ہے، کہ اردو کسی قدر اپنی اصلی حالت پر نظر آتی ہے ورنہ فی زمانہ انگریزی نما اردو کا اس قدر نعد ہوتا جاتا ہے، کہ مستقبل کی تاریکی بھیانک نظر آتی ہے،

چونکہ دور حاضرہ ابھی اپنے وجود کے منازل طے کر رہا ہے، لہذا اس پر عمیق تبصرہ کرنا قبل از وقت ہوگا، اس وقت تک جو کچھ اس دور نے کر دکھایا ہے اس کا جائزہ لیتے ہوئے اتنا کہنے میں باک نہیں، کہ گذشتہ ادوار سے ابھی یہ دور بہت پیچھے ہے اگرچہ اس دور میں سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالحق، مولانا عبدالماجد دریاآبادی، خواجہ حسن نظامی، مولانا ابوالکلام آزاد جیسی زبردست ہستیاں موجود ہیں لیکن افسوس کہ اب تک اس دور میں کوئی آزاد، حالی، شبلی، سرسید پیدا نہیں ہوا، اور نہ مستقبل قریب میں امید ہے

خاتمہ

ہماری تاریخ ادب اردو ۱۳۰۰ء سے شروع ہوتی ہے، اور آج ۱۹۵۲ء ہے۔ اس ساڑھے پانسو برس کی مختصری عمر میں اردو ادب نے جو علمی اور ادبی ترقی کی ہے وہ حیرت انگیز ہے۔ واضح ہو کہ ابتدائی دو ڈھائی سو برس ایسے ہیں جن میں رفتار ترقی بہت سست رہی ہے، اور اس کی خاص وجہ فارسی کا غلبہ تھا، لیکن اردو اپنی سست رفتاری اور کم مائیگی کے باوجود بھی فارسی کے مقابلے پر ڈٹی رہی، آخر ۱۸۳۲ء میں فتحیاب ہو کر ملک کی زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لی، یعنی دفاتر سرکار میں یہ زبان رائج ہو گئی، ۱۸۳۶ء میں اردو کا پہلا اخبار نکلا، اگر نظر غور سے دیکھا جائے، تو اردو نثر کی کل ترقی یہی سو سوا سو سال کے اندر اندر ہوئی ہے۔

جون ۱۹۲۰ء کے "معارف" میں سید سلیمان صاحب ندوی کا ایک مضمون بعنوان "انڈیا آفس لائبریری میں اردو کا خزانہ" شائع ہوا تھا، اس میں سید صاحب موصوف فرماتے ہیں:-

"مطبوعہ اردو کتابوں کی اہمیت بھی یہاں (یعنی انڈیا آفس لائبریری لندن میں) میری نگاہ میں کچھ کم نظر نہ آئی، اور تھوڑی دیر کے لئے مجھے مغرور ہونا پڑا، کہ الحمد للہ ہماری زبان بھی اس قدر ترقی یافتہ ہے، کہ تین سو صفحے میں اس کی فہرست تمام ہوئی ہے، یہ فہرست ۱۹۰۰ء میں چھپی ہے، اس لئے موجودہ بیسویں صدی کی کتابیں اس فہرست میں شامل نہیں ہیں، اس فہرست کو دیکھ کر یہ تعجب ہوا، کہ اردو زبان

علوم کے چھپنے ہی سے ایک علمی زبان بن رہی تھی...."

اس سے اندازہ ہوتا ہے، کہ ۱۹۰۰ء سے پہلے ادب اردو کس قدر ترقی کر چکا تھا یعنی علوم و فنون، تاریخ و جغرافیہ، ادبیات، کتب تعلیمی، الٰہیات اور متفرق موضوعات پر اس قدر کتابیں لکھی جا چکی تھیں، کہ ان کی فہرست تین سو صفحات میں تمام ہوئی ہے، ۱۹۰۰ء کے بعد میدان ادب میں جس سرگرمی کا اظہار کیا گیا ہے، اسے دیکھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے، کہ اگر جملہ مطبوعہ کتب کی فہرست تیار کی جائے، تو غالباً پانسو صفحات میں ختم ہو گی۔

موجودہ عہد میں اردو ادب کا یہ حال ہے، کہ برصغیر ہند و پاکستان میں دو سو سے زیادہ رسالے اور اخبار نکلتے ہیں، اور ہر سال کم از کم چار سو کتابیں مختلف مضامین پر شائع ہوتی ہیں۔

دہلی سوسائٹی (۱۸۴۳ء) فورٹ ولیم کالج، سائنٹفک سوسائٹی (۱۸۶۴ء) وغیرہ سے قطع نظر کر کے عہد حاضرہ میں متعدد انجمنیں اور ادارے قائم ہیں جو دن رات ادب اردو کی ترقی میں سرگرم و کوشاں ہیں، ان میں سے چند مشہور و معروف انجمنوں اور اداروں کا ذکر یہاں کیا جاتا ہے،

۱- انجمن ترقی اردو۔ یہ انجمن ابتداً اورنگ آباد دکن میں قائم ہوئی تھی، اور مولانا عبدالحق اس کے جنرل سیکرٹری تھے، جب مولانا عثمانیہ یونیورسٹی کی اردو پروفیسری سے سبکدوش ہو کر دہلی آئے، تو اس انجمن کو بھی دہلی لیتے آئے، یہ انجمن ایک مدت تک دہلی میں سرگرم کار رہی، تقسیم ہندوستان اور قیام پاکستان کے بعد مولانا عبدالحق کے ساتھ اس انجمن کو بھی ہجرت کرنی پڑی، اور اب یہ کراچی میں اردو کی

خدمت انجام دے رہی ہے ادھر ہندوستان میں اسی نام سے ایک ادارہ انجمن قائم کی گئی ہے جس کا صدر مقام علی گڑھ ہے۔

انجمن ترقی اردو (اورنگ آباد، دہلی، کراچی) نے اب تک علم الحیوانات، علم طبقات الارض، علم النفس، علم نباتات، علم معاشرت، تاریخ اور ادب میں متعدد بیش بہا کتابیں شائع کی ہیں، یہی انجمن "اردو" نامی سہ ماہی رسالہ نکالتی ہے جو ادبی رسائل میں خاص حیثیت رکھتا ہے۔

۲- دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی (حیدرآباد دکن) اس ادارہ میں علم معیشت، تاریخ، منطق، اخلاقیات، نفسیات، مابعد الطبیعیات، طبیعیات، اقتصادیات، ریاضیات، علم الحیات، علم کیمیا وغیرہ علوم کی انگریزی کتابوں سے اردو میں تالیف و ترجمہ کا کام ہوتا رہا ہے اسی ادارہ میں وضع اصطلاحات علمیہ کے لئے بھی ایک شعبہ قائم تھا، حیدرآباد کی موجودہ سیاست کے ماتحت اب اس ادارہ کا کیا حال ہوگا، اللہ بہتر جانتا ہے۔

۳- شبلی اکیڈیمی یعنی دارالمصنفین (اعظم گڑھ) سے مذہبی اور دیگر علوم و فنون کی کتابیں شائع کی جاتی ہیں۔

۴- ہندوستانی اکیڈیمی (الہ آباد) اس میں علمی و ادبی مفید کتابیں اور ملک کے صاحب کمال حضرات کی تقریریں شائع ہوتی ہیں ایک تماہی رسالہ "ہندوستانی" کے نام سے نکلتا ہے جو ایک خاص اور معیاری رسالہ ہے۔

اردو میں تحقیقی و طبع زاد کارناموں کو چھوڑ کر غیر زبانوں کے سرچشموں سے جو آبیاری ہوگئی ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ انگریزی، یونانی، سنسکرت، فارسی وغیرہ زبانوں کی بیشتر نظموں کا ترجمہ ہو گیا ہے، نثر میں بھی غیر زبان کے مشہور مشہور مصنفین

کے کارنامے ترجمے کر لئے گئے ہیں شیکسپیر کے تمام جاوید ڈراموں کو اردو میں
گیا ہے سنسکرت اور بنگالی کے ڈرامے بھی اردو میں آ گئے ہیں فلسفہ میں افلا
ارسطو، چانکیہ، لیہان، مل، اسپنسر، جیمس وغیرہ کی شاہکار تصانیف ترجمہ کر لی
علاوہ ازیں ریاضی، جغرافیہ، معاشیات، سیاسیات، اقتصادیات، تاریخ، د
سائنس اور مذہب پر بے شمار کتابیں تالیف و ترجمہ کر لی گئی ہیں۔

اس ترقی کو دیکھ کر ہندوستان کی یونیورسٹیوں نے بھی اردو کی طرف
التفات سے دیکھا، چنانچہ اکثر یونیورسٹیوں میں ایم اے تک اردو پڑھائی
ہے اور طلبہ کو ریسرچ کے لئے وظائف بھی دیئے جاتے ہیں الٰہ آباد یونیو
نے سب سے اول شعبہ اردو قائم کیا، اس کے بعد آگرہ، لکھنؤ، علی گڑھ، ناگپو
ڈھاکہ وغیرہ یونیورسٹیوں نے بھی اردو زبان و ادب کے شعبے قائم کر کے
تک اردو جاری کی، قیام پاکستان کے بعد مغربی پاکستان کی یونیورسٹیوں
بھی اردو میں ایم اے کا امتحان جاری کر دیا ہے۔

تقسیم ہند کے بعد عام مسلمانوں کی طرح اردو کو بھی ہجرت کا سہارا لینا
اردو اپنے قدیم وطن دہلی اور لکھنؤ میں اجنبی سمجھی جانے لگی لیکن پاکستان نے
ہاتھوں ہاتھ لیا اور اپنی قومی و سرکاری زبان تسلیم کر لیا۔

پاکستان اور اس کے ساتھ اردو زبان

زندہ و پائندہ باد

تمام شد